مقالاتِ حکیم الاسلام

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ

حافظ سید محمد اکبر شاہ بخاری

ادارۃ المعارف کراچی

مقالاتِ حکیمُ الاسلام

حضرت مولانا قاری مُحمّد طیّب صاحب رحمۃ اللہ علیہ

حافظ سیّد مُحمّد اکبر شاہ بخاری

اِدارۃُ المعارِف کراچی ۱۴

فہرستِ مضامین

صفحہ نمبر	عنوان

صفحہ نمبر	عنوان

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

نعتِ عقیدت بحضور ختمی مرتبت ﷺ

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ
بانیٔ دار العلوم دیوبند

الٰہی کس سے بیاں ہو سکے ثناء اُس کی
کہ جس پہ ایسا تری ذاتِ خاص کا ہو پیار

جو تو اُسے نہ بناتا تو سارے عالم کو
نصیب ہوتی نہ دولتِ وجود کی زنہار

تو فخرِ کون و مکاں زبدۂ زمین و زماں
اَمیر لشکرِ پیغمبرانؑ شہِؐ اَبرار

تو بوئے گل ہے اگر مثلِ گل ہیں اور نبی
تو نورِ شمس ہے گر اور نبی ہیں شمسِ نہار

حیاتِ جان ہے تو ہیں اگر وہ جانِ جہاں
تو نور دیدہ ہے گر ہیں وہ نور دیدۂ بیدار

جہاں کے سارے کمالات ایک تجھ میں ہیں
تیرے کمال کسی میں نہیں مگر دو چار

اُمیدیں لاکھوں ہیں لیکن بڑی اُمید ہے یہ
کہ ہو سگانِ مدینہ میں میرا نام شمار

جیوں تو ساتھ سگانِ حرم کے تیرے پھروں
مروں تو کھائیں مدینہ کے مجھ کو مور و مار

جو یہ نصیب نہ ہو، اور کہاں نصیب میرے
کہ میں ہوں اور سگانِ حرم کے تیرے قطار

اُڑا کے باد میری مشتِ خاک کو پسِ مرگ
کرے حضورؐ کے روضے کے آس پاس نثار

ولے یہ رتبہ کہاں مشتِ خاک قاسمؔ کا
کہ جائے کوچۂ اطہر میں تیرے بن کے غبار

(ماہنامہ ''الرشید'' لاہور سیرۃ النبیؐ نمبر)

نعت النبی ﷺ

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ
بانیٔ دارالعلوم دیوبند

سب سے پہلے مشیت کے انوار سے نقشِ رُوئے محمدؐ بنایا گیا
پھر اس نقش سے مانگ کر روشنی بزمِ کون و مکاں کو سجایا گیا

وہ محمدؐ بھی احمد بھی محمود بھی حسنِ مطلق کا شاہد بھی مشہود بھی
علم و حکمت میں وہ غیر محدود بھی ظاہراً اُمیوں میں اُٹھایا گیا

اس کی شفقت ہے بے حد و بے انتہا اس کی رحمت تخیل سے بھی ماورا
جو بھی عالم جہاں میں بنایا گیا اس کی رحمت سے اس کو بسایا گیا

کس لئے حشر کا ڈر ہو قاسمؔ مجھے میرا آقا ہے وہ میرا مولا ہے وہ
جس کے قدموں میں جنت بسائی گئی جس کے ہاتھوں سے کوثر لٹایا گیا

(ماہنامہ ''الصیانۃ'' لاہور جولائی ۲۰۰۵ء)

نعت محمدِ مصطفیٰ ﷺ

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ
سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند

ادا کیوں کر کریں اور کس زباں سے شکر ہم تیرا
کہ تو نے اس نبی کی ہم کو اُمت میں کیا پیدا
وہ کملی اوڑھنے والا فقیری پہ جو نازاں تھا
گدا تھے جس کے کوچے کے سکندر، قیصر و کسریٰ
گدائی جس کے گھر کی، بادشاہی سے بھی بہتر تھی
زمیں جس شاہ کے کوچے کی رشکِ قصرِ قیصر تھی
رُسل نے اُمتی ہونے کی جس کے آرزو کی ہو
لقب محبوب دے کر حق ہے جس کی آبرو کی ہو
قدم بوسی کی جس کے آسماں نے آرزو کی ہو
بلا کر عرش پر جس سے خدا نے گفتگو کی ہو
وہ شاہِ دوجہاں لولاک کی پوشاک تھی جس کی
فقیر ایسا کہ ادنیٰ ملک ہفت افلاک تھی جس کی
سرِ فاران چمکا تھا جو خورشیدِ جہاں ہوکر
بتائی راہ جس نے رہنمائے گمراہاں ہوکر
گیا تھا عرشِ اعظم پر جو حق کا مہماں ہوکر
شرف پایا تھا جس نے انبیا میں آسماں ہوکر
رہی شیدا چمن پر جس کے فصلِ بے خزاں برسوں
قدم چوما کیا جس کی زمیں کے آسماں برسوں

(ماہنامہ ''الصیانۃ'' لاہور دسمبر ۲۰۰۵ء)

عرضِ مرتّب

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حکیم الاسلام حضرتِ اقدس مولانا قاری محمد طیب قاسمی نوّر اللہ مرقدہٗ کے مواعظ و خطبات الحمدللہ متعدّد جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں اور عوام و خواص کے لئے انتہائی نافع اور مفید ثابت ہوئے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب ''مقالات حکیم الاسلامؒ'' کے نام سے مرتب کی گئی ہے، اس میں حضرتؒ کے نایاب علمی، تاریخی، شخصی اور اصلاحی مقالات کو یکجا کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ان مواعظ وکلماتِ طیبات کو بھی جمع کیا گیا ہے جو ابھی تک کسی مجموعے میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر اور احسان ہے کہ حضرت حکیم الاسلامؒ کے علمی، دینی و تاریخی اور معلوماتی مضامین و مقالات و مواعظ و کلماتِ طیبات کو یکجا اور جمع کرنے کی حق تعالیٰ نے ہمت وتوفیق عطا فرمائی، اللہ تعالیٰ احقر کی اس کاوش کو قبول فرمائے اور عوام و خواص کے لئے اس کتاب کو نافع اور مفید فرمائے، آمین۔

آخر میں برادرِ محترم جناب محمد مشتاق سنّی صاحب زید مجدہٗ کا تہہ دِل سے شکریہ ادا کیا جاتا ہے کہ جنھوں نے اس کتاب کو ''اِدَارَۃُ الْمَعَارِفْ کَرَاچِیْ'' سے شائع کرنے کا وعدہ فرمایا، جزاکم اللہ احسن الجزاء۔

احقر محمد اکبر شاہ بخاری غفرلہٗ
ناظم اعلیٰ مرکزِ تبلیغ مجلس صیانۃ المسلمین
مدرسہ اشرفیہ احتشام العلوم جامع مسجد عثمانیہ
صدر بازار جام پور ضلع راجن پور (پنجاب)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ

از شیخ الحدیث حضرت مولانا انظر شاہ مسعودی صاحب مدظلہٗ

محمد حسین آزاد نے ''آبِ حیات'' میں مرزا مظہر جانِ جاناںؒ کی نزاکتِ طبع اور لطافتِ مزاج کے بہت سے واقعات سنائے ہیں، ''اَرواحِ ثلاثہ'' میں بھی مرزا کے متعلق کچھ اس طرح کے واقعات و حکایات موجود ہیں جنھیں دیکھ کر بے تکلف کہا جاسکتا ہے کہ ؎

نزاکت اس گلِ رعنا کی دیکھیو انشآء
نسیمِ صبح جو چھو جائے ہو رنگ میلا

ان حکایات و واقعات کی تاریخی حیثیت کچھ بھی ہو، لیکن مرزا شہیدؒ کی لطافتِ طبع متعلقہ بیانات کی قدرِ مشترک ہے۔ لطافت و کثافت کا بھی عجیب معاملہ ہے، یہ بود و باش میں بھی نمایاں اور لباس و پوشاک میں بھی، میل ملاپ میں بھی عیاں اور تحریر و تقریر میں بھی۔ شہید مرزاؒ نے اپنے ایک دوست کی وفات پر تعزیتی خط لکھا ہے جو آج بھی مرزاؒ کی نگارشات میں موجود ہے، تعزیتی الفاظ یہ ہیں: ''مرنے والے نسخۂ انسانیت تھے، ان کی وفات کا زخم قیامت تک مندمل نہ ہوگا۔'' خدا جانے جن مرحوم کے لئے تعزیت میں یہ الفاظ مرزاؒ کے قلم سے ٹپکے، وہ کیا کچھ تھے، لیکن حقیقۃً یہ

الفاظ اپنے حدودِ اَربعہ کے اعتبار سے بروز اتوار ۱۷رجولائی ۱۹۸۳ء دن کے سوا گیارہ بجے ایک ناتواں بلکہ ناتوانیوں کا ڈھیر، ضعیف، بیماریوں کے مسلسل حملوں سے ناچار، رنج وغم کا پیکر، اَلم و اَسف کا مجسمہ، شرافت کا قطب مینار، انسانیت کا مجموعہ، فضائل و شمائل کا ہمالہ، علم و وقار کا کوہِ شوالک، نیکیوں کا بیت المقدس، صلاح وتقویٰ کا کعبہ، مسترشدین کا قبلہ، معتقدین کا محبوب، مخالفین کا ہدف، حریفوں کی تیروں کی آماج گاہ، یعنی حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب حظیرۃ القدس پر ہر طرح صادق ہیں۔
آج سے ۹۴ سال قبل مرحوم نے اس عالم رستاخیز میں قدم رکھا اور قدم بھی ایک حظیرۃ القدس میں یعنی حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم کے صاحب زادہ مولانا حافظ احمد صاحب کی آغوشِ شفقت میں، حافظ مرحوم کی شادی پر کافی عرصہ گزر گیا تھا لیکن کوئی بچہ پیدا نہ ہوا، گھر میں بے چینی تھی، متعلقین تڑپتے، اقرباء صورتِ حال پر بلبلا رہے تھے، حضرت نانوتویؒ کے تلامذہ جو آسمانِ علم کے آفتاب، ربانیت اور خداپرستی کے ماہتاب تھے، مضطر باز دست بدعا ہوگئے تا آنکہ دیوبند اور اس کے قرب و جوار بلکہ دُور دراز علاقوں میں اگر کسی مستجاب الدعوات کا علم ہوتا اس سے بھی دُعا کی درخواست کی جاتی۔ خدا پرستوں کی یہ دُعائیں کب خالی جاتیں، دیر آید دُرست آید کے مطابق مجیب الدعوات نے خانوادۂ قاسمی کو بچہ ہی عنایت نہ کیا بلکہ مجموعہ انسانیت عطا کیا، حضرت نانوتویؒ تو آنکھ بند کر چکے تھے، لیکن دادی نے بلائیں لیں، تلامذہ قربان ہوئے، گھر میں شادیانے خوشی کے بجے اور مسرتوں کو طشتوں میں رکھ کر لٹایا گیا، اس ناز کے ساتھ حضرت کی پرورِش ہوئی کہ جب گڈلیوں چلنے لگے تو اصلی گھی کا بھرپور ایک پیپا حضرت مرحوم نے توشہ خانے میں گھس کر گرادیا، کیسا ڈانٹنا، کیسا ڈپٹنا، کہاں کی دھمکی، کہاں کی جھڑکی، دادی نے پوتے کی اس شوخی پر دیوبند کے گھروں میں اس عنوان کے ساتھ مٹھائی تقسیم کی کہ آج میرے پوتے نے ایک شرارت کی ہے۔
شعور نے آنکھیں کھولیں تو اس نومولود کو امامِ ربانی قطبِ عالم مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

کی پُرنور گود میں ڈالا گیا، حضرتؒ نے آنکھوں سے لگایا، سینۂ معرفت سے چمٹایا، لبِ مبارک سے بوسہ دیا۔ بڑھتے بڑھتے کچھ بڑے ہوئے تو ایک روز خانقاہِ گنگوہ میں اِمامِ ربانی کے پاؤں دابنے کی سعادت کے شوق میں دُوسرے خدمت گاروں کے ساتھ شریک ہوگئے، اِمامِ ربانی بہت حساس و نازک مزاج تھے، لطافت زَدہ مستزاد بھاری بھرکم ہاتھوں کے ساتھ معصوم ہتھیلیوں کا فوراً ادراک فرمایا، مڑکر دیکھا تو مولانا قاری محمد طیب صاحب اپنی نازک ہتھیلیوں سے سعادت سمیٹ رہے تھے، اِمامِ ربانی معاً اُٹھ کر بیٹھ گئے، سینے سے لگایا، فرمایا: تم جس خاندان کے چشم و چراغ ہو اس سے اس طرح کی خدمت لینا، میری شقاوت ہوگی۔ کچھ بڑے ہوئے تو شیخ الہند محمود الحسنؒ سے بسم اللہ کرائی گئی، اس مبارک کی ابتدا میں سپہرِ علم کے درخشاں ستارے بھی تھے اور چرخِ معرفت کے مقدس سیارے بھی۔ زندگی نے آگے قدم بڑھایا تو مولانا محمد انور شاہ الکشمیریؒ کی درس گاہ میں زانوئے تلمذ طے کیا اور وہیں سے سندِ فراغت لی۔ اندرونِ خانہ بڑوں میں شادی کی گفتگو چلی تو دیوبند کے قریب ہی رامپور پنہاراں میں مولانا محمود احمد صاحب رامپوری وزیرِ مال ریاست اندرگڑھ، رکنِ شوریٰ دارالعلوم و رئیس رامپور کے یہاں منگنی کی تجویز کی گئی، شیخ الہندؒ نے فرمایا کہ: ''پیغام میں لے کر جاؤں گا۔'' یہ رامپوری رئیس دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور شیخ الہندؒ کے ارشد تلامذہ میں بھی تھے، شیخ الہندؒ رامپور پہنچے تو مولانا کے گھرانے میں خوشی کی لہر دوڑ گئی کہ اُستاذ آئے ہیں اور اُستاذ بھی عظیم المرتبت، شیخ الہندؒ نے بیٹھتے ہی فرمایا کہ: ''بھائی میں اُستاذ کی حیثیت سے نہیں آیا، بلکہ نائی کا کام انجام دینے آیا ہوں۔'' پیغام دیا، مجالِ انکار کس کو تھی، تقریبِ شادی کے موقع پر مولانا خلیل احمد صاحبؒ مہاجرِ مدنی نے تمنا کی کہ خلعتِ عروسی طیب کے میں زیبِ بدن کروں گا، چنانچہ حکیم الأمت مولانا تھانوی قدس سرہٗ نے عرض کیا کہ نکاح میں پڑھاؤں گا۔ یہ تھا مولانا قاری محمد طیب کا نشو ونما اور اُٹھان کہ بزرگ بلائیں لیتے تھے، اہلِ علم قربان ہوتے، اَربابِ فضل نثار ہوتے۔ دُلہن

رُخصت ہوکر رامپور سے چلیں تو دیوبند سے کئی میل آگے نکل کر دارالعلوم کے طلباء نے ڈولے کو اپنے کاندھوں پر اُٹھایا اور اسی شان سے لے درِ دولت تک پہنچے۔ دارالعلوم سے فراغت کے ساتھ ہی شیخ الہندؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی، خواجہ تاش مولانا مفتی محمد شفیع مفتیٔ اعظم پاکستان تھے، شیخ الہندؒ مستعد برائے ہجرت ہوئے تو دونوں کی اس درخواست پر کہ حضرت اب ہم کس کی طرف رُجوع کریں؟ جواب باصواب تھا کہ مولانا محمد انور شاہؒ سے اصلاحی تعلق قائم کرلیا جائے، ان کی وفات کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نائب مہتمم دارالعلوم سے استدعا کی اب ہمارا تعلق مولانا تھانوی سے کرادیا جائے، مولانا حبیب الرحمٰن نے سفارشی خط لکھا، مرشد تھانویؒ اس خانوادہ سے معتقدانہ تعلق کے باوجود بڑے ضابطے کے انسان تھے، جواب میں تحریر فرمایا کہ:

> مولوی محمد طیب کی خدمتِ اصلاح میری سعادتِ دِین و دُنیا ہے،
> لیکن مسترشدانہ خط، سفارش کی صورت میں نہیں بلکہ خود مسترشد کا
> آنا چاہئے۔

چنانچہ عریضہ روانہ خدمت کیا گیا، رمضان المبارک کے مہینے میں مہتمم صاحب نے حاضری کی اجازت چاہی، اجازت مل گئی، مفتی محمد شفیعؒ کی معیت میں تھانہ بھون کا پہلا سفر ہوا، قاری صاحبؒ اپنی خوش الحانی میں شہرہ آفاق ہوچکے تھے، جب تھانہ بھون پہنچے، موجود ذاکرین و شاغلین نے حضرت تھانویؒ سے عرض کیا کہ قاری صاحب سے تراویح میں قرآن پڑھنے کے لئے کہا جائے، ضابطے کا جواب یہ تھا کہ دِل میرا بھی چاہتا ہے لیکن استدعا سے گریز ہے چونکہ جبر کا اِمکان ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ مولوی طیب صاحب میرے کہنے پر بادِلِ نخواستہ اس صورت کو قبول کریں، بہتر یہ ہے کہ قاری صاحب سے بے تکلف دریافت کی جائے کہ تراویح کا معمول کیا رہے گا، قاری صاحبؒ کی طرف رُجوع کیا گیا تو فرمایا: کمرے میں نوافل میں قرآن شریف پڑھوں گا، اس پر حضرت تھانویؒ نے درخواست گزاروں سے فرمایا کہ اب جاکر پوچھا

جائے کہ بجائے نوافل کے اگر تراویح میں اور خانقاہ کی مسجد میں آپ قرآن شریف پڑھیں تو کیا مضائقہ ہے، قاری صاحبؒ نے اس صورت کو سعادت قرار دیا۔

مسندِ خلافت و اہتمام

حکیم الاسلامؒ اِمام تھے اور حکیم الأمتؒ مقتدی۔ پہلی ہی تراویح سن کر حضرت حکیم الأمتؒ باغ و بہار ہوگئے۔ مجالس میں بار بار تعریف کی، خوش الحانی کا دِلدادہ اپنے آپ کو بتایا، قاری صاحب مرحوم کی سعادت مندانہ افتادِ طبع کی مداحی کی اور قلیل مدّت میں اس اِمامِ رُشد و ہدایت نے مسندِ خلافت عطا فرمائی۔ اصلاحِ باطن کی اس تعمیر کے ساتھ دارالعلوم میں معین المدرسی کے عہدے پر تدریس کا کام شروع کیا، گنے چنے تلامذہ اب بھی موجود ہیں، جن کا متفقہ بیان ہے کہ قاری صاحبؒ زمانۂ طالب علمی، عہدِ شباب ہی میں عبادت کا ذوق، بندگی کا شوق، فرشتوں کی سی معصومیت اور عارفین کی معرفت کا منظر پیش کرتے، اسی زمانے سے تہجد و اَوّابین کا غیر منقطع سلسلہ جاری ہوا، جو صبحِ موت تک چلتا رہا۔ معین المدرسی سے نیابتِ اہتمام کی جانب قدم بڑھایا اور والد مرحوم کی وفات کے بعد حضرت تھانویؒ کی تجویز اور دارالعلوم دیوبند کے اربابِ مشورہ کی تائید سے مہتمم منتخب ہوئے۔ ساٹھ سال اس عہدے پر اس شان سے گزرے کہ تاریخ حیرت زدہ ہے، زمانہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے، چشمِ فلک نے ٹکٹکی لگا رکھی ہے اور ایک عالم غرقِ حیرت ہے، اس طویل عرصے میں نہ جانے کتنے نشیب و فراز آئے، کتنے سنگلاخ آئے، کتنے ہفت خواں آئے، پہاڑوں کی سی رُکاوٹیں کھڑی ہوئیں، طوفانوں نے قدم روکنا چاہا، فتنوں کے سیلاب اُمنڈے، مخالفتوں کا طوفان اُبلا، عداوتوں کی آندھیاں چلیں، مخاصمتوں کے بگولے اُڑے، اور ایک وقت تو وہ آیا کہ اَز مبتدا تا خبر، اَز اَوّل تا آخر، سوائے عداوت اور مخالفت کے اور کچھ نہ رہا، لیکن یہ حلم کا پہاڑ، وقار کا بادشاہ، مکارمِ اخلاق کا خسرو، شرافت و انسانیت کا شہنشاہ،

مروّتِ وفا کا تاج دار، اپنی جگہ سے قطعاً نہیں ہلا، اِستقامت میں فرق نہیں آیا، طمانیت نے لڑکھڑانا نہ جانا، سب نے سنا، سب نے کہا، حریف دست و گریباں ہوئے، چھوٹوں نے ان کی دستارِ فضیلت سے کھلواڑ کیا، مگر مرحوم نے کسی کو نہ جواب دیا، نہ کوئی انتقامی کاروائی کی، نہ غیظ و غضب کا مظاہرہ کیا، بلکہ غم کا ہمالہ اپنے دِل پر لے کر اس دُنیائے دُوں سے رُخ موڑ لیا۔ مہتمم صاحب مرحوم کے اوصافِ خصوصی میں حلم تھا، جس کی نظیر و مثال صدیوں کے اَربابِ انتظام میں نہیں ملتی۔ تصوّر کیجئے کہ تین سو کا عملہ ان کے ساتھ تھا، جس میں اچھے بھی تھے اور بُرے بھی، فرض شناس بھی تھے اور لااُبالی بھی، خیر بھی وجود میں آتا اور شر بھی، مگر کیا مجال کہ حضرت مہتمم صاحبؒ کے حلم میں کوئی فرق پیدا ہو۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ مخالفتوں کا طوفان ہزاروں میل کی رفتار سے اُٹھا اور ان سے مسلسل ٹکراتا رہا، مگر ان کے حلم میں ذرّہ برابر کمی نہیں آئی، ایک شقی القلب نے جبکہ یہ پچاسی سالہ عمر سے گزر رہے تھے اور زکریا (علیہ السلام) کے لہجے میں: ''قَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا'' یعنی بڑھاپے کی وجہ سے ہڈیوں میں بھی گودا نہ رہا، کا پیکر بنے ہوئے تھے۔ ایک بے سروپا نہیں بلکہ فحش داستان نہایت متعفن لب و لہجے میں بعنوان ''امریکہ میں مولانا قاری محمد طیب کی عشق بازیاں'' اپنے اخبار میں لکھ کر شقاوتِ اَزلی کا مظاہرہ کیا تو دیوبند کے دو نامور صحافی حضرتؒ کے حلم کا امتحان لینے کے لئے یہ اخبار لے کر ان کی خدمت میں جاپہنچے، اخبار ان کے ہاتھوں میں تھا، عادت یہ تھی کہ جو چیز پڑھنے کی ملتی اُسے پورا پڑھ لیتے، مصروفِ مطالعہ ہوگئے، پورا مضمون پڑھ ڈالا، صحافی ان کے چہرہ و بشرہ کا جائزہ لیتے رہے مگر کیا مجال کہ چہرے پر آثارِ غضب نمایاں ہوں یا پیشانی پر تلخ احساسات کی کوئی لکیر پڑی ہو، مطالعے سے فراغت پر گردن اُٹھی اور لب ہائے نازک پر وہی دِلنواز مسکراہٹ کھیل گئی، دریافت فرمایا کہ یہ اخبار کچھ بِک بھی جاتا ہے؟ تو انہوں نے عرض کیا کہ بِکتا ہے اور پڑھا جاتا ہے، اسی وجہ سے تشویش ہوئی اور آپ کی خدمت میں تردید کے لئے

حاضر ہوئے، مگر دونوں کی توقعات پر آنے والا جملہ ارشاد فرما کر برف کے تودے پہ تودے گرادیئے:

بھائی یہ میری کتنی بڑی سعادت ہے کہ لوگ مجھے گالیاں دے کر
اپنا پیٹ پالتے ہیں اور مجھے مفت کا ثواب مل رہا ہے۔

بوڑھے کے اس حلیم جواب پر نوجوان صحافی غرقِ حیرت ہوگئے۔ فتنہ ہی کے دور میں انہیں خائن بھی کہا گیا اور غائن بھی، بددیانتی کا بھی الزام عائد ہوا، اور کذب بیانی کا بھی تا آنکہ ایک پوسٹر نکلا جس کا عنوان تھا:

"الملک الکذّاب المغضوب عند اللہ ورسولہ قاری محمد طیّب"

حالانکہ اس الملک الکذّاب کی صداقتِ لسانی کا یہ عالم تھا کہ ۲۱/اکتوبر ۱۹۸۱ء کو دارالعلوم کی مسجد میں خطاب کے دوران شور وغل ہوا اور زبردست دو تین دھماکے، ان کا گھیراؤ ہوا، بڑی مشکل سے ان کو اس گھیراؤ سے نکالا گیا۔

سنگ باری ہو رہی تھی، لاؤڈ اسپیکر پر قبضہ کرلیا گیا تھا، صبح کو دو مقامی وکیل رپورٹ قلم بند کر رہے تھے جس میں یہ بھی تھی کہ: "مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا" رپورٹ ترتیب دے کر مرحوم کو سنائی گئی، جب مذکورہ جملہ ان کے کانوں میں پڑا تو فرمایا کہ: "میں اس کا مدعی نہیں ہوسکتا" عرض کیا گیا کہ: کیا آپ نے دھماکے کی آواز نہیں سنی تھی؟ فرمایا کہ "ضرور سنی تھی"، پھر یہی تو حملہ تھا، ارشاد ہوا کہ "میں اس کے باوجود قاتلانہ حملے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔" وکلاء نے کہا کہ اس کے بغیر مقدمے میں جان نہیں پڑے گی، تو جواباً یہ فرماتے ہوئے مجلس سے اُٹھ گئے کہ "میں اسے نہیں جانتا کہ جان پڑے گی یا نہیں۔" ان کے سب سے بڑے حریف نے ایک موقع پر تقریر کرتے ہوئے یہاں تک کہہ ڈالا کہ:

مجھے اندیشہ ہے کہ مہتمم صاحب کا خاتمہ ایمان پر نہ ہوگا۔

ناقل نے یہ جملہ بلاکم وکاست خود مرحوم کو سنادیا اور اس یقین کے ساتھ کہ کم ازکم یہ

جملہ اس حلم کے پہاڑ کو آمادۂ لرزش کردے گا، مگر اسے بھی سن کر وہ تکیہ پر سر رکھتے ہوئے بولے کہ:

بھائی یہ خدا ہی جانتا ہے کہ کس کا خاتمہ ایمان پر ہوگا اور کس کا نہیں۔

اور استدلالاً یہ آیت پڑھی: ''وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَکْسِبُ غَدًا''۔ ان کی وفات کے بعد بنگلہ دیش کا چار رُکنی وفد برائے تعزیت دیوبند پہنچا تو ان سے معلوم ہوا کہ اسی حریف کو بنگلہ دیش میں عام و خاص نے گھیر کر پوچھا کہ:

مہتمم صاحب جیسے دیرینہ خادم کو دارالعلوم سے کیوں جدا کیا؟

تو ظالم کا جواب یہ تھا کہ:

مہتمم صاحب کو دارالعلوم سے نکالنا دِینی فرض ہوگیا تھا چونکہ انہوں نے دعوئ نبوّت کیا تھا۔

مجھے یقین ہے کہ اگر وہ اپنی زندگی میں اس سب سے بڑے باطل اور بھونڈے الزام کو سنتے تو ان میں ذرا بھی اشتعال پیدا نہ ہوتا۔ از گجرات تا بمبئ ایک ذمہ دار نے یہ من گھڑت بھی پھیلائی کہ:

تیسرے سال دارالعلوم کے خزانے سے ایک لاکھ چھتیس ہزار روپے کی ہونے والی چوری کے مرتکب خود مہتمم صاحب تھے، وہ ٹھیٹھ ایک ڈاکو کی شکل میں منڈاسا بر سر، ڈھاٹا بر رُخسار وقتِ شب خزانے میں داخل ہوئے نوٹ دوتھیلوں میں بھر لئے اور سر پر موجود قزاقانہ پگڑی میں سونے کے پتر رکھ لئے، بوڑھا ڈاکو خزانے سے باہر اندھیرے میں چلا تو کچھ بوجھ، کچھ بڑھاپا، اندھیرا گھپ، زینے سے لڑکھڑا کر نیچے گرا تو چور چور کا شور ہوا، روشنی کی گئی، آدمی دوڑے تو خود مہتمم تھا۔

استغفر اللہ والعیاذ باللہ، یہ من گھڑت مرحوم کے کانوں میں پڑگئی تھی، مگر

اس ظلم و عدوان کا بھی جواب ایک محبوبانہ و حکیمانہ مسکراہٹ کے سوا کچھ نہ تھا، ہوسکتا ہے کہ ان کے نادان مقتدین سے نادانیاں ہوئی ہوں لیکن وہ سب مرحوم کے کھاتے میں جمع کی جاتی رہیں، حریف حلقے میں کسی چھوٹے بڑے کو اس کی توفیق نہیں ہوئی کہ ان کی طرف براہِ راست رُجوع کرلے، اور ادھر مرحوم کا یہ عالم تھا کہ کھاتہ میں درآمد کی جانے والی ان خرافات پر بھی زبانِ حال سے یہ پڑھتے ہوئے ساکت و صامت رہے:

می آزم اعترافِ گناہ نکردہ را　　　تا منفعل ز رنجش بیجا نبینمش

آٹھ سال مکمل خاکسار کی ان کے ساتھ خلوَت و جلوَت میں شرکت رہی، خصوصاً یہ آخری تین سال فتنوں سے لبریز، تیروں کی بھرمار، الزامات کی بوچھاڑ، نکتہ چینیوں کے طوفان میں شب و روز کی یکجائی تھی، وہ اُٹھ گئے اور ایک دن اس خاک کو بھی ''کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ'' کا جام ہونٹوں سے لگانا ہے، مجھے ان کی قبر میں نہیں سونا اور نہ ان سے میرے حساب و کتاب کی پُرسش ہوگی، مگر میں پورے وثوق اور محاسبۂ آخرت کے یقین کے ساتھ شہادت دیتا ہوں کہ انہوں نے اپنے بڑے سے بڑے ستم گار، حریف اور پئے آزار، ناشائستہ و نابکار کے حق میں بھی زبان پوری قوت سے بند رکھی، اسی لب و لہجے میں جواب الجواب تو درکنار، مبنی برحقیقت، مہذّب تردید کے لئے بھی تیار نہیں ہوئے، غیبت کا ان کے یہاں دروازہ پوری قوت سے بند تھا، بہت کچھ کسی کے حق میں فرماتے تو یہ: ''بھائی بڑا اچھا آدمی تھا، کاش کہ کسی مفید کام میں لگتا'' یا ''فلاں صاحب تو اپنے ہی ہیں، خدا جانے ان کو کیا ہوگیا'' حالانکہ کبھی کبھی ان کے متعلقین پر ان کا یہ انداز گراں گزرتا، وہ مصلحت اور ضرورت کا تقاضا سمجھتے کہ حضرت کچھ جواب دیں، مگر یہاں لاکھوں کروڑوں تیروں کا ایک جواب ''نشانہ بننا تھا، نہ کہ نشانہ لگانا'' صورتِ حال پر کبھی بہت ہی دِل آزار ہوئے تو فتنے کے طول و عرض کو واضح کرنے کے لئے فضا میں اپنی انگشتِ شہادت گھماتے ہوئے فرماتے کہ:

بھائی یہ ہر وقت کی ہو ہو ہمیں تو اچھی نہیں لگتی، ہمارا تو لکھنا پڑھنا

بھی ختم ہو گیا۔

وقار اس طرح کوٹ کوٹ کر ان کی فطرت میں بھرا گیا تھا کہ کبھی بے وقاری کا کوئی پَرتو ان کی زندگی و کردار میں نہ نظر آیا۔

جس شب میں دارالعلوم پر قبضہ کیا گیا، ایک شور تھا اور ایک غل، لاؤڈ اسپیکر سے برابر اعلان ہو رہا تھا کہ:

> قاری طیب کا جنازہ دارالعلوم سے نکال دیا گیا، اب وہ کبھی لوٹ کر نہ آئے گا۔ ہم سے جو ٹکرائے گا پاش پاش ہو جائے گا۔

یہ مبارزانہ جملے مسلسل دارالعلوم کی مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے نشر ہو رہے تھے، وہ حسبِ معمول آخرِ شب میں تہجد کے لئے بیدار ہوئے، شور ان کے کانوں میں پڑا تو ایک بیٹے سے دریافت کیا کہ: ''یہ جلسہ اس وقت کہاں ہو رہا ہے؟''

بیٹے نے دفع الوقتی سے کام لیا، ذوق وشوق کے عالم میں تہجد سے فراغت ہوئی، مرحوم نے منہ میں پان دبایا پھر پوچھا کہ ''اب تک یہ جلسہ ختم نہیں ہوا، عجیب جلسہ ہے کہ ساری رات سے چل رہا ہے۔'' صبح ہوتے ہوتے دارالعلوم پر غاصبانہ قبضے کی دِلدوز خبر ان کے کانوں تک پہنچ گئی، مجھے تمام رات دارالعلوم کے جانے سے زیادہ یہ فکر رہا کہ کہیں یہ صدمۂ جانکاہ مرحوم کے لئے جان لیوا ثابت نہ ہو، صبح درِ دولت پر حاضری ہوئی تو وہ کوہِ وقار تعزیت کرنے والوں کی دھاڑیں سننے کے باوجود تسلی دیتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ:

> بھائی حکومتیں بدل جاتی ہیں، حاکم بدل جاتے ہیں، بادشاہتیں ختم ہو جاتی ہیں، بادشاہ بدل جاتے ہیں، دارالعلوم کا چلانا اور اس پر قبضہ ہو جانا بھی اسی طرح کا ایک واقعہ ہے۔
>
> اور اس کے بعد یہ فرماتے ہوئے کہ:
>
> میں نے اپنے لئے تین چیزیں منتخب کرلیں، سکوت، صبر، اِستغناء۔

ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئے۔ کانپور میں کچھ لوگوں نے ان کے آخری سفر میں انہیں کریدنا چاہا تو ذرا تلخی کے ساتھ فرمایا کہ:

میں اس غم کو کھرچ کھرچ کر اپنے دِل سے باہر نکالتا ہوں اور آپ مجھے اسی میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔

اس پر مجلس میں سناٹا ہوا اور سوال و جواب کا سلسلہ ہاتھوں سے نکل گیا۔

صبر و اِستغناء کا پیکر

ساٹھ سال انہوں نے دارالعلوم کا اہتمام کیا، دارالعلوم کی موجودہ تمام ترقیات ان کے میمون عہد کی یادگار ہیں۔ دارالعلوم ان کے جدِ اَمجد کا لگایا ہوا گلشن ہے، جس کے بلاشبہ مرحوم باغبان تھے، مگر دارالعلوم کے چلے جانے کے حادثے کے باوجود نہ وہ مضطرب ہوئے، نہ ان کے جامِ صبر وضبط میں کوئی چھلکا لگا، کوئی ان کی جگہ پر ہوتا تو تڑپ اُٹھتا اور اپنی تڑپ سے ایک عالم کو تڑپا دیتا۔ ان کے مرید بھی تھے اور معتقد بھی، ان کی تحریر جاندار تھی، خطابت کے وہ بادشاہ تھے، دُنیا انہیں جانتی تھی اور وہ عالم میں متعارف تھے، اگر جوابی اور منتقمانہ کاروائی پر اُتر آتے یا کم ازکم اپنا کیس ہی واقعاتی شکل میں دُنیا کے سامنے رکھتے تو حریفوں کے لئے ایک مسئلہ بن جاتے، مگر وہ اپنی زندگی میں شہرِ خموشاں بنے رہے، حریف ان کے زندہ مزار پر فاتحہ تو کیا پڑھتے، اس زندہ درگور کے لاتیں لگاتے رہے، گھونسے چلاتے رہے، مکے دِکھاتے رہے، منہ چڑاتے رہے مگر اس عجیب وغریب انسان نے خاموشی کا کفن پاؤں کی اُنگلی سے تا سر، اس طرح پہنا تھا کہ زندہ لاش میں کوئی حرکت وتموّج مل ہی نہ سکے، اور اب تو صرف اتنا ہی ان کے حریفوں سے کہا جاسکتا ہے:

قد تقدم الخصم الی موقع الفصل   وأنت علی الأثر مستقدم فتعلم

مگر یقین رکھنا چاہئے کہ ان کی مظلومیت رنگ لائے گی، ان کا صبر ایک نیا

تماشا دِکھائے گا اور اس تماشے کا شکار ان کے بدترین حریف ہوں گے۔ حلم کے ساتھ خدا تعالیٰ نے ان کو منکسر المزاجی کی دولت عطا کی تھی، چھوٹوں سے بھی معاملہ اس طرح کا فرماتے گویا وہ ان کے بڑے ہیں، اگر کسی کی بات مدلل ہوتی، مقدمہ بھی صحیح اور دلائل بھی واقعاتی تو پھر بات کسی جانب سے آئے چھوٹا ہو یا بڑا، محکوم ہو یا حاکم، ملازم ہو یا آقا فوراً اسے قبول فرمالیتے، بڑے سے بڑے مجرم کے لئے تنبیہ و سرزنش کا ان کے یہاں جواز ہی نہ تھا۔ دارالعلوم کے ایک دفتر میں کچھ گڑبڑ ہوئی، سب نے ان سے عرض کیا کہ آپ سرزنش فرمائیں، ایک عرصہ تک اس تلخ فریضے سے کٹتے رہے، ایک دن بڑے اصرار پر تیار ہوئے، مجرمین کو بٹھایا گیا، مرحوم سر بجیب ہوکر اپنے عام انداز و اطوار سے یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ میں ہی سب سے بڑا مجرم ہوں، ایک دِل پذیر وعظ ان کے سامنے فرمانے لگے، یہ تلخ فریضہ وہ کس کشمکش سے انجام دے رہے تھے اس کا اندازہ آپ کو اس سے ہوگا کہ وہ پسینے میں شرابور ہو چکے تھے، ندامت سے انہوں نے گردن نہیں اُٹھائی، اور جب وہ مجرمین سامنے سے اُٹھا دیئے گئے تو سرزنش کے لئے اصرار کرنے والوں سے بڑی تکلیف سے فرمایا کہ:

بھائی تم نے مجھ سے بڑا سخت کام لیا۔

اگر کبھی کوئی ان کی تعریف کرتا تو اپنی خلقی انکسار کی بنا پر ایک لطیف ترمیم کے ساتھ تعریفی جملے کو اس طرح واپس فرمادیتے کہ سننے والے عش عش کر کے رہ جاتے۔ گزشتہ سال سہارنپور میں تشریف فرما تھے، جسے حضرت کی تشریف آوری کی اطلاع ملتی وہ دوڑتا ہوا پہنچ رہا تھا، نشست گاہ بھر چکی تھی اور سامنے بھی آدمی کھڑے تھے، اتنے میں یوپی کے وزیرِ کابینہ یشپال صاحب پہنچ گئے، انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر مجمع کی کثرت پر عرض کیا کہ:

حضرت جہاں شہد ہوتا ہے، وہاں مکھیاں پہنچ ہی جاتی ہیں۔

برجستہ فرمایا کہ ''بھائی شہد کو بھی تو مکھیاں بناتی ہیں۔'' وزیر موصوف اس برجستگی اور بذلہ

سنجی پر انگشت بدنداں رہ گئے۔

انتقام ان کے مزاج میں ڈھونڈے سے نہ ملتا، حریف حلقے کے ایک جغادری نے مجھ سے خود کہا کہ: ''فلاں صاحب کی وفات کے بعد ہمیں یقین تھا کہ مہتمم صاحب ہمارا تیا پانچہ کریں گے، مگر داد دیجئے اس شخص کے مزاج و اخلاق کو منتقمانہ آنکھ بھی ہماری طرف نہ اُٹھائی ہے۔'' دارالعلوم کا موجودہ عملہ باستثناء دو چار کے سب ان کے زیرِ احسان ہے، انہی کی شفقتوں اور عنایات نے انہیں برسرِ روزگار کیا، ترقی دی، منصب بڑھایا، پھر اکثریت انہی سے دُشمن کی حیثیت سے سامنے آئی، مگر اس درویش نے اس ذلیل مظاہرے پر کسی دن کسی مجلس میں یہ بھی نہ کہا کہ: ''فلاں صاحب میرے ممنونِ کرم ہیں یا میں ان کا محسن ہوں۔'' ان کے سکوت و خاموشی سے بعض اوقات شدید نقصان پہنچتا، مگر یہ خاموشی ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی۔

مجلسِ شوریٰ کے توڑنے کا ان پر الزام عائد کیا گیا، حاشا وکلا، انہوں نے اس طرح کا کوئی قدم نہ اُٹھایا، بلکہ دِلّی کنونشن میں یہ مطالبہ ان سے کیا گیا تو اس مطالبے کی غیر معقولیت پر آدھ گھنٹہ تک بولتے رہے، تقریر کا ٹیپ آج تک موجود ہے، مگر ایک نادان نے مجلسِ شوریٰ میں ''ٹائیں ٹائیں فش'' کا پوسٹر نکال دیا اور یہ سفاہت و نادانی مرحوم کے کھاتہ میں پہنچی، مگر وہ اس پر بھی خاموش رہے۔ انہیں اپنے گلشن دارالعلوم سے کس قدر پیار تھا، اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ دارالعلوم کے دروازے ایک سال سے زائد عرصہ گزرا ان پر بند کردیئے گئے تھے اور اس مسلح انداز میں کہ مرحوم کی پرچھائیں بھی دارالعلوم پر نہیں پڑسکتی تھی، مگر ان کی آخری آرزو یہ تھی کہ میرا جنازہ دارالعلوم میں پڑھا جائے۔ الحمدللہ کہ ان کے اقرباء نے اپنے جذبات و احساسات کو ان کی آخری آرزو کی تکمیل میں حائل نہ ہونے دیا۔ آہ! کہ وہ دارالعلوم میں پھر زندہ نہ جاسکے بلکہ ان کا لاشہ ہی کاندھوں پر سوار ہوکر دارالعلوم میں پہنچا، ان کے ساتھ یہ ظلم کرنے والے خدا اور خدائی کو کیا جواب دیں گے؟ یقین ہے کہ کوئی عیارانہ

جواب اس کے لئے ڈھال لیا ہوگا۔ اب وہ شہرِ خموشاں کے مکیں ہیں اور زبانِ حال سے ان کی غمناک میّت کہہ رہی ہے کہ:

دَم بخود ہیں مقبروں میں، ہوں نہ ہاں کچھ بھی نہیں

مگر کیا عجیب ہے کہ چپ ہونے والی زبان احکم الحاکمین کے یہاں استغاثہ کرے، اور اگر ایسا نہیں ہوا، پھر تو یقیناً یہ ہوگا ۔

قریب ہے یار و روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

دو تین سال سے مطعون الجروح کردیئے گئے تھے، ان کی کردار کشی کے لئے جائز و ناجائز، گفتنی و ناگفتنی سب رَوا کرلیا گیا تھا، اب ان کا پورا خاندان دارالعلوم سے باہر ہے، نہ کسی کے پاس اقتدار اور نہ کوئی دارالعلوم کے سنگھاسن پر براجمان لیکن ان کا جنازہ جس شان وشوکت سے اُٹھا، جس اِخلاص و اِحتشام سے اُٹھایا گیا، وہ گویا کہ قدرت کے اس حکم کی تعمیل تھی ۔

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دُھوم سے اُٹھے

(ماہنامہ ''الخیر'' ملتان)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مختصر حالات و خدمات

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ

ماہِ جون ۱۸۹۷ء بمطابق ماہِ محرّم ۱۳۱۵ھ یک شنبہ کو خاندانِ قاسمی کے اس ہونہار فرزند نے اپنی مبارک پیدائش سے اس عالم کو منوّر کیا، اسمِ گرامی ''محمد طیب'' تجویز کیا گیا، اور تاریخی نام ''مظفرالدین'' رکھا گیا۔ سات سال تک بڑے ناز ونعم کے ساتھ والدین کی آغوش میں پروَرِش پاتے رہے۔ ۱۳۲۲ھ میں آپؒ کو تعلیم و تربیت کے لئے مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند کی آغوش میں دے دیا گیا۔ بوقت بسم اللہ شروع کرائی کے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ، مفتیٔ اعظم مولانا عزیز الرحمٰن عثمانیؒ، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی اور آپ کے والدِ محترم حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ جیسے اکابر و شیوخ موجود تھے۔ ان بڑے بڑے بزرگ علماء و مشائخ کی موجودگی میں مکتب نشینی کی مبارک تقریب عمل میں آئی، دو سال کی قلیل مدّت میں آپؒ نے پورا قرآن مجید حفظ کیا، اور اس کے ساتھ قراءت و تجوید میں مہارتِ تامہ حاصل کی۔ حفظِ قرآن شریف سے فراغت کے بعد درجۂ فارسی میں داخل کئے گئے، اور وہاں سے پانچ سال میں پورا نصاب مکمل کر کے سندِ فراغت حاصل کی، اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے شعبۂ عربی میں داخلہ لے لیا، چونکہ آپؒ بچپن ہی سے بے حد ذکی اور ذہین تھے اس لئے خدا نے قوتِ حافظہ بطورِ خاص آپؒ میں ودیعت

فرمائی تھی۔ نیز جس مقدس انسان حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ کی طرف آپؒ کی نسبی نسبت تھی، انہی کی نسبتِ رُوحانی نے مخفی صلاحیتوں کی رُوحانی تربیت ونگہداشت فرمائی۔ آٹھ سال کی مدّت میں آپؒ نے دارالعلوم کی تمام نصابی تعلیم سے ۱۳۳۷ھ میں فراغت پاکر سندِفضیلت حاصل کی۔

حدیث میں آپؒ کوخصوصی تلمذ امام العصر علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ سے حاصل رہا، اس کے علاوہ حدیث کی خصوصی سند آپؒ کو وقت کے مشاہیر علماء اور اساتذہ سے بھی حاصل ہوئی، چنانچہ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ نے بطورِ خود آپؒ کو سہارنپور طلب فرماکر اور اَوائلِ حدیث کی "اوت کراکر اپنی خصوصی سند خود اپنے دستِ مبارک سے لکھ کر عطا فرمائی۔ اسی طرح حضرت مولانا عبداللہ انصاری انبیٹھویؒ اور اپنے والدِ ماجد حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ سے بھی سندِ حدیث لی ہے، آپؒ کے دُوسرے اساتذہ میں حضرت مولانا مفتی عزیزالرحمٰن عثمانیؒ، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور حضرت مولانا سیّد اصغرحسین دیوبندیؒ شامل ہیں۔

ابتدائی حالات اور تعلیم وتربیت کے بعد آپؒ کی زندگی تین نمایاں گوشوں کے محوَر پر گھومتی نظر آتی ہے، یا یوں کہا جائے کہ آپ کی زندگی کے تین مرکزی مقام ہیں جہاں سے آپؒ کا نصب العین اور عنداللہ مقصدِ حیات سمجھا جاتا ہے۔

۱- مسندِ دَرس۔ ۲- مسندِ اہتمام۔ ۳- مسندِ رُشد و ہدایت۔

یہی تین پہلو ہیں جو حضرت حکیم الاسلام مرحوم کی زندگی کے تین اہم عنصر تھے، اور آپؒ کی تمام خدماتِ جلیلہ ان ہی تین گوشوں سے بطورِ خاص متعلق ہیں، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان تین گوشوں پر الگ الگ روشنی ڈالی جائے۔

مسندِ درس و تدریس

دورانِ تعلیم چونکہ اکابر کی حقیقت شناس نگاہوں نے آپؒ کی صلاحیتوں اور

خداداد علمی ملکات کو تاڑ لیا تھا، نیز آپؒ کے ذاتی اوصاف اور علمی صلاحیتوں کا سب ہی کو اعتراف تھا، اس لئے آپؒ کو تعلیم سے فراغت کے بعد منصبِ تدریس پر فائز کیا گیا۔ خداداد ذکاوت و ذہانت، علم و فراست اور پھر خاندانی وجاہت و نسبت کی بناء پر بہت جلد آپؒ نے عام مقبولیت اور علمی حلقوں کی گرویدگی حاصل کرلی۔ اس مسندِ علم و فضل پر فائز ہونے کے بعد آپؒ کے اوصاف و کمالات کے حقیقی جوہر کھلے، جس کا اکابر نے تہہ دِل سے اعتراف کرتے ہوئے ہمیشہ عزّت افزائی کی، حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ اکثر تبلیغی اَسفار میں آپؒ کو اپنے ہمراہ رکھتے اور بڑے بڑے نازک مواقع پر بہ تقاضائے وقت مختلف موضوعات پر آپؒ سے تقریر کراتے اور اظہارِ اطمینان و مسرّت فرماتے۔

بہرحال مسندِ درس و تدریس پر فائز ہونے کے بعد شروع میں آپؒ نے فقہ، منطق، فلسفہ، صرف و نحو، معانی اور دیگر مہتم بالشان فنون کی اہم کتابیں نہایت شان و شوکت سے پڑھائیں۔ اسی اثنا میں اہتمام کی اہم ذمہ داریاں بھی حضرتؒ کو سونپی گئیں، لیکن باوجودیکہ دارالعلوم کے انتظام و انصرام کی ذمہ داریاں بڑھ چکی تھیں، نیز ملک میں تبلیغی اَسفار کثرت سے بھی زیادہ تجاوز کر چکے تھے، مگر آپؒ کا ذوق و شوقِ تدریس برابر اسی نہج پر تھا اور اس زمانۂ اہتمام میں بھی کچھ نہ کچھ اسباق اپنے ذمہ کئے رہے اور الحمدللہ ان دنوں جبکہ دارالعلوم کی انتظامی مشغولیت اور مصروفیت اس حد تک تھی کہ شب و روز کا کوئی لمحہ اس سے فارغ نہیں تھا، مگر اس کے باوجود آخر تک آپؒ نے کبھی درس و تدریس سے کنارہ کشی اختیار نہ کی۔ اس عرصے میں مختلف علوم و فنون کی اہم کتابوں کا درس آپؒ دیتے، خصوصیت سے ''حجۃ اللہ البالغہ'' آپؒ کے درس میں زیادہ رہتی تھی، کہ جس میں آپؒ کے ذوقِ حکیمانہ کے جوہر و اسرار خوب کھلتے اور پڑھنے والوں کی تشریعاتِ اسلامی کے ان مخفی پہلوؤں پر آپؒ کے درسِ گرامی سے وہ نظر ہوجاتی جو برسہا برس کی محنتوں کے بعد بھی آنا مشکل ہے، حق یہ ہے کہ حکمتِ ولی اللّٰہی کے لئے

جس فکری عروج کی ضرورت ہوتی ہے وہ بدرجۂ اُتم حضرت حکیم الاسلام مرحوم میں موجود تھا۔ اس کے علاوہ ابنِ ماجہ شریف اور مشکوٰۃ شریف بھی برابر زیرِ درس رہتی تھیں، کئی سال آپؒ نے شمائلِ ترمذی کا درس بھی دیا تھا، حضرت قاری صاحبؒ ایک طرف تو حضرت مولانا نانوتویؒ کے علوم و معارف کے صحیح وارث تھے اور دُوسری طرف براہِ راست حضرت شاہ صاحبؒ سے شرفِ تلمذ حاصل تھا، اس لئے آپؒ کے درس میں دونوں بزرگوں کے علوم و معارف کا فیضان رہتا تھا۔ چنانچہ آپؒ منقولات اور تشریعاتِ اسلامی کو دلائلِ عقلیہ سے اس انداز میں ثابت فرماتے کہ جس سے ہر دور کا ذہن مطمئن ہوسکے، اور حضرت نانوتویؒ کے رنگ میں اسلامی تعلیمات پر تقریر اسی نہج سے کرتے کہ مسئلے کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں رہنا تھا، جن لوگوں نے حضرت حکیم الاسلام کی درسی تقاریر سنی ہیں، وہ اس بات کو جانتے ہیں کہ بعض مرتبہ علومِ قاسمیہ کا فیضان اس طرح ہوتا کہ بے ساختہ حضرتؒ کی زبان سے حضرت نانوتویؒ کی پوری پوری تقریر نقل ہوتی چلی جاتی تھی، اور بسا اوقات تو اتنی ہم آہنگی ہوتی تھی کہ الفاظ تک میں کوئی تغیر نہیں ہوتا تھا۔

الغرض حضرتؒ کی درسی تقریریں، تبحرِ علمی، وسعتِ مطالعہ، دقتِ نظر اور تحقیقِ مسائل کی بناء پر علمی حلقوں میں عزّت و احترام کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں اور ایک طالبِ علم آپؒ کے درس میں بیٹھ کر علم و فضل کے اس خزانے سے اپنے دامنِ مراد کو بھر کر اُٹھتا تھا۔

دارالعلوم دیوبند کی مسندِ اہتمام

اگر مجھے عرفِ عام اور مخصوص ذہن سے قطع نظر قیادت کے حقیقی معنی اور مفہوم مراد لینے کی اجازت دی جائے تو میں یہاں بجائے مسندِ اہتمام کے منصبِ قیادت کا عنوان رکھ سکتا ہوں، اس لئے کہ یہ حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی

کا وہ مقام ہے جہاں آپؒ کی عزّت وعظمت کا اعتراف کرتے ہوئے ملتِ اسلامیہ نے آپؒ کے سر پر قیادت اور راہ نمائی کا تاج رکھا تھا۔ دارالعلوم دیوبند، مسلمانانِ پاک و ہند ہی کے لئے نہیں بلکہ عالمِ اسلام کا بین الاقوامی مذہبی ادارہ ہے اور اس اعتبار سے ملتِ اسلامیہ کا یہ قلب ہے جہاں سے ان کی رُوح اور فکر کی جلا کا سامان بہم پہنچایا جاتا ہے۔ اس عظیم ادارے کی اہم ذمہ داری (صدارتِ اہتمام) کے لئے کسی شخصیت کا انتخاب ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس جلیل القدر منصب پر اسی شخص کا انتخاب ہوسکتا ہے جو کمالاتِ علمی اور اوصافِ باطنی و ظاہری سے پوری طرح مزین ہو، اگر ایک طرف وہ علم وفضل، زُہد وتقویٰ، دیانت وامانت، فہم وفراست میں ممتاز مقام کا مالک ہوتو دُوسری طرف قوم وملت میں باا ثر اور بارُسوخ ہو، اس کی قیادت پر بھروسہ کیا جاسکتا ہو اور اس کی راہ نمائی پر قوم کو اطمینان ہو۔

اب اگر اس حیثیت سے حضرت حکیم الاسلامؒ کی شخصیت کا جائزہ لیا جائے تو اس حقیقت کا اعتراف ناگزیر ہوگا کہ ۱۳۴۸ھ میں وقت کے اکابر وشیوخ اور ذمہ دار حضرات نے اپنے متفقہ ریزولیشن کے مطابق مسندِ اہتمام پر حضرت حکیم الاسلام مرحوم کو فائز کرنے کا جو فیصلہ کیا تھا وہ ان کی حقیقت آشنا نگاہوں کی کرشمہ سازی تھی کہ انہوں نے حکیم الاسلامؒ کی علمی صلاحیتوں کا اندازہ کرکے اس عظیم مسند کا ان کو اہل قرار دیا، جو درحقیقت عالمِ اسلام کی قیادت وراہ نمائی کے مترادف تھا۔ ادارۂ اہتمام سے تو آپؒ کا تعلق ۱۳۴۰ھ ہی میں قائم ہوگیا تھا جبکہ آپ کو دارالعلوم کا نائب مہتمم بنایا گیا، اس عرصے میں آپؒ دارالعلوم کے انتظامی معاملات کا جائزہ اور ادارۂ اہتمام کے انصرامی معاملات میں حصہ لیتے رہے۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ کے انتقال کے بعد منصبِ اہتمام پر کسی اہم شخصیت کی ضرورت کا مسئلہ سامنے آیا تو اکابر دارالعلوم اور ممبران مجلسِ شوریٰ کی نظرِ انتخاب آپؒ ہی پر پڑی۔ ایک طرف تو آپؒ کی علمی اور تبلیغی خدمات کی بناء پر ملک

میں آپؒ کا بہت زیادہ اثر و رُسوخ ہوگیا تھا، دُوسری طرف نیابت و اہتمام کے دوران انتظامی صلاحیت کے سب ہی معترف تھے، لیکن اس کے علاوہ جو سب سے اہم چیز اکابر کے داعیہ کا باعث بنی وہ درحقیقت حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند سے آپ کا نسبی انتساب تھا، جو ہمیشہ سے دارالعلوم کی ترقی و کامیابی اور فلاح و بہبود کے لئے اکابر کی نظروں میں خاص اہمیت رکھتا تھا، چنانچہ باوجودیکہ حضرتؒ کا خاص علمی ذوق اور آپؒ کا رُجحانِ طبع انتظامی معاملات کی طرف مائل نہ تھا لیکن حضراتِ اکابرِ دارالعلوم نے بصد اصرار آپؒ کو مجبور کیا کہ دارالعلوم کی باگ ڈور اپنے باوقار ہاتھوں میں لیں، لہٰذا ۱۳۴۸ھ میں آپؒ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم اعلیٰ قرار دیئے گئے اور یہیں سے اس شاندار داستان کی ابتداء ہوتی ہے جو دارالعلوم کی بے پناہ مقبولیت، عالمگیر ہمت، ادارے کی بین الاقوامیت اور اس کی ترقی اور کامیابی کے لئے دارالعلوم کی تاریخ کا ایک تابناک باب ہے، جسے دارالعلوم کی علمی و درسی تاریخ امام العصر علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کی مثال اس حیثیت سے پیش کرنے سے عاجز ہے کہ ان کے دور میں دارالعلوم کا درسی عروج اور علمی وسعت اس درجے کی تھی کہ اس وقت دارالعلوم کی آغوشِ علم و تربیت سے پرورِش پاکر نکلنے والا ہر فاضل اپنی اپنی جگہ آفتاب و ماہتاب تھا۔ ٹھیک اسی طرح دارالعلوم کی پوری تاریخ حضرت حکیم الاسلام مرحوم کا اسمِ گرامی فخر سے پیش کرسکتی ہے کہ اس کی ترقی و کامیابی اور اس کی رفعت وعظمت کا راز حکیم الاسلامؒ کی زندگی میں پوشیدہ ہے۔ ۱۳۴۸ھ میں جبکہ آپؒ نے دارالعلوم کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی، اس کے انتظامی شعبے صرف آٹھ تھے اور بعد میں حضرتؒ کے آخری دور تک تقریباً پچّیس[۲۵] یا تمیں[۳۰] تھے۔ اس وقت دارالعلوم کا کل بجٹ محض پچاس ہزار روپے تھا اور بعد میں حضرتؒ کے دورِ اہتمام کے آخری سالوں تک تقریباً آمدنی کا تخمینہ تیس لاکھ سے بھی زائد ہوگیا تھا۔

اس زمانے میں دارالعلوم کا عملہ ۴۵ افراد پر مشتمل تھا، اور حضرتؒ کے آخری

دور تک تقریباً تین سو افراد کا اسٹاف تھا، جو دارالعلوم کی خدمت میں مصروفِ عمل رہا۔ اسی طرح دارالعلوم کی تعمیری ترقی میں بھی نمایاں فرق ہوا، ۱۳۴۸ھ میں دارالعلوم کی عمارتوں کا تخمینہ چند ہزار روپے سے آگے نہیں تھا، لیکن حضرتؒ کے دورِ اہتمام میں کروڑوں روپے کی فلک بوس عمارتیں قوم کی امانت ہیں۔ غرضیکہ مسندِ اہتمام پر فائز ہونے کے بعد دارالعلوم کی ارتقائی زندگی روز بروز بڑھتی گئی۔ چنانچہ متعدّد بار دارالعلوم کی مجالسِ شوریٰ ومنتظمہ نے آپؒ کی اس کارگزاری اور خدمات کے سلسلے میں بطور تشکر وامتنان پاس کئے گئے ریزولیشن کے ذریعہ اس حقیقت کا اعتراف کیا۔

دورِ اہتمام ہی میں آپؒ کا سفرِ افغانستان آپؒ کی جلیل القدر خدمات وعظمت کی ایک مستقل تاریخ ہے، جبکہ دارالعلوم کے نمائندے کی حیثیت سے دارالعلوم اور افغانستان کے درمیان علمی وعرفانی رابطہ پیدا کرنے کے لئے آپؒ نے یہ سفر ۱۳۵۸ھ میں اختیار کیا تھا، وہاں اگر علمی حلقوں نے آپؒ کا شاندار استقبال کیا، اور انجمن ادبی (اعلیٰ سرکاری سوسائٹی)، مجلسِ قانون جمعیت علمائے کابل یونیورسٹی اور دُوسرے تعلیمی اداروں نے آپؒ کو دعوت دے کر آپؒ کے علمی وعرفانی فیض سے استفادہ کیا، تو دُوسری طرف حکومتِ افغانستان نے سرکاری طور پر آپؒ کا خیر مقدم کرکے اور شاہِ افغانستان نے ایک گراں قدر خطیر رقم دارالعلوم کو عنایت فرما کر آپؒ کی عظمت واحترام کا اعتراف کیا۔ ان دنوں ہی برما کا اہم سفر بھی دارالعلوم کی ارتقائی زندگی کا ایک جلی عنوان ہے جس سے دارالعلوم کی مالی منفعت اور ترقی میں کافی اضافہ ہوا۔

الحاصل اگر مجموعی طور پر سوال کیا جائے کہ ۱۲۸۳ھ میں قائم ہونے والے اس چھوٹے سے مکتب کو آگے بڑھا کر دارالعلوم کا رنگ دینے والا کون ہے؟ تو موجودہ دور کی ۱۲۰ سالہ تاریخ نہایت عقیدت سے حضرت حکیم الاسلامؒ کا نام دُنیا کے سامنے پیش کردے گی۔ (حکیم الاسلامؒ کے دورِ اہتمام میں دارالعلوم دیوبند کی ترقیات کی تفصیل احقر کی کتاب ''ذکرِ طیب'' میں دیکھئے)

مسندِ رُشد و ہدایت

ایک مصلح اور رہنما کی عنداللہ انتہائی معراج یہ ہوتی ہے کہ مخلوقِ خدا کی ظاہری و باطنی اصلاح کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دے اور دُنیا کی ہر ضلالت و گمراہی میں ہدایت اور راستی کے فانوس جلاتا رہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اہل اللہ کے ہاں تین ہی طریقے ہوتے ہیں، کوئی تصوّف وسلوک کی راہ سے گم کردہ راہِ حق کی ہدایت کرتا ہے، کوئی اپنے قلم کی سحر طرازیوں سے عوام کی اصلاح کرتا ہے، یا پھر تبلیغ و دعوت کے لئے تقریر کے میدان کو پسند کرتا ہے، لیکن اگر میدان فیاض کی طرف سے کسی شخصِ واحد میں یہ تینوں مَلکے ودیعت کردیئے جائیں تو اس کی جامعیت اور اکملیت تو مسلّم ہوتی ہے، لیکن تبلیغ و دعوت جیسے عظیم مقصد میں کامیابی اپنے انتہائی عروج پر ہوتی ہے۔ ہم آج بلامبالغہ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت حکیم الاسلامؒ مسندِ رُشد و ہدایت کے اعلیٰ مقام پر تھے، کیونکہ اگر آپؒ ایک طرف راہِ طریقت اور تصوّف وسلوک کے ذریعہ خلق اللہ کے تزکیۂ نفس اور ان کی اصلاحِ باطنی میں مصروف رہے تو دُوسری طرف اپنی تقریر وتحریر کے ذریعہ بیرونِ ملک میں گمراہی و تاریکی کے اس دور میں حقیقت و معرفت کی شمعیں جلاتے رہے۔ پہلے آپؒ کا سلسلۂ بیعت شیخِ وقت حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی قدس سرہٗ سے قائم ہوا، ابھی آپؒ راہِ طریقت کی اعلیٰ منازل طے کررہے تھے کہ حضرت شیخ الہندؒ کا وصال ہوگیا، ان کے بعد آپؒ نے اپنے زمانے کے سب سے بڑے شیخ قطب العالم حضرت حکیم الأمت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کی طرف رُجوع کیا اور آپؒ کی نگرانی میں راہِ معرفت وحقیقت کے اعلیٰ مدارج طے کئے، حضرت حکیم الأمت تھانویؒ کے یہاں آپؒ کی بڑی قدر ومنزلت تھی اور آپؒ کی تربیت میں مخصوص طریقے سے حصہ لیتے تھے، آخرکار جب شیخ کی حقیقت آشنا نگاہوں نے مرید کے جواہرِ استعداد کا اعتراف کرلیا تو ۱۳۵۰ھ میں آپؒ

کو اپنا مجاز قرار دے دیا، اور خلافت وخلعتِ فاخرہ سے مشرّف فرمایا۔

اس کے بعد حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ اپنے چشمۂ ہدایت سے تشنہ گامانِ قلب و رُوح کو سیراب فرمانے لگے، اور راہِ حق کے طلب گار اپنی آرزوؤں اور اُمیدوں کی جھولی اس خزانۂ معرفت سے بھرتے رہے اور فیض حاصل کرتے رہے۔ ملک اور بیرونِ ملک میں حضرتؒ کے مریدین ومسترشدین کی تعداد ہزاروں سے تجاوز ہے، جو براہِ راست آپؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت ہوکر آپؒ کی رُوحانی تربیت اور ہدایت و اصلاح سے اپنی زندگی کو منوّر کر رہے ہیں، ان کے علاوہ ایک بہت بڑا طبقہ ایسا بھی رہتا ہے جو راہِ حق کے طلب گار ہوتے ہیں اور بذریعہ خط و کتابت آپؒ کی رُوحانی وعرفانی ہدایتوں سے مستفید ہوتے رہتے ہیں۔

تبلیغی و تصنیفی خدمات

رُشد و ہدایت کے سلسلے میں حضرت حکیم الاسلام کی تبلیغی تقریریں اور وعظ آپؒ کی زندگی کا مابہ الامتیاز مقام تھا کہ جس کی وجہ سے پاک و ہند کا چپہ چپہ گونجتا رہا اور لاکھوں کی تعداد میں مسلمان آپؒ کی تقریروں کی وجہ سے گمراہی سے نکل کر ہدایت وراستی کی روشنی پاتے رہے۔ فنِ خطابت اور تقریر میں آپؒ کو خداداد ملکہ اور قوتِ گویائی حاصل تھی، زمانۂ طالب علمی سے آپؒ کی تقریریں پبلک جلسوں اور علمی حلقوں میں قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں، اہم سے اہم مسائل پر تین تین چار چار گھنٹے مسلسل تقریر کرنے اور علمی مواد پیش کرنے میں آپؒ کو کوئی رُکاوٹ محسوس نہیں ہوتی، حقائق وشریعت کے بیان و ایجادِ مضامین میں آپؒ کو خاص قدرت حاصل تھی جسے بڑے بڑے اہلِ علم تسلیم کرنے پر مجبور ہوتے تھے۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ آپؒ کے علمی اور حکیمانہ اُسلوبِ بیان سے خاص طور پر محظوظ ہوتا رہا۔

چنانچہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں آپؒ کی علمی تقریریں خاص وقعت کی نگاہ

سے دیکھی جاتی تھیں، بعض تقریریں مسلم یونیورسٹی نے شائع بھی کی ہیں۔ فِرقِ باطلہ کے رَدّ میں آپؒ کی انفرادی شان ہے، نہایت باوقار، متین اور سنجیدہ لہجہ اختیار فرماتے، بازاری اور سوقیانہ طرز سے ہٹ کر خالص علمی و اصلاحی انداز میں گمراہ عقائد کا اس طرح رَدّ فرماتے کہ مخالف بھی متأثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ آپؒ کی بعض تقریریں تاریخی اہمیت کی حامل ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں سرکاری عربی مدارس کے نصاب کی ترتیب و تدوین کے لئے مولانا ابوالکلام آزادؒ کی زیرِ صدارت کونسل ہاؤس لکھنؤ میں منعقدہ کانفرنس کی وہ تقریر جو حضرت حکیم الاسلام مرحوم نے علمائے دیوبند کی قیادت کرتے ہوئے فرمائی تھی وہ آج بھی تاریخِ خطابت کا انمول شاہکار ہے، جس پر مولانا ابوالکلام آزادؒ جیسا خطیب بھی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔

۱۹۵۳ء میں بسلسلۂ سفرِ حجاز آپؒ نے ہندوستان کے ایک مؤقر وفد کی قیادت کرتے ہوئے سلطان ابنِ سعودؒ کے دربار میں ایک شاندار تقریر فرمائی جس پر سلطان بہت متأثر ہوئے اور بوقتِ رُخصت شاہی خلعت اور بیش قیمت کتب کے عطیہ کے ذریعہ اپنی عقیدت و محبت کا اظہار کیا۔ آپؒ نے افغانستان، برما اور افریقی ممالک کے اَسفار و دورے بھی کئے، دیوبند میں زمانۂ قیام میں روزانہ بعد مغرب آپؒ کی مجلس مقامی اور غیر مقامی طالبانِ حق کے لئے ایک مکتبِ رُشد و ہدایت کی حیثیت رکھتی تھی، جس کا موضوع عموماً علمی مذاکرہ رہتا تھا، جس میں آپؒ مختلف موضوعات پر اپنی علمی تحقیق سے حاضرین کو محظوظ فرمایا کرتے تھے۔ اس سلسلے کی تیسری کڑی آپؒ کا مشغلۂ تصنیف و تألیف تھی، آپؒ کی مضمون نگاری اور انشاپردازی کی ابتداء زمانۂ طالب علمی سے ''القاسم'' کے صفحات سے شروع ہوئی، جب ہی سے آپؒ کے تحقیقی مقالے علمی حلقوں میں بنظرِ استحسان دیکھے جاتے تھے۔ انشاپردازی میں آپؒ انفرادی حیثیت کے مالک تھے، پاکستان و ہند کے طبقۂ علماء کے صفِ اوّل کے اہلِ قلم اور مقالہ نگار تھے، ملک کے مؤقر جریدے اور رسالے آپؒ کے مضامین کی اشاعت باعثِ فخر سمجھتے

تھے۔ اس فن میں بھی آپؒ کو خاص ملکہ حاصل تھا، اور اَدق سے اَدق موضوع پر لمبے لمبے طویل مقالے اور مضامین ایک ہی نشست میں لکھ دیتے تھے۔ آپؒ کی تصنیف و تألیف اور مقالہ نگاری کا اکثر حصہ دورانِ سفر انجام پاتا، تصنیف و تألیف کی تعداد بہت زیادہ ہے، اگر الگ الگ کتابوں پر تبصرہ کیا جائے تو صفحات کو تنگ دامنی کا گلہ ہوگا، اس لئے صرف ان کتابوں کے نام لکھنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

آپؒ کی سب سے پہلی تصنیف "التَّشَبُّهُ فی الاسلام" (اسلامی تہذیب و تمدّن) ہے جو آپؒ کے ابتدائی دور کی شاہکار ہے، علمی حلقوں نے اسے بہت زیادہ پسند کیا ہے، اس کے علاوہ مندرجہ ذیل کتابیں زیورِ طبع سے آراستہ ہوکر مقبولِ خاص و عام ہوچکی ہیں: فطری حکومت، اسلام اور فرقہ واریت، سائنس اور اسلام، مشاہیرِ اُمت، شانِ رسالتؐ، فلسفۂ نماز، شرعی پردہ، داڑھی کی شرعی حیثیت، مسئلۂ تقدیر، اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام، علمِ غیب، خاتم النبیّین، اسلام اور مغربی تہذیب، تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام، اُصولِ دعوتِ اسلام، اسلام عالمی مذہب، نظریۂ دو قرآن پر ایک نظر، اور کلمہ طیبہ کی حقیقت وغیرہ۔

تصانیف کے علاوہ ان علمی مقالوں کی تعداد حدِ کثرت سے تجاوز ہے جو پاکستان و ہندوستان کے مقتدر علمی جرائد کی زینت بن چکی ہے۔

بہر حال ساری زندگی خدمتِ اسلام میں گزار کر ۶ر شوال ۱۴۰۳ھ - ۱۷ر جولائی ۱۹۸۳ء کو رحلت فرمائی۔ (''الرشید'' مدنی نمبر)

حکیم الاسلامؒ کے سیاسی نظریات

ہندوستان کے طبقۂ علماء میں یہ شرف اور یہ سعادت صرف اور صرف حکیم الاُمت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور ان کے خلفاء مجازین اور ان کے ہم مسلک و ہم مشرب علمائے دِین کو حاصل تھا کہ انہوں نے کانگریس کے معاملے میں علی

الاعلان کھلے بندوں قائدِ اعظم اور مسلم لیگ کی حمایت و اعانت کی اور اس وقت کی جب پورے ملک میں سیاسی طوفان آیا ہوا تھا، تحریکِ خلافت، ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد بن چکی تھی، مسلمان ''گاندھی کی جے'' کے نعرے لگا رہے تھے، اور ہندو ''محمد علی، شوکت علی کی جے'' پکار رہے تھے، اور اس وقت اکبر کے دِینِ الٰہی کی طرح ایک ایسے مذہب کی بنیاد پڑ رہی تھی جو ہندو مسلمان کا سرے سے امتیاز ہی اُٹھا دینا چاہتا تھا اور جسے حکیم الاُمت تھانویؒ نے اس دور کا ایک بہت بڑا فتنہ قرار دیا تھا، جس کی بناء پر آپؒ کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا، اور فی الواقعہ حضرت تھانویؒ کے اعلان کی اشاعت کے بعد آپؒ پر قاتلانہ حملہ بھی ہوا، مگر قاتل ہیبتِ حق کی تاب نہ لاکر اُلٹے پاؤں واپس دوڑ گئے، اور پھر ساری تحریک مسلم لیگ کے دوران کسی کو ایسی جرأت نہ ہوئی۔

حضرت تھانویؒ بقول مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ:-

''انگریز حکومت اور کانگریس کے درمیان رسہ کشی میں مسلمانوں کو بالکل غیر جانبدار اور یک سو دیکھنا چاہتے تھے اور سمجھتے تھے کہ جب تک مسلمان اپنے اندر پوری قوت نہیں پیدا کر لیتے ان کا کسی فریق کے ساتھ شامل ہوکر عملی حصہ لینا خودکشی کے مترادف ہوگا اور سارا زور اس پر دیتے تھے کہ مسلمان پہلے اپنے اندر قوت و نظم پیدا کریں۔'' (حکیم الاُمتؒ ص:۲۷۶)

اسی لئے جب بعض اربابِ دارالعلوم دیوبند کانگریس کی حمایت میں میدان میں نکل آئے تو آپؒ نے دارالعلوم کی سرپرستی سے استعفاء دے دیا۔ ۱۹۳۵ء میں جب مسلم لیگ کو جھانسی میں کانگریس کے مقابلے میں الیکشن لڑنا پڑا اور کانگریس لیگ کے مقابلے میں نام وَر علماء کو میدان میں لائی تو عوام نے مولانا شوکت علی سے مطالبہ کیا کہ ان جید علماء کے مقابلے میں آپ جب تک کسی بہت بڑے عالم کو میدان میں نہ لائیں گے، یہ الیکشن نہ جیت سکیں گے۔

اسی پریشانی کے عالم میں آپ کی نظریں تھانہ بھون کی طرف دوڑیں اور

آپ نے عوام سے پوچھا کہ کیا آپ کو حضرت تھانوی پر اعتبار ہے؟ تو سب نے کہا: اعتماد ہے۔ مولانا شوکت علی نے کہا: اب آپ ان کو تار دے کر پوچھ لیں کہ ووٹ کانگریس کو دیں یا لیگ کو؟ جب یہ سوال آپؒ کے سامنے آیا تو آپ نے مولانا شبیر علی تھانویؒ اور مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کو مشورے کے لئے طلب فرمایا، اور مسئلہ زیر سوال کے تمام پہلوؤں پر غور و مشورے کے بعد آپؒ نے صرف یہ تار دے دیا کہ کانگریس کو ووٹ نہ دیا جائے۔

بس تار کے جواب جانے کی دیر تھی کہ حضرت تھانویؒ کے اس جواب کے بڑے بڑے پوسٹر شہر کے در و دیوار پر نظر آنے لگے، کانگریس بُری طرح ہار گئی اور مسلم لیگ کا بول بالا ہوگیا، مولانا شوکت علی نے تھانہ بھون جا کر حضرت تھانویؒ کے تار کا شکریہ ادا کیا اور کہا:-

> جھانسی کے میدان میں ہمارے پاس کانگریس کے برابر نہ لاریاں تھیں نہ روپیہ پیسہ تھا، آپ کے تار نے کچھ ایسا اثر کیا کہ کایا پلٹ دی، مسلمانوں میں یکا یک مسلم لیگ کے حق میں جوش پیدا ہوگیا جس کی وجہ سے ہم کامیاب ہوئے۔
>
> (سیرتِ اشرفؒ ص:۵۸۳)

حقیقتِ کانگریس:- حضرت حکیم الاُمتؒ ہر بات کو قرآن کی کسوٹی پر پَرکھنے اور قرآن کے آئینے میں دیکھنے کے عادی تھے، اگرچہ انگریز دُشمنی کی وجہ سے ہندوستان کے کئی بڑے علماء کانگریس کے ساتھ تھے، مگر حضرت تھانویؒ انگریزوں کی طرح ہندوؤں کو بھی مسلمانوں کا صریحاً دُشمن سمجھتے تھے، آپؒ کی نظر وقتی مصالح پر نہ تھی بلکہ اس ارشادِ ربانی پر تھی کہ:-

> کفار تو ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ اگر قابو پاویں تو تم کو تمہارے دِین سے پھیر دیں۔ (البقرہ:۲۱۷)

اس لئے حضرت تھانویؒ مسلمانوں کے کانگریس میں شمولیت کے حق میں نہیں تھے، اگرچہ کانگریس میں اکثریت ہندوؤں کی تھی مگر کوئی کانگریس کا نام تک نہیں جانتا تھا، لیکن جب مسلمانوں نے ۵۰ سالہ مردہ کانگریس میں شرکت کرکے اس میں رُوح پھونکی تو کانگریس مسلمانوں کو ہڑپ کرنے کی سوچنے لگی، اسی لئے حضرت تھانویؒ فرماتے تھے کہ:-

۱- جو آدمی بھی حدودِ شریعت سے گزر کر کام کرے گا اس کا بُرا حشر ہوگا۔ اسی بناء پر ہم کانگریسیوں کی مدد نہیں کرسکتے، کیونکہ کانگریسی اصل میں بالشویک ہیں، یہ کسی طرح بھی مذہب کی حامی جماعت نہیں، اگر خدانخواستہ یہ جماعت ہندوستان میں برسرِ اقتدار آگئی اور خدا نہ کرے وہ دن آئے تو یہ بھی ہندوستان میں وہی کریں گے جو (رُوس میں) بالشویک کررہے ہیں۔
(الافاضات الیومیہ جلد پنجم ص:۸۸)

۲- مسلمانوں خصوصاً علماء کا کانگریس میں شریک ہونا میرے نزدیک مہلک ہے بلکہ کانگریس سے بیزاری کا اعلان کردینا بہت ضروری ہے، علماء کو خود مسلمانوں کی تنظیم کرنی چاہئے، مسلمانوں کو کانگریس میں داخل ہونا اور داخل کرنا میرے نزدیک ان کی دِینی موت کے مترادف ہے۔ (ملفوظاتِ اشرفیہ ص:۸۸)

۳- ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں اس لئے ناکامی ہوئی کہ اس تحریک میں ہندو شامل تھے، دونوں شانہ بشانہ لڑ رہے تھے، مگر ہندوؤں نے وقت پر دغا دی اب بھی ان سے وفا کی اُمید نہیں ہے، یہ وقت پر دھوکا دیں گے، مسلمان اپنے ہی پاؤں پر کھڑا ہوکر کامیاب ہوسکتا ہے، دُوسروں کے سہارے کبھی نہیں۔
(سیرتِ اشرفؒ ص:۶۸)

۴- جو جماعت کانگریس کے نام سے مشہور ہے یہ بھی سب وہی بالشویک خیال کی پارٹی ہے اور یہ سب اسلام کے مقابلے پر سازش ہے۔ (الافاضات ج:۱ ص:۹۰)

۵- کانگریس انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنا ہی نہیں چاہتی، درحقیقت ان کی عافیت ہی اسی میں ہے کہ انگریز ہندوستان میں رہیں تاکہ وہ ان کے زیرِ سایہ اپنی قوم کو پروان چڑھائیں۔

(اسعد الابرار ص:۵۱)

۶- قیامت آجائے، ہندو کبھی مسلمانوں کے ہمدرد اور خیرخواہ نہیں ہوسکتے، یہی ہندو تو تھے جنھوں نے انگریزوں سے مل کر مسلمانوں کی ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں مخبریاں کیں اور ان کو پھانسی چڑھوایا، یہ قوم بڑی احسان فراموش ہے، یہ انگریزوں سے زیادہ مسلمانوں اور اسلام کے دُشمن ہیں۔ (الافاضات الیومیہ ج:۴)

بہرحال حضرت حکیم الأمت تھانویؒ نے ہندوؤں کی بددیانتی، احسان فراموشی، اسلام دُشمنی کے متعلق جتنے اندیشے ظاہر فرمائے تھے وہ سب اس کانگریسی دور میں صحیح ثابت ہوئے، جو ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت ۱۹۳۷ء کے انتخابات جیتنے کے بعد کانگریس کو چھ صوبوں میں اپنی اکثریت کی بناء پر نصیب ہوا تھا۔ اپنے اس دو سالہ دورِ اقتدار میں ہندوؤں نے مسلمانوں کی تہذیب و تمدن، ثقافت و مذہب کو مٹانے اور تباہ کرنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی تھی، اس لئے آپؒ گاندھی کو عیار، دجال، شیطان اور طاغوت کے الفاظ سے یاد کرتے تھے، اور جمہوریت کو مغربی بدعت کہتے تھے۔

غرض آپؒ نے ہندو کانگریس کی ڈٹ کر مخالفت کی، اور مسلم لیگ کی تائید و حمایت کی، اور مسلم لیگ کی حمایت بھی کسی سیاسی غرض کے لئے نہ کی تھی، بلکہ اس غرض کے لئے کی تھی کہ مسلمان لیگ کے اندر داخل ہوکر اپنی تنظیم اور لیگ کی اصلاح کی فکر

کریں تا کہ یہ کانگریس کا مقابلہ کر سکے، چنانچہ اسی غرض کے لئے آپؒ کے ایماء پر آپؒ کے خلفاء و متعلقین نے مجلس دعوۃ الحق قائم کی۔

(''معمارانِ پاکستان'' مؤلفہ منشی عبدالرحمٰن خان صاحب)

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مرحوم کا سیاسی نظریہ اور سیاسی مسلک وہی تھا جو ان کے شیخ و مربی حضرت حکیم الأمت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا تھا، حضرت حکیم الاسلامؒ بھی متحدہ قومیت کے سخت مخالف تھے اور دو قومی نظریے کی تائید وحمایت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، آپؒ کے دورِ اہتمام میں دارالعلوم دیوبند پر بعض شخصیتوں کی وجہ سے کانگریس کا اثر تھا، لیکن آپؒ چونکہ حضرت حکیم الأمتؒ کے حلقۂ ارادات سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے خلفائے مجاز کی صف میں ایک ممتاز مقام رکھتے تھے، اس لئے اس طبقے کا کبھی ساتھ نہ دیا جو متحدہ قومیت کے فریب میں آ گیا تھا، بلکہ آپؒ نے اپنے بزرگوں یعنی حضرت نانوتویؒ، حضرت گنگوہیؒ، حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت حکیم الأمت تھانویؒ کی طرح ملتِ اسلامیہ کی صحیح رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔ حضرت حکیم الاسلامؒ کا شمار برِصغیر کے ان ممتاز علمائے دیوبند میں ہوتا ہے جنھوں نے متحدہ قومیت کے طلسم کو توڑنے کے لئے اپنی زبان و قلم دونوں سے کام لیا اور مسلمانوں کے علیحدہ وطن کے لئے راہ ہموار کی، یہی وجہ ہے کہ حضرت مرحوم پاکستان کی تحریک کے اُبھرتے ہی اس کے ساتھ ہوگئے، اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند کی زیرِ قیادت جمعیت علمائے اسلام کے ساتھ مل کر قیامِ پاکستان کے مطالبے کو قبولِ عام بنانے کے لئے کام کرتے رہے، اور اپنے شیخ حضرت تھانویؒ کی ہدایات کے مطابق مجلس دعوت الحق کے ذریعہ قائدِ اعظم اور دُوسرے مسلم لیگی زعماء کی اصلاح و فلاح کے لئے ہر ممکن کوشش فرماتے رہے۔ اس سلسلے میں حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب مدظلہٗ فرماتے ہیں کہ:-

اکابرِ دیوبند نے نئے نئے پیش آمدہ حالات میں ملت کی ہر قدم

پر راہ نمائی کی ہے، جس طرح فروعی مسائل میں ہر دور میں نظریاتی اختلاف پایا گیا ہے، برِصغیر میں بھی یہ نظریاتی اختلاف پیدا ہوا اور دیوبند کا ایک وقیع گروہ کانگریس کے ساتھ اتحاد و اشتراک کو ملک وملت کے لئے مفید خیال کرتا تھا، تو دُوسرا وقیع گروہ مسلمانوں کو علیحدہ سیاسی تنظیم اور کانگریس سے عدمِ اشتراک واتحاد کا مؤید تھا، پہلے گروہ کے قائد حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ اور دُوسرے کے حکیم الاُمت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ تھے، اور دونوں گروہوں کا یہ اختلاف مبنی پر دیانت تھا، اور ہر ایک کے پاس اپنے موقف کے لئے دلائل تھے۔ یہ کہنا تاریخی حقائق کا منہ چڑانا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے تمام خدام یا متعلقین کانگریس کے مؤید تھے، دارالعلوم دیوبند کے سرپرست حکیم الاُمت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے کانگریس کے خلاف مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی تنظیم کی علی الاعلان حمایت کی اور مسلم لیگ کو مسلمانوں کے لئے بہتر قرار دیا۔

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے پاکستان کی نہ صرف حمایت کی بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ قائدِاعظم کے بعد تصوّرِ پاکستان کے خاکے میں رنگ بھرنے کا سب سے مؤثر عمل حضرت علامہ عثمانیؒ ہی کا تھا تو بے جا نہ ہوگا۔ آپؒ نے قراردادِ پاکستان کے حق میں بیان جاری فرمائے، جمعیت علمائے اسلام کی بنیاد رکھی، مضامین لکھے، پُرزور تقاریر کیں، پیرانہ سالی میں ہمت کو جوان کرکے قائدِ اعظم کا پورا پورا ساتھ دیا، یہاں تک کہ ہندوستان کی فضائیں پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونج اُٹھیں، مولانا ابوالکلام آزادؒ

کی سحر آفریں خطابت کا جواب مسلم لیگ کے پاس شیخ اسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی وجد آفریں زبان تھی، اور سابق مشرقی پاکستان کا علاقہ سلہٹ اور صوبہ سرحد کا ریفرنڈم حضرت شیخ الاسلام نے جیتا تھا، حضرت حکیم الأمتؒ اور حضرت شیخ الاسلام علامہ عثمانیؒ پاکستان کی حمایت نہ کرتے اور حضرت علامہؒ ان علاقوں کے ریفرنڈم کے لئے جدوجہد نہ کرتے تو آج یہ علاقے بھی ہندوستان کے پاس ہوتے۔ صوبہ سرحد اور سلہٹ کی شمولیت محدثِ دیوبند کا پاکستان پر احسانِ عظیم ہے۔ حلقۂ دیوبند سے حضرت علامہ عثمانیؒ، ہی پاکستان کی حمایت میں نہیں نکلے، حضرت مولانا ظفراحمد عثانی تھانویؒ، مفتیٔ اعظم مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندیؒ، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مفتی محمد حسن امرتسریؒ، حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ اور حکیم الأمت تھانویؒ کے دُوسرے سب خلفاء پاکستان کے حامی تھے، دارالعلوم دیوبند کے چار بڑے عہدہ داروں سرپرست، صدر مہتمم، صدر مدرّس اور مہتمم میں سے تین مسلم لیگ کے ہم خیال تھے، سرپرست حکیم الأمت حضرت تھانویؒ تھے، صدر شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ تھے اور مہتمم حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب تھے، ان میں صدر مدرّس مولانا حسین مدنیؒ کانگریس میں تھے اور باقی سب مسلم لیگی تھے۔ (''بیس بڑے مسلمان'' پیش لفظ ص:۱۲۶)

محترم جناب مولانا عبدالرشید صاحب ارشد فرماتے ہیں کہ:-

پاکستان کی مخالفت میں جو لوگ علمائے دیوبند کا نام لیتے ہیں ان

لوگوں کو یہ کیوں یاد نہیں رہتا کہ پاکستان بنانے میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ، حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، حضرت مفتی محمد حسن امرتسریؒ، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اور حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ اور حکیم الأمت حضرت تھانویؒ کے تقریباً سبھی خلفاء قائدانہ حیثیت رکھتے تھے، بلکہ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ پاکستان کی حمایت نہ کرتے تو شاید پاکستان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہی نہ ہوتا، اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے بانئ پاکستان کی نمازِ جنازہ پڑھائی، کراچی میں پرچم کشائی علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے اور ڈھاکہ میں مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے کی۔ (بحوالہ ماہنامہ ''الرشید'' دارالعلوم دیوبند نمبر)

مولانا ارشد صاحب ''تاریخِ دارالعلوم دیوبند'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ:-

تحریکِ دیوبند میں علمائے دیوبند کا کردار اپنی جگہ ہے، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ اور مولانا خیر محمد جالندھریؒ نے جو کام کیا وہ تاریخ کے صفحات پر رقم ہو چکا ہے۔

۲۸/مارچ ۱۹۷۶ء کو جامعہ اشرفیہ لاہور میں ادارہ ''الرشید'' کی طرف سے ایک تقریب ماہنامہ ''الرشید'' دارالعلوم دیوبند نمبر کے افتتاح کے لئے منعقد کی گئی تھی، اس تقریب میں حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ کی خدمت میں جناب مولانا عبدالرشید ارشد صاحب نے جو سپاسنامہ پیش کیا اس کے چند جملے ملاحظہ فرمایئے جو حضرت حکیم الاسلامؒ کی تحریکِ پاکستان میں خدمات انجام دینے کی ایک مختصر جامع تحریر ہے، ارشد صاحب سپاسنامے میں فرماتے ہیں کہ:-

معزز مہمان! آپ کے شیخ اور سرپرست دارالعلوم دیوبند حضرت

حکیم الاُمت مولانا اشرف علی تھانویؒ، آپ کے اُستاذِ مکرم شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند، آپ کے رفیقِ خاص اور دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی حضرت مولانا محمد شفیع صاحبؒ اور حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اور آپ نے مسلم لیگ اور تحریکِ پاکستان کا قائدانہ ساتھ دیا جس سے پاکستان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا، ورنہ شاید پاکستان کا قیام عمل میں نہ آتا۔

(مأخوذ ''ذکرِ طیب'' بحوالہ ماہنامہ ''الرشید'' ساہیوال)

مسلم لیگ کے حق میں فتویٰ

تاریخِ پاکستان میں نازک ترین دور وہ تھا جب پاکستان کے نام پر لڑے جانے والے الیکشن بالکل قریب آگئے تھے، اور کانگریس اس الیکشن میں مسلم لیگ کو ناکام کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھی، اس وقت حالات کتنے پریشان کن تھے، ان کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے بآسانی لگایا جاسکتا ہے جو خواجہ آشکار حسین صاحب کے اس مقالے سے نقل کیا جاتا ہے جو انہوں نے نواب زادہ لیاقت علی خان کی برسی پر رسالہ ''نقاد'' میں شائع کرایا تھا اور جسے بعد میں اخبار ''پیام'' مؤرخہ ۱۹/اکتوبر ۱۹۵۵ء نے نقل کیا، خواجہ صاحب لکھتے ہیں:-

> پاکستان کے نام پر لڑے جانے والے الیکشن میں سب سے زیادہ مقابلہ خود لیاقت علی خان کے حلقے میں تھا، مقابل اُمیدوار محمد احمد کاظمی تھے، کانگریس کی جانی و مالی امداد انہیں حاصل تھی، روپیہ پانی کی طرح بہایا جارہا تھا، مزید برآں یہ علاقہ مولوی زادہ اور پیرزادہ سے بھرپور تھا، اور ان کی اکثریت مسٹر کاظمی کے ساتھ تھی لیکن مقابلے میں لیگ کی انتخابی مشنری کا کوئی پرزہ بھی دُرست

نہ تھا۔ لیاقت علی خان دہلی سے باہر نہ نکل سکتے تھے، انہیں پورے ملک کے انتخابات کی فکر تھی، اپنے حلقے کا کیسے خیال ہوتا؟ جب حالات بدتر ہونے لگے تو انہیں سنبھالنے کے لئے علی گڑھ سے طلباء کی یلغار کی گئی، مجھے بھی پروفیسر حلیم نے ایک وفد کے ساتھ روانہ کیا، خورجہ بلند شہر، ہاپوڑ پہنچ کر معلوم ہوا کہ حالات کا کہیں نام و نشان نہیں، آخر مظفر نگر پہنچ کر ہدایات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا، وہاں بھی یہی بدحالی تھی۔ لیاقت علی خان کے منیجر سردار اکرم خان، ان کے صاحبزادے امیر اعظم خان اور طلباء علی گڑھ کے سربراہ پروفیسر عمر سب دم بخود تھے، فیصلہ ہوا کہ پروفیسر دہلی جا کر لیاقت علی خان کو لائیں۔ اور دُوسری طرف کسی نہ کسی طرح حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ اپنی موافقت کا حاصل کیا جائے، کیونکہ تنہا علامہ عثمانیؒ کی تائید اس حلقے میں خصوصاً مظفر نگر اور سہارنپور میں ناکافی تھی۔ دیوبند جاتے ہوئے سب کو ڈر لگتا تھا، قرعہ فال میرے نام پر پڑا، میں وہاں پہنچا، دو دن کی رد و قدح کے بعد میں نے فتویٰ حاصل کیا اور اسے اخبارات کو بھیج کر اور ضروریات کے مطابق پوسٹر چھپوا کر ہم سہارنپور پہنچے، وہاں حامیانِ لیگ نے کہا کہ یہاں مفتی محمد شفیع صاحب کا بھی فتویٰ ضروری ہے، اس کے بغیر بھی کام نہ چلے گا۔ میں نے دیوبند جا کر مفتی صاحب کا بھی فتویٰ حاصل کیا، اور سہارنپور پہنچ کر اس کی طباعت کے انتظامات کرائے۔

۲۷ر نومبر ۱۹۴۵ء کو پولنگ ہونے والی تھی، ۲۴ر نومبر کو لیاقت علی خان سہارنپور پہنچے، میں فوراً ڈاک بنگلے پہنچا، لیاقت علی خان نے

مصافحہ کیا اور بغل گیر ہوئے، اور پھر سب سے پہلے انہوں نے مولانا قاری محمد طیب صاحب والے فتویٰ کی مبارک باد دی، میں نے فوراً مفتی محمد شفیع صاحب کا فتویٰ بھی پیش کردیا جسے دیکھ کر وہ اُچھل پڑے۔''

اس اقتباس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مسلم لیگ کے لئے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب اور حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کے تائیدی فتووں اور ان علمائے ربانی کی تائید وحمایت حاصل کئے بغیر یہ تاریخی الیکشن جیتنے قریباً قریباً ناممکن تھے، ان اکابر علماء کے فتووں اور مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کے دوروں نے رائے عامہ کو مسلم لیگ کی تائید پر مجبور کردیا، اور نواب زادہ لیاقت علی خان اپنے بے غرض اور مخلص دوستوں، ہمدردوں اور علمائے کرام کی مساعیٔ جمیلہ سے تین ہزار ووٹوں کی اکثریت سے کانگریس کے نمائندے کے مقابلے میں جیت گئے۔ یہ کانگریس کی حامی جمعیت علمائے ہند کے مقابلے میں جمعیت علمائے اسلام کی پہلی شاندار کامیابی تھی، جو انہی دنوں تحریکِ پاکستان کے حامی علماء پر مشتمل علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی زیرِ قیادت مسلم لیگ کی تائید وحمایت کے لئے قائم کی گئی تھی، اگر جمعیت علمائے اسلام کے یہ اکابر علماء ہر محاذ پر مسلم لیگ کے شانہ بشانہ کام نہ کرتے تو یہ الیکشن جیتنا آسان کام نہ تھا۔ چنانچہ لیاقت علی خان نے اس عظیم الشان کامیابی پر ان حضرات علمائے کرام کو مبارک بادی کے تار بھیجے، اور بعد میں مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نائب صدر جمعیت علمائے اسلام کے نام ایک مفصل خط شکریہ کے طور پر لکھا، جس میں کھلے الفاظ میں ان علمائے ربانی کی خدمات کا اعتراف کیا ہے، آپ نے خط میں لکھا ہے کہ:-

اس کامیابی پر میں آپ حضرات کو مبارک باد پیش کرتا ہوں، خصوصاً ان حلقۂ انتخاب میں جہاں سے ہماری لیگ نے مجھے کھڑا کیا تھا، آپ حضرات علماء کی تحریروں اور تقریروں نے باطل کے

اثرات بہت بڑی حد تک ختم کر دیئے۔ قائدِ ملت لیاقت علی خان کا یہ خراجِ تحسین ان اَربابِ غرض کے لئے جو آج پاکستان سے علمائے کرام کا اثر و رُسوخ مٹانے کے درپے ہیں، سرمۂ بصیرت اور تازیانۂ عبرت کی حیثیت رکھتا ہے۔

(مأخوذ از ''تعمیرِ پاکستان اور علمائے ربانی)

محترم بزرگ مؤرّخ جناب منشی عبدالرحمٰن خان صاحب مدظلہٗ اس سلسلے میں اپنی تألیف ''معمارانِ پاکستان'' میں لکھتے ہیں کہ:-

پاکستان کے نام پر جو پہلا الیکشن نومبر ۱۹۴۵ء میں لڑا گیا تھا، اگر اس الیکشن کے لئے مولانا ظفر احمد عثمانیؒ خود باہر نہ نکلتے اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا قاری محمد طیب اور مولانا مفتی محمد شفیعؒ جو لیاقت علی خان کے حلقۂ انتخاب سہارنپور، دیوبند، مظفر نگر، بلند شہر اور ڈیرہ دون وغیرہ کے بے تاج بادشاہ کی حیثیت رکھتے تھے، لیاقت علی خان کی پشت پناہی نہ کرتے تو کانگریس مسلم لیگ کو برلوں، ٹاٹاؤں کے روپوں اور دُوسری مسلم جماعتوں کے تعاون سے شکستِ فاش دینے میں کامیاب ہوجاتی۔ ان حضرات کے فتووں اور تقریروں سے نواب زادہ لیاقت علی خان تین ہزار ووٹوں کی اکثریت سے یہ الیکشن جیت گئے، اور مسلم لیگ کو بے نظیر اور جمعیت علمائے اسلام کو پہلی تاریخی فتح نصیب ہوئی جس پر سب سے پہلے نواب زادہ لیاقت علی خان نے ان حضرات کو مبارک بادی کا تار دیا اور پھر مفصل خط حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کے نام ارسال کیا، جس میں اُن حضرات کی مجاہدانہ سرگرمیوں اور خدماتِ جلیلہ کا کھلا اعتراف کیا ہے۔

بہر حال ان حضرات کے لئے یہ حقائق سرمۂ بصیرت کی حیثیت رکھتے ہیں جنھوں نے اپنی تحریروں میں علمائے ربانی کے اظہر من الشّمس کارناموں پر ڈھول ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

(معمارانِ پاکستان ص:۴۳۲)

حضرت مولانا سیّد عبدالقادر آزاد صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

برِصغیر میں مسلمانوں نے جب اپنے حقوق کے حصول کے لئے جدوجہد کا آغاز کیا اور قائدِ اعظم مرحوم کی قیادت میں مسلم لیگ نے مسلمانوں کی قیادت کا بیڑہ اُٹھایا تو اس وقت جن علمائے کرام نے مسلمانوں کی اس نمائندہ جماعت کا ساتھ دیا اور اپنی خدمات ان کے سپرد کیں، ان میں دارالعلوم دیوبند کے سرپرست حکیم الأمت مولانا اشرف علی تھانویؒ، صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، صدر مفتی دارالعلوم دیوبند مفتیٔ اعظم مولانا محمد شفیع دیوبندیؒ، دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ اور حکیم الأمت حضرت تھانویؒ کے دُوسرے تمام خلفاء و مجازین شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، حضرت مفتی محمد حسن امرتسریؒ اور حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ اور دیگر اکابرِ دیوبند کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، ان علمائے دیوبند نے مسلم لیگ کی تائید و حمایت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اور پاکستان کے پُرجوش حامی رہے، اور کانگریس کی ڈَٹ کر مخالفت کی، پاکستان کا وجود انہی حضرات کا مرہونِ منّت ہے، اگر یہ حضرات پاکستان کے قیام کے لئے جدوجہد نہ کرتے تو پاکستان کا قیام بہت مشکل تھا۔ (ذکرِ طیب ص:۲۷۴)

آزادیٔ ہند کے موقع پر حکیم الاسلامؒ کا خطاب

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں علمائے کرام کو جو مقام حاصل رہا ہے اس میں کوئی مقابل جماعت ان کی حریف نہیں کہی جاسکتی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ خیز انقلاب کے بعد صرف یہی ایک جماعت تھی جس نے آزادی کے تصوّر کو ملک میں زندہ رکھا، اس کی مسلسل جدوجہد نے بالآخر پورے ملک میں آزادی کی رُوح پھونک دی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اس تصوّر کے سب سے بڑے داعی اور اس تحریک کے سب سے بڑے مبلغ تھے، انہوں نے جس سرگرمی کے ساتھ اس تصوّر کو پروان چڑھایا افسوس ہے کہ جنگِ آزادی کی تاریخ لکھنے والوں نے اس بارے میں انصاف سے کام نہیں لیا ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے موقع پر حضرت نانوتویؒ کی تیار کی ہوئی جماعت کو جس قدر مسرّت ہونی چاہئے تھی اس کا اندازہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کی اس تقریر سے ہوسکتا ہے جو حضرت ممدوح نے جشنِ آزادی کے موقع پر ۱۵-۱۶/اگست ۱۹۴۷ء کی درمیانی شب میں طلبائے دارالعلوم اور اہلِ شہر کے مجمع میں فرمائی تھی، چونکہ اس تقریر سے آزادی کی جدوجہد میں علمائے دیوبند کی خدمات کی تاریخ پر فی الجملہ روشنی پڑتی ہے، اس لئے تقریر کا بجنسہٖ پیش کردینا مناسب ہوگا، حضرت حکیم الاسلامؒ نے فرمایا:-

بزرگانِ ملت، علمائے کرام اور عزیز طلبائے دارالعلوم!

آج کا مبارک دن ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا، ایک عظیم الشان سلطنت جس کے متعلق مسلّم تھا کہ اس میں کسی وقت آفتاب غروب نہیں ہوتا اور جس کے بارے میں خود اسی سلطنت کے ایک مغرور اور متکبر نمائندے گلیڈاسٹون نے پارلیمنٹ

میں کہا تھا کہ ہماری سلطنت آج اس قدر طاقت ور ہے کہ اگر آسمان بھی اس پر گرنا چاہے تو ہم اسے بھی اپنی سنگینوں کی نوک پر روک لیں گے، اور وہ ہماری سلطنت کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔ وہی سلطنت آسمان کے گرنے سے نہیں محض زمین کے چند ذرّوں کے اُڑنے سے اس سہولت سے ختم ہو رہی ہے کہ تاریخ اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی، ہم اس انقلاب پر پورے ملک کو مبارک باد دیتے ہیں، پورا ملک عموماً اور خصوصیت سے وہ جوان اور بوڑھے اس مبارک باد کے مستحق ہیں جن کی قربانیوں اور مساعی نے یہ شیریں ثمر ہندوستان کے سامنے لا رکھا۔

ناسپاسی ہوگی اگر اس موقع پر ہم ان اکابرِ ملت کی مساعی کا تذکرہ نہ کریں جنھوں نے حقیقتاً اس آزادی کا سنگِ بنیاد رکھا اور اس وقت رکھا جب آزادی کے تصوّر سے بھی اس ملک کے دِل و دِماغ خالی تھے، یہ شاہ ولی اللہؒ کے جانباز شاگردوں کی مجاہد جماعت ہے جو دو سو برس سے اس سعی میں نہ صرف قلم اور روشنائی سے بلکہ شمشیر اور خون سے اس کی راہ نوردی کر رہی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب انگریزی اقتدار مکمل ہوکر پوری طرح اس ملک پر چھا گیا تو صرف یہی ایک جماعت تھی جس نے آزادی کے تصوّر کو اس ملک میں زندہ رکھا اور بالآخر اس تصوّر کا سب کو دیوانہ بنا کر چھوڑا۔ ۱۸۵۷ء میں بانئ دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بقول حضرت مولانا گنگوہیؒ، اس تصوّر کے سب سے بڑے حامل اور اس جوش کے سب سے بڑے امین تھے۔ انہوں نے اپنے شیخ حضرت حاجی امداداللہ تھانوی مہاجرِ مکیؒ

کی قیادت میں تلوار اُٹھائی اور آزادی کی راہ میں سرفروشی کے ساتھ میدان میں اُترے، لیکن راہ کی مشکلات کے باعث فتح کا سلسلہ شاملی کی تحصیل تک رہ گیا اور دہلی کے تخت تک نہ پہنچ سکا، اور ملک آزادی سے محروم رہ گیا، لیکن یہ جماعت اپنے تصوّر سے غافل نہ ہوئی۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اس دُنیا سے گئے تو ان کے صحیح اور سچے جانشین حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ نے جوان کے علم اور نظریات کے جائز وارث تھے، اس پوری جماعت کے ساتھ تحریکِ آزادی کو جاری رکھا، مدینہ کے گورنر جمال پاشا کے قول کے مطابق ''شیخ الہند کی مٹھی بھر ہڈیوں اور مختصر سے جسے میں کیا کرامت رکھی ہوئی تھی کہ اس نے پوری دُنیائے اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔''

بہرحال ان بزرگوں کا جذبہ انگریزوں کے اقتدار کے خلاف نہ جاہ ومنصب کے لئے تھا، نہ وزارت کی کرسیوں کے لئے تھا، نہ کسی ایک پارٹی کے اقتدار کے لئے تھا بلکہ صرف اس لئے تھا کہ جابر قوم کی گرفت سے مظلوم ملک کو نکالا جائے اور حق بحقدار کے طور پر جس کی امانت ہو اسے سپرد کردیا جائے، جس سے حق کا کلمہ بلند ہو۔ ان بزرگوں کا سب سے بڑا مشغلہ ذِکر وفکر ہر وقت رہتا تھا کہ انگریزوں کا جوا کس طرح کندھوں سے اُتارا جائے، اسی کے بارے میں پیشین گوئیاں اور مکاشفات تھے اور اسی کے بارے میں عام نظم اور انتظام، ایک دن چھتے کی مسجد میں سب بزرگ جمع تھے، انگریزوں کے تسلط اور غیرمعمولی طاقت کو دیکھ کر حضرت حاجی سیّد محمد عابد صاحبؒ نے فرمایا کہ:-

''انگریزوں نے گہرے پنجے جمائے ہیں، دیکھئے کس طرح اُکھڑیں گے۔''

اس پر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ نے جو دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے شیخ الحدیث تھے فرمایا:-

''حاجی صاحب! آپ کس خیال میں ہیں، وہ وقت دُور نہیں جبکہ ہندوستان صف کی طرف لوٹ جائے گا، کوئی جنگ نہ ہوگی بلکہ بحالتِ امن وسکون یہ ملک صف کی طرح پلٹ جائے گا، رات کو سوئیں گے ان کی عملداری میں اور صبح کریں گے دُوسری عملداری میں۔''

میں آج کے جانبازوں کی ناقدری نہیں کرتا، لیکن اس سے کسی حالت میں بھی ہٹ نہیں سکتا کہ آج آزادی کی تمام مساعی ایک عمارت ہے جس کی بنیاد یہ بزرگ رکھ گئے تھے، اور اس لئے میں بابانگِ دہل کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کی آزادی کی یہ جدوجہد صرف مسلمانوں نے شروع کی اور انہوں نے ہی اسے پروان چڑھایا، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے انگریزوں کے خلاف فتویٰ دیا، ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا، حضرت حاجی امداداللہؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اس فتویٰ کو استعمال کیا اور اس نسخۂ شفا کو خاص ترکیب سے پیا اور پلایا، حضرت شیخ الہندؒ نے اسی نسخے کو معجونِ مرکب کی صورت میں کیا اور اس قابل کردیا کہ ہر کس و ناکس اسے استعمال کرسکے، چنانچہ وہ استعمال شروع ہوکر عام ہوگیا، تحریکِ خلافت میں بھی نسخہ گو تلخ تھا مگر سب نے استعمال کیا اور بہرحال عام استعمال شروع ہوکر آزادی کا جذبہ مسلمانوں

سے گزر کر ابنائے وطن تک پہنچا، وہ بھی سرگرم ہو گئے تھے، مگر آج دراصل مسلمانوں کی انتھک مساعی اور قربانیوں کا ثمرۂ شیریں ملک کی آزادی کی شکل میں ہمارے سامنے ہے، جس پر ہم تمام مسلمانوں کو مبارک باد دیتے ہیں اور ان بزرگانِ مرحومین کے لئے دُعائے خیر کرتے رہیں جن کی تخم ریزی سے یہ درخت تناور ہوا، اور آج اس کا پھل سب کھا رہے ہیں۔ ہندوستان کی آزادی تمام دُنیائے اسلام کی آزادی ہے، اس لئے ہماری مبارک باد کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہے، ہماری مباک باد کی مستحق ہندوستان و پاکستان دونوں سلطنتیں ہیں، ہم پاکستان کو مسلمان ہونے کی حیثیت سے اور ہندوستان کو وطن ہونے کی حیثیت سے مبارک باد دیتے ہیں۔ میں اس تصوّر کو بھی ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہندوستان میں اب مسلمان ایک معمولی اقلیت میں رہ گئے ہیں اور آج کی آزادی میں جہاں ان کے لئے یہ انتہائی خوشی کا مقام ہے کہ انگریز کا دو سو سالہ اقتدار ختم ہو گیا جس کے لئے وہ بے چین تھے، وہیں اس فکر کا موقع بھی ہے کہ اب ان کی حیاتِ اجتماعی کی اس ملک میں کیا صورت ہوگی؟ اس کے لئے انہیں بھی قدم اُٹھانا چاہئے، شریعتِ مقدسہ کی روشنی میں صرف ایک ہی صورت ہے کہ وہ اپنے شرعی نظام کو قائم کرنے کے لئے اپنے میں سے کسی امام اور متدین امیر کا انتخاب کریں، ہندوستان کی مسلم جماعتیں منتشر رہنے کی بجائے متحد ہوں، ایک ہو جائیں اور اسلام کے کلمے پر ایک ہوں، ایک امیر کے ماتحت شرعی زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کریں، اسی ایک جملے میں ان کی

حیاتِ اجتماعی کی لمبی چوڑی تفسیر پنہاں ہے، ان کے لئے سب سے مقدّم یہ ہے کہ ماضی کے واقعات فراموش کردیئے جائیں، ہم طعن وطنز کا سلسلہ ترک کریں، ایک دُوسرے پر الزام رکھنے کی فکر نہ کریں بلکہ صرف مستقبل کو سامنے رکھ کر اس پر غور کریں کہ متحد ہونے کے لئے اُخوّت ومساوات کی کیا تدابیر ہوسکتی ہیں، جن کو وہ آج عمل میں لاسکتے ہیں۔ میرے خیال میں پہلے سے زیادہ اب اس کے امکانات ہیں کہ ہم متحد ہوسکیں، وہ پارٹیاں جن پر آویزشوں کی بنیادیں ہیں اس انقلاب سے منقلب ہوچکی ہیں اور حقیقتاً ہندوستان کے بدلنے سے وہ بھی بدل گئی ہیں، اس لئے اب بجائے اس کے ہم نئی پارٹیوں کی بنیادیں رکھ کر اختلافات کی تخم ریزی کریں، یہ مناسب بلکہ ضروری ہے کہ وحدتِ جماعت کا سنگِ بنیاد رکھ کر ان تمام مسائل کو حل کریں جو نئے ہندوستان میں پیدا ہوگئے ہیں۔

(رسالہ ''دارالعلوم'' بابت ماہ ذی قعدہ ۱۳۶۶ھ مطابق اکتوبر ۱۹۴۷ء)

اس موقع پر دارالعلوم دیوبند کی جانب سے حسبِ ذیل اعلان بھی شائع کیا گیا:-

دارالعلوم دیوبند مسلمانوں کی ایک مذہبی درس گاہ اور ایک عظیم الشان علمی ادارہ ہے، جس نے ملکی سیاسیات کے ہنگاموں میں بھی اپنی تعلیم اور تعلیمی کاموں کی ہمیشہ حفاظت کی ہے، اور تعلیمی سلسلوں میں کسی وقتی تحریک سے مغلوب ہوکر کبھی خلل نہیں پڑنے دیا، لیکن اس کے باوجود اس نے برطانوی غلبہ واقتدار کی مخالفت کی حد تک کبھی اپنی قوم اور قومی تحریکات سے بیگانگی نہیں برتی، بلکہ ذمہ دارانہ طریق پر اس قسم کے قومی معاملات میں

مناسب حصہ لیا۔ ہندوستان کی وطنی آزادی کا واقعہ اور برطانوی سامراج کے استیلاء و تسلط سے اس کی نجات کا پہلا قدم کوئی ایسی چیز نہیں کہ دارالعلوم سے الگ رہ سکے، دارالعلوم وطن کی آزادی پر نہ صرف مسرور ہی ہے بلکہ اسے مستقبل کی حقیقی آزادی کے لئے فالِ نیک تصوّر کر رہا ہے اور آئندہ کی بہت سی مسرتوں کا پیش خیمہ بھی۔ اس لئے ہندوستان کے اس ابتدائی آزادی کے واقعے اور انتہائی آزادی کی پوری توقع پر اظہارِ مسرّت کرنے کے لئے طے کیا ہے کہ ۱۵/اگست کو عام تعطیل منائی جائے، چنانچہ تعطیل کے ذریعے ملک کی اس عام مسرّت میں دارالعلوم شریک ہے۔ ہندوستان دوسو سالہ دورِ غلامی کے بعد آج آزادی کی پہلی قسط حاصل کر رہا ہے، ہم ان تمام دوست افراد کو جنھوں نے ملک کی آزادی کی خاطر قربانیاں دی ہیں مبارک باد دیتے ہیں، کہ حق تعالیٰ نے ان کی مساعی کو قبول فرما کر آزادی کی دولت سے بہرہ ور فرمایا۔

ہمیں اُمید ہے کہ ملک کے یہ جاں باز اس وقت تک برابر جدوجہد کو جاری رکھیں گے جب تک کہ ہندوستان مکمل آزادی حاصل نہ کرلے، اور انہیں آزادی کے ساتھ اپنے تمام شعائرِ ملیّ کو بلند کرنے کا موقع حاصل نہ ہوجائے۔

(مأخوذ از ''تاریخِ دارالعلوم دیوبند'' ص:۱۱۰ تا ۱۱۲)

دستوری مسائل میں حکومتِ پاکستان کی رہنمائی

حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ کے لئے پاکستان

کوئی اجنبی اور نیا ملک نہیں تھا، انہوں نے تو اس کے لئے قربانیاں دی ہیں، اور وہ اپنے شیخ و مربی حضرت حکیم الأمت مولانا تھانویؒ، اپنے اُستاذِ مکرّم علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور ہم عصر علمائے کرام حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ، حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، حضرت مفتی محمد حسن صاحب امرتسریؒ، حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ، حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ، حضرت مولانا شبیر علی تھانویؒ اور حضرت مولانا اطہر علی سلہٹیؒ اور دیگر علماء کی طرح قیامِ پاکستان کے لئے کوشاں رہے، تحریکِ پاکستان میں بڑی سرگرمی سے عملی حصہ لیا، پاکستان کے حق میں فتویٰ دیا، کانگریس کی ڈٹ کر مخالفت کی اور دو قومی نظریے کی بھرپور تائید و حمایت کی، قیامِ پاکستان کے بعد آپؒ ہجرت کر کے پاکستان ہی میں مستقل قیام کے آرزومند تھے مگر دارالعلوم دیوبند جیسی عظیم علمی درس گاہ جو ان کے آباء واجداد کی ایک عظیم یادگار تھی اس کی خدمت کے لئے مجبوراً دیوبند ہی میں مقیم رہے، لیکن آپؒ کے بہت سے عزیز و اقارب پاکستان ہی میں موجود ہیں، یہ ان کا اپنا وطن اور اپنا گھر تھا، وہ یہاں متعدّد بار تشریف لائے، خاص طور پر اپنے رفیقِ خاص مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے ہاں دارالعلوم کراچی، حضرتِ اقدس مفتی محمد حسن صاحبؒ کے مدرسہ جامعہ اشرفیہ لاہور، اور حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ کے مدرسہ خیرالمدارس ملتان کے سالانہ جلسوں میں اکثر شرکت فرماتے رہتے تھے۔ یہاں ان کے ہزاروں تلامذہ و مریدین موجود ہیں، اور ان مذکورہ بالا حضرات علمائے کرام سے آپؒ کے بڑے گہرے روابط تھے۔ یہ سب حضرات آپؒ کے ہم مسلک و ہم مشرب تھے، ایک ہی شیخ حضرت تھانویؒ کے سب فیض یافتہ تھے، قیامِ پاکستان کے بعد یہ حضرات یہاں اسلامی نظام کی جدوجہد میں مصروف ہو گئے، اور اس سرزمینِ پاکستان پر اسلام کی حکمرانی قائم کرنے کے لئے ان حضرات علماء نے ناقابلِ فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ ''قراردادِ مقاصد'' کی منظوری اور ۲۲ نکات پر ہر مکتبِ فکر کے علماء کا اتفاق کرانا انہی علمائے کرام کے وہ قابلِ قدر کارنامے ہیں جن

پر جتنا فخر کیا جائے کم ہے۔ اسلامی نظام کے بارے میں پاکستانی علماء نے جتنی بھی سعی وکاوش کی ہے خاص مسائل میں حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سے بھی بذریعہ خط وکتابت مشورہ ورائے لیتے رہتے تھے۔ ۱۹۵۶ء کا دستور بھی انہی علماء کی جدوجہد کا نتیجہ تھا، مگر یہاں کا مفاد پرست طبقہ اور لادینی نظریات رکھنے والے ہمیشہ اسلامی نظام کی راہ میں رُکاوٹ بنے رہے۔ اربابِ حکومت نے قائدِ اعظم اور لیاقت علی خان کے بعد اس طرف توجہ نہیں دی اور اسلامی نظام کے نفاذ میں ٹال مٹول سے کام لیتے رہے، اس سلسلے میں جناب منشی عبدالرحمٰن خان صاحب فرماتے ہیں کہ:-

> ابتداء میں میجر جنرل سکندر مرزا اسلامی آئین کے قائل نہ تھے اور اس سلسلے میں انہوں نے اخبار ''تنویر'' لکھنؤ کے نامہ نگار کو جو بیان دیا تھا اس پر ہندوستان میں پُرزور احتجاج کیا گیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ۱۹۵۵ء میں فخر العلماء حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند پاکستان تشریف لائے اور کراچی میں ایک عشائیے کی تقریب پر حسنِ اتفاق سے ان کی میجر جنرل سکندر مرزا سے ملاقات ہوگئی، میجر صاحب نے اسلامی آئین کے بارے میں چند اِشکالات حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب کے سامنے پیش کئے، تو انہوں نے ان کے اِشکالات کا ایسا کافی و مدلل اور مؤثر جواب دیا کہ میجر صاحب بے تابانہ کہہ اُٹھے کہ اگر واقعی اسلام کے بنیادی اُصول یہی ہیں تو ہم انہیں ہر قیمت پر منظور اور نافذ کرنے کے لئے تیار ہیں۔
>
> حضرت قاری صاحب نے فرمایا کہ قرآن کی رُو سے اسلامی دستور صرف ۱۷، ۱۸ دفعات پر مشتمل ہے، باقی سب بائی لاز یا رولز ہیں، جن کو لوگ غلط فہمی سے اسلامی آئین سمجھ رہے ہیں۔

اس پر میجر صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ وہ ہندوستان واپس جانے کا ارادہ منسوخ کر کے یہاں رہیں اور اسلامی آئین مرتب کرنے میں ہماری مدد اور رہنمائی کریں۔ مگر دارالعلوم دیوبند کی ذمہ داریوں کی وجہ سے حضرت قاری صاحب میجر جنرل سکندر مرزا کے اصرار کے باوجود یہاں ٹھہرنے پر آمادہ نہ ہوئے، اور فرمایا: یہاں اس سلسلے میں اعانت کے لئے دُوسرے حضراتِ علماء موجود ہیں۔ بہرحال فخر العلماء حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی ایک ہی ملاقات نے اس اہم مسئلے کے متعلق میجر صاحب کی تمام غلط فہمیاں دُور کردیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میجر صاحب جو پہلے اسلامی دستور کے قائل ہی نہ تھے، پھر اسلامی دستور جلد از جلد پاس کرانے میں بڑی دِلچسپی لیتے رہے اور بالآخر مؤرخہ ۱۲/مارچ ۱۹۵۶ء کو انھوں نے ایک شاندار اور پُروقار تقریب میں آئینی بل پر اپنے دستخط اور مہرِ تصدیق ثبت کرکے اسے قانونی شکل دے دی، اور میجر صاحب کی اس شاندار خدماتِ پاکستان کے اعتراف کے طور پر انہیں بلامقابلہ جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کا پہلا صدر منتخب کیا گیا۔

(تعمیرِ پاکستان اور علمائے ربانی ص:۲۷۷)

شرف وسعادت

اسلامی آئین کے سلسلے میں جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کے پہلے صدر میجر جنرل سکندر مرزا کی غلط فہمی دُور کرنے کی سعادت بھی دربارِ اشرفیہ کے ایک خادم اور حکیم الاُمت تھانویؒ کے خلیفۂ ارشد حضرت مولانا قاری محمد طیب کو ہی نصیب ہوئی، جو

اس بات کی دلیل ہے کہ مفکرِ پاکستان حضرت تھانویؒ کے فیض سے اب تک پاکستان اور اَربابِ پاکستان فیض یاب ہو رہے ہیں، اور جناب سکندر مرزا بھی مستحقِ تحسین ہیں کہ انہوں نے صحیح بات سمجھ میں آجانے کے بعد بلا تامل اپنا نظریہ بدل لیا، جو ان کی سلیم الفطری پر دال ہے۔ اسی لئے حضرت تھانویؒ فرمایا کرتے تھے کہ ''انگریزی خوانوں کی گفتگو میں مزہ آتا ہے، کیونکہ یہ سمجھ میں آنے سے بات مان لیتے ہیں۔''

(کمالاتِ اشرفیہ ص:۳۳۹)

فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید

فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید کا مسئلہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اس موضوع کے سلسلے میں چند بنیادی نکات پیش کردوں، جنھیں فکرِ جدید کی تعمیر اُٹھانے والے حضرات کو پیشِ نظر رکھنا میرے نزدیک اَزبس ضروری ہے۔

عالمِ بشریت میں مکرّر تفکر کی اہمیت

پہلے بطور تمہید کے یہ عرض کردینا ضروری ہے کہ عالمِ بشریت میں فکر و تفکر ایسی عظیم اُصولی بلکہ اصل الأصول قوّت ہے کہ انسان کی ساری معنوی قوتیں اسی کے نیچے آئی ہوئی ہیں اور سب اسی کی دستِ نگر ہیں جو بلافکر ایک قدم بھی کسی میدان میں آگے نہیں بڑھ سکتیں۔ حواسِ خمسہ ہوں یا عقل و دانش، ذوق و وجدان ہو یا بصیرت و تفقّہ، حدس و تجربہ ہو یا جوہرِ قیافہ ان سب کا قائد اور محرک فکر ہی ہے۔ پھر یہ فکر نہ صرف یہ کہ انسان کی تمام معنوی قوتوں کا سرچشمہ ہی ہے، بلکہ خود انسان کی ایک ایسی امتیازی خصوصیت بھی ہے جس سے اس کی انسانیت پہچانی جاتی ہے، کیونکہ یہ قوت انسان کے دُوسرے ابنائے جنس کو میسر نہیں، اس لئے اگر اس فکری قوت کو انسان کی ماہیت کا حقیقی معرّف کہہ دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

''انسان'' کی مشہور و معروف تعریف حیوانِ ناطق یا حیوانِ عاقل سے کی جاتی ہے، لیکن غور کیا جائے تو اس سے انسان کا کوئی امتیاز بخش تعارف نہیں ہوتا کہ اسے ''انسان'' کی حدتام یا جامع و مانع تعریف سمجھ لیا جائے، کیونکہ عقل کا تھوڑا بہت

جوہر غیرانسان حتیٰ کہ حیوانات میں بھی پایا جاتا ہے، ایک کتے کو بھی اگر ایک جگہ ٹکڑا ڈال دیا جائے تو اگلے دن وہ پھر اسی جگہ آموجود ہوگا، گویا وہ قیاس کرتا ہے کہ جب آج اس جگہ ٹکڑا ملا ہے تو کل کو بھی مل سکتا ہے اور مل سکتا ہے تو پھر اسی جگہ پہنچ جانا چاہئے۔ یہ صغریٰ کبریٰ ملانا آخر عقلی قیاس نہیں ہے تو اور کیا ہے، خواہ وہ تعبیری اور لفظی نہ ہومگر ایک حقیقت تو ہے، نیز عرفِ عام میں بعض جانوروں کو چالاک اور ہوشیار کہا جاتا ہے، جیسے لومڑی اور گدھے، بھینس کو عام طور سے احمق اور پلید کہتے ہیں، سعدی شیرازی نے کہا تھا کہ ۔

مسکین خر اگرچہ بے تمیز است   جون بار ہمی برد عزیز است

اور کسی نے بھینس کے بارے میں بھی کہا ہے کہ:-

جاموش بے وقوف و بے ہوش   چوں شیر دہد تو چشم ازد پوش

اگر ان حیوانات میں عقل وشعور کی جنس ہی نہ ہوتی تو یہ نوعی تفاوت کی تقسیم صحیح نہ ہوتی جو عرفِ عام میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے، اندریں صورت عاقلیت یا دریافت معقولات علی الاطلاق انسان کی خصوصیت قرار دے کر اس کی حدِ تام حیوانِ ناطق کو بتلایا جانا اور اس سے نوعِ انسانی کا تعارف کرایا جانا کوئی جامع مانع قسم کا تعارف نہیں ہوسکتا۔ البتہ فکر و تدبر کے راستے سے حقائق کا تجزیہ کر کے ان میں امتیاز قائم کرنا، نئے نئے اکتشافات سے جزئیات پیدا کرلینا، جزئیات کو جمع کر کے ان سے کلیات بنانا، کلیات سے جزئیات کا نکال لینا اور جزئیات کے عواقب و نتائج کو سمجھنا، نتائج کے معیار سے عواقب اور انجامِ دُنیا و آخرت کو پیشِ نظر رکھنا، نوعی خیرسگالی اور اس کی منظّم تدبیریں اور اصلاحِ معاشرہ کے لئے سوچ بچار وغیرہ بلاشبہ انسانی نوع ہی کے ساتھ مخصوص ہے اور یہ سب اسی فکر کے کرشمے ہیں۔ اس لئے انسانی حقیقت کی اگر کوئی جامع مانع تعریف ہوسکتی ہے تو وہ حیوانِ ناطق نہیں، بلکہ حیوانِ متفکر ہوسکتی ہے، کیونکہ فکرمندی، فکر نمائی اور فکری پیمائش اور وہ بھی عمومی اور پوری نوعِ بشری کے

لئے اور نہ صرف اس حیات کے لئے بلکہ حیات بعد الممات تک کے لئے صرف انسان ہی کی خصوصیت ہے، جو اس کے دُوسرے ابنائے جنس کو میسر نہیں، اس لئے حیوانِ متفکر ہی کو انسان کی حدِ تام کہنا کچھ زیادہ قرینِ عقل نظر آتا ہے۔

پس یہ فکری قوت ہی انسان کی سب سے بڑی فعال قوت اور اس کی ساری معنوی قوتوں میں اُولوالامر کی حیثیت رکھتی ہے، اور یہی وہ طاقت ہے جس سے وہ کائنات میں متصرف اور عنصری مخلوق سے اُونچا سمجھا جاتا ہے، پھر یہی نہیں کہ انسان اس قوت کا ایک ظرف ہی ہے جس میں عقل و دانش، ذوق و وجدان اور حدس و تجربہ وغیرہ جیسی قوتوں کی مانند فکر بھی ان ہی جیسی ایک قوت ہے اور دُوسری قوتوں کی طرح وہ بھی کسی نہ کسی وقت اپنے محدود و مخصوص دائرے میں کام دے جاتی ہے، بلکہ فکر کی طاقت اس کی تمام معنوی طاقتوں پر حکمران، متصرف اور ان کی رُوح ہے، جس کے اشاروں پر یہ ساری قوتیں آمادۂ عمل رہتی ہیں، اگر کہیں نمائشی کرّ وفر کا بازار گرم ہو اور باجوں، گاجوں اور نعروں کی آوازیں فضا میں گونج رہی ہوں، لیکن اگر راہ گیر کسی دُوسرے خیال میں مستغرق ہو تو ان میں سے ایک چیز بھی نہ آنکھ کو نظر آئے گی، نہ کان کوئی آواز سن پائے گا، اور لاعلمی کے اظہار پر جب لوگ حیرت کریں گے تو وہ یہ کہے گا کہ میں فلاں بات کے فکر میں ڈُوبا ہوا تھا، مجھے ان مناظر اور آوازوں کی کچھ خبر نہیں، اس سے واضح ہے کہ آنکھ کان خود نہ دیکھتے ہیں نہ سنتے ہیں، بلکہ قوتِ خیال و فکر ہی دیکھتی سنتی ہے، یہ آنکھ کی بینائی اور کان کی شنوائی فکر کے آلات و وسائل سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

صورت عقل و دُور اندیشی کی بھی ہے کہ آدمی زیرک بھی ہو اور دانائے روزگار بھی سمجھا جاتا ہو، لیکن وہ کسی نظریئے کی سوچ میں محو ہو تو دُوسرے کتنے ہی عقلی نظریات اس کے سامنے رکھ لئے جائیں، نہ وہ انہیں سمجھ سکے گا، نہ ان کا شعور ہی پا سکے گا کیونکہ اس کی قوتِ فکریہ کے بغیر وجود پذیر نہیں ہوسکتا۔ اگر غیبی میدانوں میں

فکر کی قوّت متوجہ ہی نہ ہو یا کسی دُوسرے رُوحانی مقام میں محو ہو تو دُوسرے غیبی اور وجدانی لطیفے قلب پر بھی منکشف نہیں ہوسکیں گے۔ آخر مراقبات میں قوّتِ فکر اور دھیان ہی کا تو استعمال ہوتا ہے، احسان یا تصرف کے معنی ہی یہ ہیں کہ اللہ کو اس طرح حاضر و ناظر تصوّر کر کے آدمی عبادت میں مصروف ہو گویا وہ اسے دیکھ رہا ہے، سو یہ قوّتِ فکر کا استعمال نہیں تو اور کیا ہے؟

انسان کی فکری قوّت کی کارپردازی

بہرحال یہ ایک واقعی حقیقت ہے کہ انسان کی معنویت میں حقیقی کارپرداز صرف یہ فکر ہی قوّت ہے، وہ نہ متوجہ ہو تو قوّتِ باصرہ، سامعہ، شامہ، ذائقہ، لامسہ اور قوّتِ عاملہ سب معطل رہ جاتی ہے، اس لئے جب وہ محسوسات کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو حواسِ خمسہ ہرکاروں کی طرح اس کے حکم پر دوڑتے ہیں، جب عقلیات کی طرف منعطف ہوتی ہے تو عقل ایک خادم کی طرح اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہے، یہی قوّتِ فکر جب غیبیّات کی طرف چل نکلتی ہے تو وجدان و ذوق اس کے اشاروں پر کام کرتے ہیں۔

اس لئے قوّتِ فکریہ نہ صرف یہ کہ انسان کی خصوصیت ہی ہے جو اس کی ماہیت کا سرنامہ ہے بلکہ اس کی ساری ہی اندرونی قوتوں کی رُوح اور اُن کے حق میں محرک اور قائد بھی ہے۔ قرآنِ حکیم نے اپنے کلامِ معجز نظام میں اسی حقیقت کو واشگاف فرمایا ہے، چنانچہ جو قومیں ان حسّی طاقتوں، آنکھ کی بینائی اور کان کی شنوائی وغیرہ کے ذریعہ معجزاتِ انبیاء کو دیکھتی تھیں اور ان کے پاک کلمات سنتی تھیں، مگر رضاء وتسلیم کا نام نہیں لیتی تھیں تو قرآنِ حکیم نے اس کی وجہ آنکھوں کی نابینائی یا کانوں کی ناشنوائی قرار نہیں دی بلکہ دِل کی نابینائی بتلائی ہے جو درحقیقت اس قوّتِ فکریہ کی نابینائی ہے، ارشاد فرمایا:-

فَاِنَّهَا لا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ. (الحج:۴۶)

ترجمہ:- (بات یہ ہے کہ) ان کی آنکھیں اندھی نہیں ہیں بلکہ سینوں میں دِل اندھے ہیں (جو فکر اور غور سے عاری ہیں)۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حواس کی رُوح اور مدارِ کار فکرِ قلب ہی ہے نہ کہ نظرِ چشم، فکر کی آنکھ نہ ہو تو حواس سب کے سب اندھے ہی رہ جاتے ہیں، گویا وہ طبعی آمادگی سے دید و شنید کا کام بھی انجام دیئے جائیں، اس لئے قرآنِ حکیم نے منکرین کی ظاہری دید و شنید کو مانتے ہوئے بھی اس کی حقیقی کارکردگی کا انکار کیا ہے، جبکہ اس کی غرض و غایت ہی اس پر مرتب نہیں ہوتی جو قوتِ فکر سے متعلق ہے کہ یہی فکری رُوح ان محسوسات کے پیکروں میں سے ان کی رُوح نکال کر لاتی ہے، ارشادِ حق ہے:-

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ، اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لا يَعْقِلُوْنَ. وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ، اَفَاَنْتَ تَهْدِى الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ. (یونس:۴۲،۴۳)

ترجمہ:- اور (آپ ان کے ایمان کی توقع چھوڑ دیجئے کیونکہ) ان میں (گو) بعض ایسے بھی ہیں جو (ظاہر میں) آپ کی طرف کان لگا لگا کر بیٹھے ہیں، کیا آپ بہروں کو سنا (کر ان کے ماننے کا انتظار کرتے ہیں) گو ان کو سمجھ بھی نہ ہو۔ اور (اسی طرح) ان میں بعض ایسے ہیں کہ (ظاہراً) آپ کو (مع معجزات و کمالات) دیکھ رہے ہیں تو پھر کیا آپ اندھوں کو راستہ دِکھلانا چاہتے ہیں گو ان کو بصیرت بھی نہ ہو۔

اس سے واضح ہے کہ سن کر کسی چیز کو اَن سنی کر دینا اور دیکھ کر اَن دیکھی بنا دینا قوتِ فکر ہی کے تعطل سے ہوتا ہے جس کو قرآن نے عقل و ابصار سے تعبیر کیا گیا

ہے، گویا جس مبصر و مستمع میں یہ بنیادی شعور شامل نہ ہو جس کا قوتِ مفکرہ کے غور وفکر سے تعلق ہے تو وہ مبصر اور مستمع بلحاظِ حقیقت غیر مسموع اور غیر مبصر کے حکم میں ہے۔ پھر اس طرح قرآنِ حکیم نے ایک دُوسری جگہ ان منکروں کے حق میں فرمایا جو پیغمبر علیہ السلام اور ان کے پیغمبرانہ اقوال و افعال کو دیکھتے اور سنتے تھے اور طبعی انداز سے وہ بینا اور شنوا بھی تھے لیکن فکرِ قلبی نہ ہونے یا نہ برتنے سے ان کے یہ حواس، حیوانی حواس سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے، اور ان میں وہ فکری شعور نہ تھا جو حقیقی معنی میں دیکھتا اور سنتا ہے، جسے قرآن نے فقہ قلبی سے تعبیر کیا ہے، ارشادِ حق ہے:-

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ، اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ. (الاعراف:۱۷۹)

ترجمہ:- ان کے دِل ایسے ہیں کہ جن سے وہ سمجھتے نہیں، ان کی آنکھیں ایسی ہیں کہ جن سے وہ دیکھتے نہیں، ان کے کان ایسے ہیں کہ جن سے وہ سنتے نہیں، ایسے لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ رو، یہی لوگ غافل ہیں۔

اس سے واضح ہے کہ قلب کا محض طبعی شعور اصل نہیں جو حیوانات میں بھی موجود ہے، بلکہ فقہ قلب اصل ہے، جس کا دُوسرا نام قوتِ فکر ہے، وہ نہ ہو تو حواس کام ہی نہ کریں گے یا کریں گے تو وہ ناقابلِ اعتبار ہوگا، اور غیر قابلِ التفات جس سے نمایاں ہے کہ قلبی نور اصل ہے جس کا نام فکر ہے نہ کہ مطلقاً قلبی شعور جو چوپایوں میں بھی پایا جاتا ہے۔

عقل کی کارگزاری کے قابلِ التفات ہونے کا حقیقی معیار

اسی طرح عقل کے بارے میں بھی قرآنِ کریم نے یہی فیصلہ دیا ہے کہ اس

کی کارگزاری کے قابلِ التفات ہونے کا معیار بھی یہی قوتِ فکر ہے، عقلِ محض نہیں، یعنی عقلِ طبیعی کے سوچ بچار کے باوجود جبکہ قلب کا فقہی سوچ بچار اس کا منشا نہ ہو جس کا نام فکر ہے تو عقلی شعور بھی بے شعور اور نا قابلِ اعتنا ہو جاتا ہے، چنانچہ ایسے قلوب کو جو بے فکرے ہوں قرآن نے عاقل نہیں کہا، غافل کہا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:-

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا، اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ. (الروم:۲۴)

ترجمہ:- اور اسی کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ تم کو بجلی دِکھاتا ہے جس سے ڈر بھی ہوتا ہے اور اُمید بھی ہوتی ہے اور وہی آسمان سے پانی برساتا ہے، پھر اسی سے زمین کو اس کے مردہ ہوجانے کے بعد زندہ کردیتا ہے، ان میں سے ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو عقل رکھتے ہیں۔

اس آیتِ کریمہ سے نمایاں ہے کہ برق و بخار اور بارش سے احیاء غبار (زمین) وغیرہ باوجودیکہ آنکھوں سے نظر آنے کی چیزیں ہیں جنھیں سب دیکھتے ہیں حتیٰ کہ چرند و پرند بھی اور ان سے دُنیوی زندگی کے بارے میں کچھ نہ کچھ خوف و طمع کا اثر بھی لیتے ہیں، لیکن فرمایا یہ گیا ہے کہ ان حوادث میں قدرت کی نشانیاں پنہاں ہیں، اور ان ہی کی پہچان کرانا مقصود بھی ہے، وہ صرف عقل لڑانے والوں ہی کے لئے ہیں آنکھ لڑانے والوں کے لئے نہیں، اور عقل لڑانے کا نام ہی فکر کا استعمال ہے، جو عقل کو کام پر لگاتا ہے، بے صبری اور بے توجہی سے عقلی تگ و تاز بھی عبث اور بے نتیجہ رہ جاتی ہے۔ بہرحال حس ہو یا عقل، ذوق ہو یا وجدان، بلافکر کے نابینا اور بے نگاہ سمجھے گئے ہیں جس سے فکر کا بلند مقام کھل کر سامنے آجاتا ہے۔

قرآنِ حکیم کی انسان کو فکر و تدبر کی دعوت اور اس کا انداز

یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم نے جگہ جگہ مختلف دائروں میں انسان کو فکر و تدبر کی دعوت دی ہے، کہیں غور و فکر کے لئے اَنفسی آیات ہیں، کہیں شرعی اور علمی آیات سامنے رکھی ہیں، اور وجدانی اور لدنی آیات اور ان میں تدبر اور غور و فکر کا مطالبہ کیا ہے، اَنفسی آیات کی طرف رہنمائی کے لئے فرمایا:-

وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ.

ترجمہ:- تمہارے اندر (خود دلائلِ معرفت) موجود ہیں کیا تم غور نہیں کرو گے۔

کہیں آفاقی آیات پیش کیں، جیسے:-

اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ.

ترجمہ:- کیا وہ آسمانوں اور زمین کے حقائق میں نظر (وفکر) نہیں کرتے۔

کہیں ان دونوں نوعوں کو جمع کر کے فرمایا:-

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ. (حٰمٓ السجدة:۵۳)

ترجمہ:- ہم عنقریب ان کو اپنی (قدرت کی) نشانیاں ان کے گرد ونواح میں بھی دکھادیں گے اور خود ان کی ذات میں بھی یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہوجائے گا کہ وہ قرآن حق ہے۔

کہیں شرعی آیات پیش کیں اور قرآنِ حکیم کو غور و تدبر کے لئے پیش کیا:-

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ، وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا. (النساء:۸۲)

ترجمہ:- کیا پھر قرآن میں غور نہیں کرتے اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت اختلاف پاتے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور آپ کی حیاتِ طیبہ کی شان اور پاکیزہ سیرت و کردار میں غور کرنے کی طرف توجہ دِلائی، تاکہ اس سیرتِ پاک کو دیکھ کر آپ کی دعوت کی صداقت دِلوں میں آجائے اور لوگ اسے ماننے کے لئے تیار ہوجائیں، فرمایا:-

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ، اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا، مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ، اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَىْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ. (سبا:۴۶)

ترجمہ:- آپ فرمادیجئے اے پیغمبر کہ میں تمہیں ایک ہی بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ تم دو دو اور ایک ایک اُٹھو اور پھر فکر کرو کہ کیا واقعی تمہارے ان ساتھی (پیغمبر) میں کوئی دیوانگی یا جنون ہے؟ وہ تو اس کے سوا کچھ اور نہیں ہیں کہ تمہیں آخرت کے شدید عذاب سے ڈرانے والے ہیں جو تمہارے سامنے آنے والا ہے۔

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ، اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ. (الاعراف:۱۸۴)

ترجمہ:- کیا یہ فکر سے کام نہیں لیتے اپنے ساتھی (پیغمبر) کے بارے میں کہ کیا ان میں جنون ہے؟ وہ نہیں ہیں مگر ایک کھلے ہوئے ڈرانے والے آخرت کے عذاب سے (کیا یہ کسی مجنون کا کام ہے؟)۔

یہی صورت وجدانیت کی بھی ہے کہ حقائقِ غیبیہ کے انکشاف میں بھی یہی قلبی فکر کام کرتا ہے جس کو ''لُب'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور اس سے منکشف شدہ

علوم و معارف کو حکمت سے تعبیر کیا جاتا ہے، قرآنِ حکیم نے ارشاد فرمایا کہ:-

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا، وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُوْلُوا الْاَلْبَابِ. (البقرۃ:۲۶۹)

ترجمہ:- جسے حکمت دے دی گئی اسے خیرِ کثیر عطا کردی گئی، اور نصیحت وہی قبول کرتے ہیں جو گہری عقل والے ہیں۔

حاصلِ کلام

حاصل یہ ہے کہ مطلقاً عقل ایک طبعی غریزہ اور طبعی مادّہ ہے، جیسے بینائی اور شنوائی وغیرہ، مگر وہ صورتِ عقل ہے جو مادّہ شعور ہے، اور زیادہ سے زیادہ قیاس کے راستے سے کلیات کا ادراک کرلیتا ہے، لیکن لب اور لباب حقیقتِ عمل ہے، جس سے حقائقِ کونیہ اور حقائقِ شرعیہ منکشف ہوتی ہیں، اسی کا نام فکر ہے، یہ حکمت جسے خیرِ کثیر کہا گیا ہے، محض عقلِ طبعی سے برآمد نہیں ہوتی، بلکہ عقلِ عرفانی سے منکشف ہوتی ہے جسے لُب کہا گیا ہے۔

بہرحال قرآنِ حکیم نے اس خاص قوّتِ فکر جس کا تعلق قوانینِ الٰہی، معرفتِ خداوندی، حقائقِ نبوّت اور اس کے ایوان کے انکشاف سے ہے، جسے صبغۃ اللہ کہا گیا ہے، اسی کو کہیں فقہ قلبی سے، کہیں لُبّ (عرفانی)، کہیں نظرِ (باطن) سے، کہیں بصیرت سے اور انصباغ من اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے جو انسان کی ساری قوّتوں، حواس، عقل، وجدان اور حدس و تجربے کو کام میں لگاتا ہے اور یہ صرف انسان ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔

بہرحال قرآنِ حکیم نے فکر کو انسان کا بنیادی جوہر قرار دے کر اس کا مصرف انفس و آفاق، تشریع و تکوین اور کمالات ذات و صفاتِ نبوی اور معرفتِ الٰہی کو بتلایا ہے اور جگہ جگہ اسی کی دعوت دی ہے، اور ظاہر ہے کہ فکر و تدبر پر چشمِ بینا اور گوشِ شنوا کا کام

نہیں بلکہ قلبِ متفکر ہی کا کام ہے، اور فکر ہی جب ان اعضاء حواس وغیرہ کا اِمام بنتا ہے تو وہ اس کی اقتداء میں اپنا اپنا کام انجام دیتے ہیں، اور پھر فکر ان میں سے اُصولی، کلی اور علمی مقاصد تک پہنچ کر معرفتِ حق کے مقام پر پہنچ جاتا ہے۔

خلاصۂ کلام

خلاصہ یہ کہ فکر ہی انسان کی امتیازی صفت ہے، فکر ہی انسانی حقیقت کی فصلِ ممیّز ہے، فکر ہی سے علم و معرفت کے دروازے کھلتے ہیں، فکر ہی انسان کی ظاہری اور باطنی قوتوں کا اِمام اور سربراہ ہے، اگر فکر اسلام میں مطلوب نہ ہوتا تو اِجتہاد کا دروازہ کلیۃً مسدود ہوجاتا اور شرائع فرعیہ اُمت کے سامنے نہ آسکتیں۔ یہ بحث الگ ہے کہ کس درجے کا اِجتہاد باقی ہے اور کس درجے کا ختم ہوچکا ہے، مگر اِجتہاد کی جنس بہرحال اُمت میں قائم رکھی گئی ہے جو برابر قائم رہے گی، اس لئے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے اگر اس بنیادی اُصول بلکہ اصل الاُصول کی طرف ہندوستان کے علمی حلقوں کی توجہ دِلائی اور دُنیا کے بدلتے ہوئے حالات میں فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید کی دعوت دی اور اَربابِ علم وفضل کو انسانی اور ربانی حقائق کے اکتشافات کی طرف متوجہ کیا تو نہ صرف یہ کہ اس نے ایک بڑا بنیادی مسئلہ اُٹھایا ہے بلکہ خود جامعہ کی تاریخ کو بھی دہرایا ہے کیونکہ جامعہ کی بنیاد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہٗ نے رکھی تھی جس کا نصب العین ہی قدیم و جدید تعلیم کو یکجا کرکے ملت کی مختلف صلاحیتوں کو ایک مرکز پر جمع کردینا تھا، تاکہ فکرِ واحد کے راستے سے قوم کے ان دوگروہوں قدیم و جدید کی دُوئی ختم کرکے انہیں افکار و خیالات اور عقائد و مقاصد کی وحدت سے قوم واحد بنادیا جائے، اس لئے بلاشبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ اس اقدام میں تبریک وتحسین کی مستحق ہے لیکن اس نئی نہضت اور فکرِ اسلامی کی تشکیلِ نو کے جذبات سامنے آنے پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس فکر کا علمی آغاز کس مرکزی نقطے سے کیا جائے، جس میں یہ تمام

مذکورہ انواع جن کے لئے قرآنِ حکیم نے دعوت دی ہے سمٹ کر اسی مرکزی نقطے کے نیچے جمع ہو جائیں اور کام بجائے پھیلنے کے سمٹ کر اس بنیادی نقطے سے شروع ہو۔

فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید کا مرکزی نقطہ ''منہاجِ نبوّت''

اس لئے فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید کے سلسلے میں پہلا قدم جو ہمیں اُٹھانا چاہئے وہ یہ ہے کہ ہمیں اپنے فکر کے لئے سب سے پہلا فکر ایک نشانہ اور ہدف متعین کر لینا چاہئے جس پر ہم اپنے فکر کی توانائیاں صَرف کریں اور شاخ در شاخ مسائل اس نقطے سے جوڑتے چلے جائیں، جس سے نہ صرف راستہ ہی سامنے آجائے گا بلکہ تشتّت افزا اوہام و خیالات بھی خود بخود اس سے دفع ہوتے چلے جائیں گے اور ہمارا قدم بجائے منفی ہونے کے مثبت انداز سے آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ سو ہمارے نزدیک وہ جامع نقطہ ایک ہی ہے جس کا نام ''منہاجِ نبوّۃ'' ہے، جس پر فکر کو مرکوز کر دینے کی ضرورت ہے کیونکہ اس منہاج ہی کی شمع ہاتھ میں لے کر یہ قوم آگے بڑھی ہے اور ظلمتوں میں اُجالا پھیلتا چلا گیا ہے۔ پس اس منہاج سے آج بھی آگے بڑھ سکتی ہے، اس منہاجِ نبوّۃ کو سامنے رکھ کر ہمارے سامنے وہ مزاج آجائے گا جو اس اُمت میں نبیِٔ اُمت نے پیدا فرمایا ہے، اور یہ واضح ہو جائے گا کہ خود اسلام کی تشکیل کا آغاز کس نوعیت سے ہوا کہ ہم اس کے فکرِ جدید کا آغاز بھی اسی نوعیت سے کریں، نیز یہ بھی سامنے آجائے گا کہ اس کے ابتدائی مراحل سے گزر کر اور آخرکار اپنی انتہائی منزل پر پہنچ کر بحیثیت مجموعی اس اُمت کا مزاج کیسا بنایا؟ اور اسے کس ذوق پر ڈھالا؟

منہاجِ نبوّت کا اُمت کے مزاج اور ذوق کی تعمیر پر اثر

غور کیا جائے تو اس منہاجِ نبوّۃ نے اُصولی طور پر ہمیں دِین کے بارے میں کمالِ اعتدال اور توسط کا راستہ دِکھایا ہے، نہ تو اس نے ہمیں رَہبانیت کے راستے پر ڈالا کہ ہم عبادت اور دِین داری کے نام پر دُنیا کو کلیۃً ترک کر کے زاویہ نشین

ہوجائیں، شہری آبادیوں، تمدنی معاملات اور مدنیت کے سارے تقاضوں بلکہ خود اپنے سارے طبعی جذبات ومیلانات کو بھی چھوڑ کر پہاڑوں اور غاروں میں جابیٹھیں کہ نہ گھر ہو نہ در، نہ معاشرہ ہو نہ معیشت، نہ انسانی روابط ہوں نہ قومی تعلقات، نہ موانستِ باہمی ہو نہ اجتماعیت کہ یہ نہ اسلام کا مزاج ہے، نہ اس کا مطالبہ اور نہ ہی فطرت کا تقاضا، اس لئے اسلام نے اس کا نام رَہبانیت رکھ کراس کی برملانفی کی ہے کہ:-

لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ.

ترجمہ:- اسلام میں رَہبانیت کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔

اور نہ ہی ہمیں بہیمیت کے راستے پر ڈالا کہ ہم مدنیت کے نام پر عبادتِ الٰہی اور طاعت نبوی سے بیگانہ ہوکر کلیۃً نظامِ دُنیا سنوارنے، جاہ و مال کے خزانے بٹورنے میں لگ جائیں اور راحت طلبی اور عیش کوشی میں غرق ہوجائیں اور ہماری زندگی کا نصب العین ہی ہوس رانی، حظ اندوزی اور ہوائے نفس کی غلامی کے سوا دُوسرا نہ ہو، نہ عقائد رہیں نہ عبادات، نہ فرائض رہیں نہ سنن، نہ واجبات ہوں نہ ان کی لگن، نہ قومی تربیت کا داعیہ رہے نہ صلہ رحمی اور خیرخواہی اور نہ اولاد و اقارب کا جذبہ، بلکہ رات دن ہوائے نفس کی پیروی، شبانہ روز لہو و لعب، عیش و طرب، آرائش و آسائش اور نمائش و زیبائش، مالی تکاثر اور جاہی تفاخر ہی زندگی کا مشغلہ بن کر رہ جائے، سواسے بھی اسلام نے نمائشی زندگی، متاعِ غفلت یا بالفاظِ مختصر بہیمیت کہہ کر اسے اُمت کے قومی مزاج سے خارج کردیا ہے، فرمایا:-

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ. (آل عمران:۱۸۵)

ترجمہ:- اور دُنیاوی زندگی تو کچھ بھی نہیں صرف دھوکے کا سودا ہے۔

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا، وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ. (الروم:۷)

ترجمہ:- یہ لوگ صرف دُنیاوی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں اور

یہ لوگ آخرت سے بے خبر ہیں۔

ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ.

(الحجر:۳)

ترجمہ:- اور آپ ان کو (ان کے حال پر) رہنے دیجئے کہ وہ کھالیں اور چین اُڑالیں اور خیالی منصوبے ان کو غفلت میں ڈالے رکھیں ان کو ابھی حقیقت معلوم ہوئی جاتی ہے۔

بلکہ اس افراط وتفریط سے الگ کر کے دُنیا کو ترک کرانے کے بجائے اس کی لگن کو ترک کرایا ہے، اور دِین کو اصل رکھنے کے ساتھ اس میں غلوّ اور مبالغے سے روکا ہے، یعنی ایک ایسا جامع فکر دیا ہے جس میں دُنیا کے شعبوں کو زیرِ استعمال رکھ کر ان ہی میں سے آخرت پیدا کی ہے، چنانچہ دُنیا کو کھیتی بتلایا اور آخرت کو اس کا پھل:-

اَلدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ

ترجمہ:- دُنیا آخرت کی کھیتی ہے۔

حاصل یہ نکلا کہ اگر پھل ضروری ہے تو کھیتی بھی اتنی ہی ضروری ہے، اس لئے اسلام کے ہر حکم میں جہاں اَجرِ آخرت ہے وہیں حظِ دُنیا بھی شامل ہے، مثلاً اگر مسواک میں ثوابِ آخرت ہے تو وہیں منہ کی خوشبو بھی پیشِ نظر ہے، اگر طیباتِ رزق میں بہ نیت حسنِ عبادت کی قوّت رکھی گئی ہے وہیں کام و دہن کے ذائقے سے بھی اجتناب نہیں بتلایا گیا ہے، اگر لباس میں بہ نیت آخرت اور غیرتِ حیا اور سترِ عورت کا تحفظ حاصل ہے تو وہیں حسنِ دُنیوی اور وقار بھی ملحوظ ہے، اگر ازار کو ٹخنوں سے نیچا اور زمین سے گھسٹتا ہوا رکھنے کی ممانعت سے کبر ونخوت اور جاہ پسندی کے تخیل سے بچایا ہے تو وہیں لباس کو آلودگی اور گندگی سے پاک اور صاف رکھنے کی صورت بھی اختیار کی گئی ہے، جو دُنیاوی مفاد ہے، اگر تختِ شاہی کا اصل مقصد عدل کے ساتھ تحفظِ ملک، خدمتِ خلق اور قومی تربیت بجوابدہی آخرت حاصل ہے تو وہیں اسے دُنیوی وقار و

عزّت اور سیادت و قیادت کے حظوظ سے بھی بھرپور کیا گیا ہے، بہر حال آخرت کی سچی طلب کے ساتھ دُنیا کے کسب و اکتساب کو بھی لازمی رکھا گیا ہے۔ صائب نے اس ذوق کو کس خوبی سے ادا کرتے ہوئے کہا ہے:

فکرِ دُنیا کن و اندیشۂ عقبٰی مگذار
تا بعقبیٰ نہ رسی دامن دُنیا مگذار

غرض منہاجِ نبوّت نے رَہبانیت اور بہیمیت کے درمیان معتدل مزاج پر اس اُمت کو ڈھالا ہے، جس میں طبعی جذبات بھی پامال نہ ہوں بلکہ ٹھکانے لگ جائیں، اور عقلی مقاصد کی تکمیل میں بھی فرق نہ پڑے اور وہ بروئے کار آجائیں۔ اس لئے اس منہاج کے عناصرِ ترکیبی تہذیبِ نفس، تدبیرِ منزل، سیاستِ مدنی، تسخیرِ اقالیم، تعظیم امر اللہ، شفقت علی خلق اللہ، نظامِ اجتماعیت، جماعتی تنظیم و مرکزیت، اخلاق و ایثار کی منظّم تربیت، نظامِ عبادت اور نظامِ اَمر بالمعروف و نہی عن المنکر اور اس کے ساتھ فکرِ آخرت اور محاسبہ اُخروی کا استحضار قرار پائے اور پوری قوم کو اسی رنگ میں رنگا گیا ہے تاکہ یہ قوم جامعِ دِین و دُنیا بن کر بجائے اس کے کہ دُنیا کی اقوام کی جامد مقلد اور مقتدی بنے اسے خوددار بنا کر اِمامِ اقوام اور داعیٔ حق و صداقت کی حیثیت دی گئی ہے:

جس طرح احمدِ مختار ہیں نبیوں میں اِمام
ان کی اُمت بھی ہے دُنیا میں اِمامِ اقوام

تشکیلِ جدید میں آج کی ضرورت

پس آج جس چیز کی ضرورت ہے وہ صرف یہ ہے کہ اس منہاجِ نبوّت کو سمجھ کر فکرِ اسلامی کو ایک نئی ترتیب اور نئے رنگِ استدلال سے آج کی زبان اور اُسلوبِ بیان سے مرتب کیا جائے کہ حقیقی معنی میں اسلامی فکر کی یہی تشکیلِ جدید ہوگی۔ ورنہ اس منہاج اور اس متوارث ذوق سے ذرا بھی ہٹ کر تشکیل ہوگئی تو وہ تشکیل نہ ہوگی

بلکہ تبدیل ہوجائے گی جو قلبِ موضوع ہوگا، اس لئے تشکیلِ جدید کا خلاصہ دولفظوں میں یہ ہے کہ مسائل ہمارے قدیم ہوں اور دلائل جدید، تاکہ یہ تشکیل قائم کر کے ہم خلافتِ الٰہی اور نیابتِ نبوی کا حق ادا کرسکیں۔

فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید کا یہ پہلا قدم ہے یا مرکزی نقطہ ہے، جس سے ہمیں کام کا آغاز کرنا ہے اور اسی نقطے پر اپنی تمام توانیاں صَرف کرنی ہیں۔

فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید میں اُصول اور قواعدِ کلیہ اور ضوابط کی پابندی کی اہمیت

اس تشکیلِ جدید کے سلسلے میں دُوسرا قدم وہ اُصول اور قواعدِ کلیہ اور ضوابط ہیں جن کے نیچے منہاجِ نبوّت کے تمام عقائد و اَحکام و اخلاق وعبادات اور معاملات و اجتماعیات وغیرہ آئے ہیں تاکہ ہماری تشکیلِ جدید کا سرچشمہ وہی اُصول ہوں جن سے مسائل کی تشکیلِ قدیم عمل میں آئی تھی اور اس طرح قدیم و جدید تشکیل میں کوئی تفاوت یا بُعد اور بیگانگی رُونما نہ ہوگی، ورنہ ظاہر ہے کہ اُصولِ کلیہ سے ہٹ کر یا انہیں بدل کر یہ تشکیل اسلامی فکر کی تشکیل نہ بن سکے گی۔

اگر ایک شخص سائنس کے فکر کو مرتب یا حل کرنے کے لئے فنِ طب کے اُصول سے کام لینے لگے جن کا سائنس کے اُصولِ مُسلّمہ اور علومِ متعارف سے کوئی تعلق نہ ہو، یا منطق و فلسفہ کی فکر کی تشکیل کے لئے صَرف ونحو کے اُصول سے کام لینے لگے تو وہ کبھی اس تشکیل میں کامیاب نہ ہوسکے گا۔ اس لئے سب سے پہلے اسلامی فکر کی تدوین وترتیب میں اسلامی فکر کے اَساسی اُصول ہی کو سامنے رکھنا پڑے گا، تاکہ ہماری تشکیل سے وہ ذوق فوت نہ ہونے پائے جو ان اَساسی اُصول میں پیوست کیا گیا ہے اور انہی سے شریعت کے قواعد و مقاصد تک پہنچا ہوا ہے، یہ اُصول و قواعد ہی درحقیقت منہاجِ نبوّت کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں، جس کا اثر پورے قانونِ شریعت

میں پھیلا ہوا ہے، اگر تشکیلِ جدید میں یہ قواعد وضوابط نہ رہیں تو وہ اسلامی فکر کی تشکیل نہ ہوگی صرف دماغی فکر کی تشکیل بن جائے گی۔

اُصول وضوابط کے ساتھ جزئیات کے تعین کا مسئلہ

البتہ ان قواعدِ کلیہ میں جو ضوابط عبادات اور عقائد کے بارے میں ہیں ان کی عملی جزئیات بھی شریعت نے خود متعین کردی ہیں، اس لئے ان میں تغیر وتبدل یا کسی جدید تشکیل کا سوال پیدا نہیں ہوسکتا، البتہ معاملاتی، معاشرتی اور سیاسی و اجتماعی اُمور میں چونکہ زمانے کے تغیرات سے نقشے اَدلتے بدلتے رہتے ہیں، اس لئے شریعت نے ان کے بارے میں کلیات زیادہ بیان کی ہیں اور ان کی جزئیات کی تشخیص کو وقت کے تقاضوں پر چھوڑ دیا ہے، جن میں اُصول وقواعد کے تحت توسعات ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ البتہ ایسے تغیرات کو چونکہ قواعدِ کلیہ کے تحت رکھا گیا ہے اس لئے ان میں بہرحال فنی استخراج کی ضرورت پڑے گی، جسے مبصر علماء کی بصیرت ہی حل کرسکے گی، جیسا کہ قرونِ ماضیہ میں کرتی رہی ہے، بس ایک مجتہد کو اجتہاد کی تو اجازت ہے، ایجاد کی نہیں کہ وہ اِتباع کے دائرے سے باہر نہ نکل سکے، خواہ یہ اِتباع جزئیات کا ہو جبکہ وہ منصوص ہوں، یا قواعدِ کلیہ کا ہو جبکہ وہ اِجتہادی ہوں، جزئیات میں درحقیقت اِتباع ان اُصولِ اِجتہاد ہی کا ہوتا ہے جس کے ذریعے یہ جزئیات باہر آتی ہیں، اس لئے اس تشکیلِ جدید کے موقع پر یہ کلیات و جزئیات سامنے رکھنی ناگزیر ہوں گی اور انہی کے دائرے میں رہ کر یہ جدید تشکیل و ترتیب عمل میں آسکے گی۔ نیز اگر اس تشکیل کا مقصد قومی تربیت ہے کہ افراد اس منہاج پر ڈھالے جائیں تو یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ تربیت اُصول اور کلیات سے نہیں ہوسکتی، جیسے علاج، اُصولِ طب اور معرفتِ خواصِ اَدویہ سے نہیں ہوسکتا، جب تک کہ مزاج کے جزوی احوال کو پہچان کر جزوی طور پر نسخہ نہ تجویز کیا جائے، یہی صورت شرعیات

کی بھی ہے کہ اگر قومی معالجہ اور قومی اصلاح پیشِ نظر ہو تو وہ محض اُصولِ کلیہ سے نہیں ہوسکتی، بلکہ جزئیاتِ عمل ہی سے ممکن ہے، یہی وجہ ہے کہ جن اُصول کا عمل سے کوئی تعلق نہ ہو وہ محض ذہن کی زینت ہوں، عملی زندگی سے انہیں کوئی تعلق نہ ہو، اور کوئی عملی پروگرام بھی ان کے پیچھے نہ ہو تو شریعت نے یہ پسند نہیں کیا کہ ان میں زیادہ غور و خوض کیا جائے، مثلاً چاند کے گھٹنے بڑھنے کے بارے میں لوگوں نے سوال کیا تو قرآن نے اُسلوبِ حکیم پر جواب دیا کہ اس کے منافع سے فائدہ اُٹھاؤ، ان کے حقائق کے پیچھے مت پڑو:-

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ، قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ.

(البقرۃ:۱۸۹)

ترجمہ:- آپ سے چاند کے حالات کی تحقیقات کرتے ہیں، آپ فرمادیجئے کہ وہ آلۂ شناختِ اوقات ہیں، لوگوں کے لئے اور حج کے لئے۔

رُوح کے بارے میں سوال کیا تو فرمادیا گیا کہ تمہارا علم اتنا نہیں کہ ان حقائق کو پہچان سکو، تو کیوں اس ناقابلِ تحمل بات کے پیچھے پڑتے ہو، یہ حقائق یا خود ہی عملی ریاضت سے منکشف ہوجائیں گے یا اگر نہ ہوں تو قیامت میں تم سے ان کا کوئی سوال نہ ہوگا کہ نجات ان پر موقوف نہیں تھی:-

قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا.

(بنی اسرائیل: ۸۵)

ترجمہ:- آپ فرمادیجئے کہ رُوح میرے ربّ کے حکم سے بنی ہے اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

اسی طرح قیامت کے وقت کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمادیا گیا کہ تمہیں اس سے کیا تعلق؟ تمہاری ترقی اور سعادت اس کے مقرّرہ وقت کے علم پر

موقوف نہیں، صرف اس کے آنے کے یقین اور عقیدے پر موقوف ہے اور اس میں یہ جزوی تفصیلات شامل نہیں:-

یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰهَا. فِیْمَ اَنْتَ مِنْ ذِکْرٰهَا. اِلٰی رَبِّکَ مُنْتَهٰهَا. (النازعات: ۴۲-۴۴)

ترجمہ:- یہ لوگ آپ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں کہ اس کا وقوع کب ہوگا، سو اس کے بیان کرنے سے آپ کا کیا تعلق اس (کے علم تعیین) کا مدار صرف آپ کے ربّ کی طرف ہے۔

بہرحال قرآنی رہنمائی سے علم وہی مطلوب اور قابلِ تحصیل ہے جس سے عملی زندگی میں کوئی سدھار پیدا ہوتا ہو اور سعادتِ دارین حاصل ہوتی ہو۔ حاصل یہ ہے کہ عملی زندگی محض اُصول سے نہیں بنتی بلکہ جزئیاتِ عملی ہی سے بنتی ہے، جس کی بروقت تمرین اور ٹریننگ دی جائے اسی لئے کسی مربی نفس یعنی "رَبّانِی" کی تفسیر ابنِ عباسؓ نے: "الذین یربی الناس بصغار العلم ثم بکبارھا" سے کی ہے، یعنی ربانی وہ ہے جو ابتداءً چھوٹی چھوٹی جزئیات سے لوگوں کی تربیت کرے۔ اس لئے قرآنِ کریم نے تذکیر و مواعظ اور اَمر بالمعروف کے نظام کو اجتماعی طور پر مستحکم کیا اور اُسے تمکین فی الارض (حکومت و سلطنت) کی بنیادی غرض و غایت ٹھہرایا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس منہاج پر ہم اپنی فکر کی توانائی صَرف کریں وہ جہاں اُصولی ہو وہیں جزئیاتِ عمل سے بھی بھرپور ہو، تاکہ علم اور عمل دونوں جمع ہوسکیں کہ اس کے بغیر ہمارا فکر اور اس کی تشکیل پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی۔

حاصلِ مطلب

حاصل یہی ہوا کہ فکرِ اسلامی کی تربیت کے وقت جیسے اسلامی بنیادوں کو سامنے رکھنا ضروری ہے ایسے ہی فقہ اور فقہی جزئیات کا سامنے رکھنا بھی ضروری ہے۔ البتہ مناسب اور آج کے دور کی نفسیات کو سامنے رکھ کر ان جزئیات میں ترجیح و انتخاب

جدا بات ہے، وہ اہلِ علم کا کام ہے، مگر یہ بھی ظاہر ہے کہ اُصول کا تعارف اور ان کی جامعیت ووسعت نیز ان کے اندرونی مضمرات کی وضاحت ان کی جزئیات کے بغیر ممکن نہیں، نظری اُصول کتنے بھی معقول اور دِل پذیر ہوں لیکن جب تک ان کی عملی مثالیں سامنے نہ ہوں، ان کا حقیقی مفہوم واشگاف نہیں ہوسکتا، ان جزئیاتِ عمل ہی سے اسلام کی مجموعی اور صحیح صورت وشکل سامنے آسکتی ہے۔ اس لئے فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید میں جہاں ایک طرف مجموعۂ دِین کے اساسی اُصول اور ان کے نیچے ہر ہر باب کے قواعدِ کلیہ یا ضوابطِ تفقہ ناگزیر ہیں وہیں دُوسری طرف ان کے نیچے کی عملی جزئیات کا سامنے ہونا بھی لازمی ہے، ورنہ اُصول کی وسعت و جامعیت کا کوئی اندازہ ہی نہیں ہوسکتا۔

فقہائے متقدمین کے اِستخراجِ جزئیات کی افادیت

اس سے ہی ان حوادث و واقعات پر بھی روشنی پڑسکتی ہے جو ان جزئیات کے اِستخراج کا باعث بنے جبکہ فقہائے اُمت نے قواعدِ شرعیہ سامنے رکھ کر ان کے بعید سے بعید محتملات کے اَحکام بھی ان قواعد سے نکالے، ظاہر ہے کہ ہر دور کے حوادث میں نوعی طور پر یکسانیت ہوتی ہے گو حادثوں کی شکلیں حسبِ زمان و مکان کچھ جدا جدا بھی ہوں اس لئے وہی جزئیات آج کے حوادث میں بھی بیکار ثابت نہیں ہوسکتیں، اور کچھ نہیں تو آج کی جزئیات کو کم از کم ان پر قیاس تو ضرور ہی کیا جاسکتا ہے، بلکہ بہت ممکن ہے کہ فقہیات میں ایسی جزئیات بکثرت مل جائیں جو آج کے دور میں سابق دور کی طرح کارآمد ثابت ہوں اور حالات کا پورا مقابلہ کرسکیں، ضرورت اگر ہوگی تو باب وار تلاش وجستجو کی ہوگی، بلکہ جزئیات چونکہ فقیہانہ ذہنوں سے نکلی ہوئی ہیں اس لئے بہ نسبت ہماری استخراج کردہ جزئیات کے منہاجِ نبوت سے زیادہ قریب ہوں گی، اس لئے بجائے اس کے کہ ہم اَزسرِنو قواعدِ کلیہ سے جزئیات کا استنباط

کرنے کی مشقت میں پڑیں، یہ زیادہ سہل ہوگا کہ اِستخراج شدہ جزئیات کی تلاش اور ترتیب میں وہ محنت و مشقت استعمال کریں، پھر بھی اگر مفتی کو نئے اِستخراج ہی کی ضرورت داعی ہوتو یہ جزئیاتِ سابقہ ہی اس کا راستہ بہتر طریق پر ہموار کرسکیں گی، بلکہ عین ممکن ہے کہ جب یہ فقہی جزئیات کا ذخیرہ اُصول سے جڑا ہوا سامنے آئے تو شاید ہمیں کسی نئے جزئیہ کے اِستخراج کی ضرورت ہی نہ پیش آئے کیونکہ معلوم ہو چکا ہے کہ فقہائے اُمت نے اُصولِ تفقّہ اور قواعدِ شرعیہ کی روشنی میں بعید سے بعید محتملات تک کے اَحکام مستنبط کرکے جمع کردیئے ہیں جس کے مجموعے سے ایک مستقل فن بنام فقہ تیار ہوگیا، جس میں ہر شعبۂ زندگی کی بے شمار جزئیات موجود ہیں۔

اس لئے فکرِ جدید کی تشکیل میں قواعدِ کلیہ کے ساتھ ان جزئیات کو سامنے رکھنا اَزبس ضروری ہے، یہی وجہ ہے کہ سلف صالحین نے کسی ایک چھوٹے سے چھوٹے دِینی جزئیہ کو بھی کسی مرعوبیت یا اَقوام کے طعن و اِستہزاء کی وجہ سے کبھی ترک کرنا گوارا نہیں کیا۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ایک بار بغداد (عراق) میں کھانا تناول فرما رہے تھے، ایک فارسی غلام کھانا کھلا رہا تھا کہ ان کے ہاتھ سے لقمہ چھوٹ کر زمین پر گر گیا، حضرت سلمانؓ نے اسے فوراً اُٹھا کر اس کی گرد جھاڑی، صاف کیا اور تناول فرمالیا۔ غلام نے عرض کیا کہ یہ ملک متمدنوں، دولت مندوں اور سیر چشموں کا ہے، وہ اس حرکت کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھیں گے۔ فرمایا: ''أَأَتْرُكُ سُنَّةَ حَبِيبِي لِهٰؤُلَاءِ الْحُمَقَاءِ؟'' (کیا میں اپنے حبیبِ پاک کی سنت ان اَحمقوں کی وجہ سے ترک کردوں؟)۔ غور کیا جائے کہ ایک طرف تو دِین کے ایک ایک جزئیہ کی پابندی اور دُوسری طرف ملکوں کی فتوحات، خلافت کی توسیع اور تسخیرِ اقالیم اور اس کے ساتھ متکبروں کا تمسخر وطعن، لیکن جو نشہ ان پاک اَرواح میں فیضانِ نبوّت سے پیوست تھا وہ اس قسم کے عوارض سے کبھی ٹس سے مس نہ ہوتا تھا۔ آخر صحابہؓ سے زیادہ کون سُننِ دِین کی جزوی جزوی پابندی میں پیش قدم تھا، مگر ان سے زیادہ پھر کون اسلامی فتوحات

میں تیز قدم تھا، جس سے ایک طرف تو یہ واضح ہے کہ وقتی اَحوال و حوادث کے پیشِ نظر توسع اور ہمہ گیری کے معنی ذہنی ڈھیلے پن کے نہیں کہ قوموں کی رضاجوئی یا مجبوری یا آج کل کی اصطلاحی رواداری کے تحت اسلامی جزئیات میں مداہنت کی جاسکے، بلکہ یہ معنی ہیں کہ اسلام نے اُصول اس درجہ وسیع اور لچک دار رکھے ہیں کہ حوادث ان سے باہر نہیں جاسکتے، جس کے معنی یہ ہیں کہ دِین اپنے خاص مزاج اور اساسی پالیسی کے تحت نہ حوادث میں کبھی تہی دامن ثابت ہوا اور اس نے کہیں اپنے اندر خلا محسوس کر کے سپر ڈالی۔ دُوسری یہ بات بھی اس واقعے سے اور اس جیسے ہزاروں واقعات سے نمایاں ہے کہ اسلام روکھی اور سطحی قسم کا کوئی رسمی قانون نہیں بلکہ دِین ہے جس کی اساس کا بنیادی عنصر عشق و محبت ہے، جو ذاتِ حق، ذاتِ نبوی اور ذواتِ صحابہؓ سے وابستہ ہے، اس لئے ایک سچا عاشق اپنے محبوب کی کسی اَدا کو ایک آن کے لئے بھی نظرانداز نہیں کرسکتا، جیسا کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے یہاں ''حبیبی'' کا لفظ استعمال فرماکر اس محبت کی طرف اشارہ فرمادیا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر کسی جزئیہ کے ترک کرنے میں کوئی قانونی گنجائش بھی نکلتی ہو تو قانونِ عشق میں ایسی گنجائش کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے اسلامی مزاج میں یہ عشقی کیفیات بھی اسی طرح گھلی ہوئی ہیں جیسے پانی میں شکر گھل جاتی ہے، جو ایک راسخ العقیدہ مسلم کو ہر ہر جزئیہ کا پابند کئے رہتی ہیں اور اس سے ایک اِنچ بھی نہیں ٹل سکتا، اس لئے تشکیلِ نو کے وقت اسلام کی اس خصوصیت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

اسلام میں آزادیٔ ضمیر اور حریتِ رائے کی حدود

لیکن اس انتہائی پابندی اور قید و بند کے ساتھ ہی آزادیٔ ضمیر اور حریتِ رائے بھی پوری فراخی کے ساتھ اسلام نے قوم کو بخشی ہے کہ ایک عامی سے عامی آدمی بھی اس قانونِ حق کے معیار سے مسلمانوں کے بڑے بڑے سربراہ پر روک ٹوک

عائد کرسکتا ہے اور اُسے عوام کی تنقید کو ماننے سے چارۂ کار نہیں ہوتا، اس کے لئے سب سے بڑی نظیر نماز کی جماعت ہے جس کا نام امامتِ صغریٰ ہے، جو کلیۃً اِمامتِ کبریٰ یعنی امامت و خلافت پر منطبق ہے، وہاں اگر اِمام اور اَمیر ہے تو یہاں بھی امام ہے، وہاں اگر جہاد میں ہر نقل وحرکت پر نعرۂ تکبیر ہے تو یہاں بھی ہے، وہاں اگر امام کے حق میں سمع و طاعت فرض ہے تو یہاں بھی ہے، وہاں اگر مجاہدین کی صفیں مرتب اور سیدھی ہونی ضروری ہیں تو یہاں بھی یہی ہے، وہاں اگر میمنہ اور میسرہ ہے تو یہاں بھی ہے، وہاں اگر صفوف میں شگاف آجانا ناکامی کی علامت ہے تو یہاں بھی ہے وغیرہ وغیرہ، اس لئے امامتِ صغریٰ (جماعتِ صلوٰۃ) کے جو طور طریق رکھے گئے ہیں وہی نوعی طور پر امامتِ کبریٰ اور اِسٹیٹ میں بھی ہیں۔ اس صورتِ حال کے تحت دیکھا جائے تو نماز کے مقتدی اس سے ذرا بھی منحرف ہوں تو ان کی نماز ہی صحیح نہیں ہوسکتی، چنانچہ اس مسجد کی اِمارت اور اِسٹیٹ میں مقتدیوں پر فرض ہے کہ جب امام نیت باندھے تو مقتدی بھی ساتھ ساتھ نیت کرکے ہاتھ باندھیں، وہ قیام میں ہو تو یہ بھی قیام کریں، وہ رُکوع کرے تو یہ بھی رُکوع کریں، وہ سجدے میں جائے تو یہ بھی سربسجود ہوجائیں، وہ ''وَلَا الضَّآلِّیْنَ'' کہے تو یہ ''آمین'' کہیں، حتیٰ کہ اگر امام سے سہواً کوئی جزوی غلطی بھی سرزد ہوجائے اور وہ سجدۂ سہو کرے تو مقتدی بھی اس کی اس فکری خطا میں ساتھ دیں اور سجدۂ سہو کریں۔

لیکن حریت و آزادی یہ ہے کہ اگر اِمام قراءت یا اَفعالِ صلوٰۃ میں کوئی ادنیٰ سی بھی غلطی کرجائے تو ہر مقتدی کو نہ صرف ٹوک دینے کا حق ہے بلکہ مقتدی اس وقت تک اِمام کو چلنے نہیں دے سکتا جب تک وہ اپنی غلطی کی اصلاح نہ کرلے یا قراءت صحیح نہ کرلے، یا کسی رُکن میں غلطی ہوجائے اور اُسے دُرست نہ کرلے، چنانچہ اِمام کی غلطی پر ہر ایک مقتدی پیچھے سے تکبیر و تسبیح کی آوازوں سے اس طرح متنبہ کرتا ہے اور کرنے کا حق رکھتا ہے کہ اِمام غلطی کی اصلاح پر مجبور ہوجائے۔

بعینہٖ یہی صورت اِمامتِ کبریٰ یعنی اسٹیٹ اور ریاست کی بھی ہے کہ امیر المؤمنین کی سمع و طاعت تو ہر ہر معاملے میں واجب ہے، ورنہ تعزیر و سزا کا مستحق ہوگا، لیکن ساتھ ہی خود اَمیر کی کسی خطا و لغزش پر ایک عامی سے عامی آدمی بھی برملا روک ٹوک کرنے کا حق رکھتا ہے، جب تک کہ اَمیر اس فعل کی اصلاح نہ کرلے یا اس کا کوئی عذر سامنے نہ رکھے۔

فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ پر ایک اَعرابی نے اس وقت اعتراض کیا جبکہ وہ بحیثیت امیر المؤمنین منبر پر کھڑے ہوکر خطبے میں اعلان فرما رہے تھے کہ: ''لوگو! اَمیر کی بات سنو اور اِطاعت کرو'' اَعرابی نے کہا کہ ہم نہ بات سنیں گے نہ اِطاعت کریں گے، فرمایا: کیوں؟ کہا: مالِ غنیمت میں آپ کا حصہ عام لوگوں کی طرح صرف ایک چادر تھی حالانکہ آپ کے بدن پر اس وقت دو چادریں پڑی ہوئی ہیں۔ فرمایا: اس کا جواب میرا بیٹا (عبداللہ بن عمرؓ) دے گا۔ صاحبزادہ نے فرمایا کہ امیر المؤمنین کا قد لانبا تھا ایک چادر کافی نہ تھی، اس لئے میں نے اپنی چادر پیش کردی، وہی ان کے بدن پر ہے جو انہوں نے آج استعمال کی ہے۔ تب اَعرابی نے کہا کہ اب ہم بات سنیں گے بھی اور اِطاعت بھی کریں گے۔

بہرحال منہاجِ نبوّت کے مزاج کی رُو سے عمل میں تو یہ تقید اور پابندی ہے کہ اس کے کسی کلیہ جزئیہ میں ڈھیلاپن گوارا نہیں کیا گیا، حتیٰ کہ ایک عامی آدمی کو بھی امیر المؤمنین تک پر کسی محسوس قسم کی فروگزاشت کے بارے میں اعتراض کا حق دیا گیا، لیکن حریتِ رائے اور اُصول کے تحت آزادی بھی انتہائی ہے جو حقیقی قسم کی جمہوریت کی پردہ دار ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اُصول وقوانین کی یہ پابندی اور ان میں زندگی کو مقید کردینا کوئی قید و بند نہیں جو ذہنوں پر شاق ہو، جبکہ ان ہی اُصولوں کی پابندی سے اسلام اور اسلامی قوم عالمگیر بنی۔

اسلام اور اسلامی اُصول کی عالمگیری پر واقعات حقیقت کے شواہد

آخر جب ہم اسلام کے حق میں ایک عالمگیر دِین کے مدعی ہیں تو اس ہمہ گیری کے معنیٰ ان کے انہی اُصولوں کی ہمہ گیری کے تو ہیں، اگر وہ تنگ اور جامد ہوتے تو اسلام عالمگیر تو کیا عرب گیر بھی نہ ہوسکتا، لیکن جب انہی اُصول پر صدیوں ہمہ گیر حکومتیں بھی چلیں اور انہی اُصول سے تربیت پا کر قوم میں عظیم عظیم شخصیتیں بھی اُبھریں جنھوں نے مشرق و مغرب کو روشنی دِکھائی اور ظلمتوں کی تنگنائیوں میں پھنسی ہوئی قوموں، نسلوں اور وطنوں کو ان کی مصنوعی حد بندیوں سے نکال کر انسانیت کے وسیع میدانوں میں پہنچایا تو کیا یہ اُصول کی تنگیوں سے ممکن تھا۔ اس لئے فطری اُصول اور فطرت کی پابندی کو قید و بند اور تنگی سمجھا جانا ذہنوں کی تنگی کی علامت ہوسکتا ہے، فطرت کی تنگی نہیں کہلایا جاسکتا۔ بالخصوص جبکہ ان اُصولوں کی وسعتوں میں ایسی گنجائش بھی رکھی گئی ہے کہ ان سے ہر دور کے مفکر اور اہلِ علم و فضل نے اِستخراجِ مسائل کی حد تک بھی کام لیا ہے اور آج بھی لے سکتے ہیں، جن میں ہر دور کے حوادث کے لئے ہدایت کا سامان موجود ہے۔

اس لئے تمدن و معاشرت کی مشخص عملی جزئیات اور سننِ زائدہ پر اس قانونِ فطرت نے زیادہ زور نہیں دیا بلکہ اس کو وقت اور زمانے کے حوالے کردیا ہے، ہر زمانے میں جو نئی نئی صورتیں بدلتی رہتی ہیں، انہیں اہلِ علم ان کے اُصول سے وابستہ کرکے اُن کے اَحکام نکال سکتے ہیں، جیسا کہ مفکرانِ بابِ فتویٰ کا اُسوہ اس بارے میں سامنے ہے، بالخصوص مسائل کے طرزِ استدلال کے بارے میں تو خاص طور پر ہر قرنِ جدید کے رنگ پیدا ہوتے رہے ہیں، ایک دور میں نظری فلسفے نے رنگ جمایا اور دِین کے بارے میں محض نقل و روایت لوگوں کے لئے تسلی بخش نہ رہی جب تک وہ عقلی چولے میں نہ آئے، تو رازیؒ و غزالیؒ جیسے حکمائے ملت نے دِین کو فلسفیانہ انداز میں

پیش کر کے لوگوں پر حجت تمام کی۔ ایک دور میں تصوف اور حقائق پسندی کا غلبہ ہوا تو ابنِ عربیؒ وغیرہ نے صوفیانہ اور عارفانہ انداز سے اسلام کو نمایاں کیا۔ ایک دور میں معاشی فلسفے کا زور ہوا تو شاہ ولی اللہؒ جیسے حکیمِ اُمت نے نظری و معاشی رنگ کے فلسفیانہ دلائل سے اسلام کو سمجھایا، اور وقت کے مسائل حل کئے، ایک دور سائنسی اور مشاہداتی فلسفے کا آیا تو بانیٔ دارالعلوم (دیوبند) حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ جیسے محقق اور عارف باللہ نے اسلامی عقائد و اُصول کو شوہداتی رنگ میں حسّی شواہد و نظائر پیش کر کے اِتمامِ حجت فرمادیا، جس سے ایک طرف اسلام کی ہمہ گیری اور جامعیت واضح ہوئی تو دُوسری طرف اس کا توسع کھلا اور اس کے رنگِ اِستدلال کی یہ لچک بھی واضح ہوئی کہ اس کے حقائق پر ہمہ نوع دلائل کا لباس سج جاتا ہے اور حقیقت بدستور حقیقت رہتی ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ خود اس میں یہ سارے اَلوان اور سارے نہج موجود ہیں جس سے ہر رنگ کا لباس زیب زدہ ثابت ہوجاتا ہے جو درحقیقت خود اس کا رنگ ہوتا ہے البتہ حالات اور وقت کے تقاضے صرف اُجاگر کردیتے ہیں۔

دورِ جدید کی عملی و نظریاتی خصوصیات اور اسلامی قوّت و شکوت

آج کا دور سیاسی اور معاشی اور مختلف نظریات کی سیاستیو اور معاشی فلسفوں کے غلبے کا ہے، مذہب بن رہے ہیں تو سیاسی معاشی، پارٹیاں بن رہی ہیں تو سیاسی، مسائل پیدا ہورہے ہیں تو ان حالات میں جب تک کسی دِینی مسئلے کو سیاسی چاشنی کے ساتھ پیش نہ کیا جائے عوام کے لئے قابلِ التفات نہیں ہوتا، اس لئے ضرورت ہے کہ ان مسائل کو حل کرنے کے لئے اسلام کو سیاسی اور معاشی رنگ کے دلائل سے پیش کیا جائے، یہ سیاسی رنگ اسلام کے حق میں کوئی بیرونی رنگ نہ ہوگا، بلکہ اسی کے اندر کا ہوگا، حالات متحرک ہوں گے اور ان کے فطری اور طبعی قسم کے معاشی اور سیاسی پیکر اس تحریک سے نمایاں ہوکر اسلام ہی کی سیاست و اجتماعیت کے اُصول و قوانین نہ

ہوتے تو صدیوں تک اس کی وہ مثالی حکومتیں دُنیا میں نہ چل سکتیں جنھوں نے دِین کے ساتھ سیاسی حکمرانی کے فرائض بھی انجام دیئے، آج بھی مسلم حکمرانوں کی بود و نمود اِسی دور کی مستحکم فرمانروائیوں کے ثمرات ہیں جن میں کتاب وسنت اور تفقہ فی الدین کے انوار شامل تھے، البتہ آج کے غالب یا مغلوب مسلمانوں کی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے موجودہ دور کی حکومتوں کے نظریات تو اختیار کر لئے، لیکن ان کے عملی کارناموں سے کوئی سبق نہیں لیا، اگر قوم اپنے نظریات قائم رکھ کر آج کے عملی میدانوں میں دوڑتی تو آج بھی وہ ایسی ہی امثالی قوت و شوکت دِکھلا سکتی تھی جو اَب سے پہلے دِکھلا چکی ہے اور دُنیا اس کی تقلید پر مجبور ہوتی، نہ کہ قصہ برعکس ہو جاتا۔

دورِ جدید میں دِینی مزاج کے مطابق فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید کا واحد طریقِ عمل

بہرحال اس دور میں اس کی شدید ضرورت ہے کہ اسلامی اُصول، اسلامی مزاج اور نبوّت کا منہاج بجنسہٖ قائم رکھ کر جس میں دیانت و سیاست اور عبادت و مدنیت بیک وقت جمع ہے، وقت کے مسائل کی نئی تشکیل ترتیب سے نمایاں کر کے نئے حوادث میں قوم کی مشکلات کا حل پیش کیا جائے، تو یہ وقت کے تقاضوں کی تکمیل ہوگی جبکہ اس میں فقیہ المزاج شخصیات، اسلامی اُصول کی روشنی اور جزئیاتِ عملیّہ کی رعایت، اسلامی مزاج کی برقراری، سلفِ صالحین کا اُسوہ، مراداتِ خداوندی کے ساتھ تقید، رضاءِ حق کی پاسداری، اجتماعی اصلاح و فلاح، اُخروی نجات کا فکر وغیرہ کی حدود قائم رکھی جائیں گی تو بلاشبہ ''فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید'' دِینی ہی رنگ کے ساتھ منظرِ عام پر آ جائے گی، مگر اسی کے ساتھ ان منتخب شخصیات میں جہاں اس دِینی فکر اور تفقہ مزاجی کی ضرورت ہے جس کی تفصیل عرض کی گئی، وہیں اس کی بھی شدید ضرورت ہے کہ موجود دُنیا کے مزاج اور وقت کو بھی پہچانتے ہوں، عصری حالات اور وقت کی

ضروریات بھی ان کے سامنے ہوں، علومِ عصریہ میں انہیں مہارت و حذاقت میسر ہو، دُنیا کی عام رفتار اور آج کے ذہن کو بھی وہ سمجھے ہوئے ہوں اور اس میں ذی فہم اور ذی رائے بھی ہوں، کیونکہ حالات ہی اصل محرکِ فتاویٰ ہیں، اگر یہ منتخب شخصیات شرعیات کی خوگر ہوں لیکن عصریات سے بے خبر ہوں یا برعکس معاملہ ہو تو فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔

اس سلسلے میں کٹھن مرحلہ ایسی جامع شخصیتوں کی فراہمی کا ہے جو شرعیات اور عصریات میں یکساں حذاقت و مہارت کی حامل ہوں، عموماً اور اکثر و بیشتر ماہرینِ شرعیات، عصریات سے کچھ نابلد اور موجودہ دُنیا کی ذہنی رفتار اور اس کے گونا گوں نظریات سے بے خبر ہیں، اور ماہرینِ عصریات اکثر و بیشتر شرعیات سے ناآشنا ہیں، اس لئے فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید کا بار اگر تنہا ایک طبقے پر ڈال دیا جائے، علماء کی حد تک بلاشبہ مسائل کی تشکیل قابلِ وثوق ہوگی لیکن ممکن ہے جدید طبقے کے اعتراضات کا ہدف بن جائے گی، اور دُوسری طرف ماہرینِ عصریات جبکہ عامۂ دِینی مقاصد اور اسلام کے شرعی موقفوں کا زیادہ علم نہیں رکھتے اور قوم کے دِینی مزاج سے کچھ بیگانہ بھی ہیں، اگر فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید کا بار محض انہیں کے کندھوں پر ڈال دیا جائے تو حوادث کی حد تک وہ ماہرینِ شریعت کے اعتراضات کا ہدف بن جائے گی، بہر دو صورت تشکیلِ جدید کا خاکہ ناتمام بلکہ ایک حد تک نقصان دہ ثابت ہوگا۔

ان حالات میں درمیانی صورت یہی ہوسکتی ہے کہ اس تشکیل کے لئے دونوں طبقوں کے مفکرین کی مشترک مگر مختصر اور جامع کمیٹی بنائی جائے، جس میں یہ دونوں طبقے اسلام کے تمدنی، معاشرتی اور سیاسی مسائل میں اپنے اپنے علوم کے دائرے میں غور و فکر اور باہمی بحث و تمحیص سے کسی فکرِ واحد پر پہنچنے کی سعی فرمائیں اور جامع مفکروں کو کتاب و سنت اور فقہ کی روشنی میں مسائل کی تنقیح میں استعمال کریں تو وہ فکر یقیناً جامعیت لئے ہوئے ہوگا، جس میں دِینی ذوق اور شرعی دستور بھی قائم رہے

گا اور عصری حالات سے باہر بھی نہ ہوگا، نیز ایک طبقے کا ہدفِ طعن و ملامت نہ بن سکے گا اور مسائل کے بارے میں کوئی خلجان سدِ راہ نہ ہوگا۔

تشکیلِ جدید کرنے والے مفکرین کے لئے ایک اَمرِ لازم

البتہ مفکرین کو یہ ضرور پیشِ نظر رکھنا ہوگا کہ اسلام کوئی رسمی اور دُنیوی قانون نہیں بلکہ دِین ہے، جس میں دُنیا کے ساتھ آخرت بھی لگی ہوئی ہے، اور ہر عمل میں خواہ وہ فکری ہو یا عملی، جہاں انسان کی دُنیوی زندگی میں شائستگی کی رعایت رکھی گئی ہے اور انہیں تنگی اور ضیق و حرج سے بچا کر ہمہ گیر سہولتیں دی گئی ہیں، وہیں رضائے خداوندی اور آخرت کی جوابدہی بھی ان پر عائد کی گئی ہے، اس لئے اسے محض دُنیوی قوانین اور صرف معاشی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر حوادث کا آلۂ کار بھی بننے دیا گیا ہے، کیونکہ احوال ہمیشہ بدلتے رہیں گے۔ حال کے معنی ہی "ما حال فقد زال" کے ہیں (یعنی جو حال آیا وہ زائل بھی ہوگا)، پس حال تو بدلنے ہی کے لئے بنایا گیا ہے، لیکن اُصولِ فطرت بدلنے کے لئے نہیں لائے گئے ہیں، وہ اپنی جگہ اَٹل ہی رہیں گے، البتہ ان شرعی اُصولوں میں ایسی وسعتیں ضرور رکھی گئی ہیں کہ وہ ہر بدلتی ہوئی حالت میں وقت کے مناسب رہنمائی کرسکیں، اس لئے مفکر کا کام صرف اتنا ہی ہوگا کہ بدلے ہوئے حالات اور نئے حوادث کو سامنے رکھ کر ان جزئیات مسائل کو سامنے لے آئے جو اس حادثے کے بارے میں منہاجِ نبوّت نے اُصولاً یا جزءاً وضع کئے ہیں اور ان پر منطبق کئے ہیں، پس مفکر، دانشور یا مبصر مفتی کا کام حادثہ اور مسئلہ تبدیل کرنا نہیں بلکہ دونوں میں تطبیق دے دینا ہے، نہ حالات سے صَرفِ نظر کرنا ہے، نہ مسائل سے قطعِ نظر کرلینا ہے، اس لئے شریعت نے تمدنی اور معاشرتی احوال کی حد تک زیادہ تر قواعدِ کلیہ ہی سامنے رکھے ہیں، نئی جزئی صورتوں کی تشخیص نہیں کی ہے کہ وہ ہر دور میں نئے نئے رنگ میں نمایاں ہوتی رہتی ہیں۔

سیاسی ''ملل ونحل'' کی تدوین کی ضرورت واہمیت

فی زماننا اسلامی مسائل میں انتشار یا ان کے بارے مین شکوک وشبہات کی بوچھاڑ کا سرچشمہ سب جانتے ہیں کہ مغربی تہذیب وتمدن اور اس سے زیادہ آج کے سیاسی نظریات دِماغوں پر مذہب کے رنگ سے چھائے ہوئے ہیں، آج مسلک اور اِزم بن رہے ہیں تو سیاسی اور معاشی، پارٹیاں بن رہی ہیں تو سیاسی اور معاشی، قوانین تیار ہو رہے ہیں تو سیاسی اور معاشی، حتیٰ کہ عقائد بن رہے ہیں تو وہ بھی سیاسی اور معاشی، چنانچہ سیاسی نظریات کے بارے میں اصطلاح بھی ٹھہرگئی ہے جو مذہب اور دِین کے بارے میں رائج تھی کہ ہم فلاں نظریئے پر یقین رکھتے ہیں یا بالفاظِ دیگر ایمان لاتے ہیں، جو کسی دور میں دِینی عقائد کے لئے استعمال کی جاتی تھی، اس لئے آج ایک سیاسی ''ملل ونحل'' کی تدوین کی بھی اَشد ضرورت ہے، جس میں سیاسی مذاہب کے عقائد و افکار کو تقابلی رنگ سے سامنے رکھ کر اسلام کے اجتماعی مسائل کو دلائل کی روشنی میں پیش کیا جائے، جس کے لئے چند مفکر عالم اور چند گریجویٹوں کی خدمات حاصل کی جائیں، کیونکہ قدیم زمانے کے ''ملل ونحل'' اس دور کے پیدا شدہ مذہبی عقائد اور افکار کے پیشِ نظر مرتب ہوئے تھے، جبکہ دِلوں پر سیاست کے ٹھپّے لگے ہوئے نہیں تھے، اب عصرِ حاضر کے سیاسی عقائد و افکار کو سامنے رکھ کر اسلام کے اجتماعی اور معاشرتی مسائل کو دلائل وشواہد سے سامنے لانے کی ضرورت ہے۔

خوشی ہے کہ جامعہ اسلامیہ نے آج جب فکرِ اسلامی کی تشکیلِ نو کا مسئلہ اُٹھایا ہے تو ممکن ہے کہ اس سیمینار کے ثمر کے طور پر اس سیاسی، معاشرتی اور اجتماعی رنگ کی ''ملل ونحل'' کی مضبوط بنیاد بھی پڑ جائے، حدیث اور فقہی کتب میں معاشرتی، تمدنی اور اجتماعی مسائل کی جو نوعیں ابواب وفصول کے ساتھ جن جن عنوانوں سے پائی جاتی ہیں وہ اپنی جامعیت اور اُصولیت کی وجہ سے اپنے متعلقہ مسائل کی جزئیات پر کلیۃً حاوی

ہیں اور ان میں فقہائے اُمت کے دِل و دِماغ کا نچوڑ سمایا ہوا ہے، اس لئے اگر ان عنوانات کے تحت کام کیا جائے اور آج کے معاشرتی، سیاسی اور تمدنی مسائل کو تقابلی انداز سے سامنے رکھ کر علمی اور فکری سعی کا محوَر بنالیا جائے تو اس میں تمام وقتی مسائل بھی آجائیں گے اور دُوسرے مہم مسائل بھی شامل ہوجانے کی وجہ سے ایک بہترین سیاسی ''ملل ونحل'' تیار ہوجائے گی، جو جامعہ کا ایک یادگار کارنامہ ہوگا۔

اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی توقع رکھنی چاہئے کہ یہ سعی چند زبان زد مسائل مثلاً بینکاری، اِسٹاک ایکسچینج و سودی معاملات یا انشورنس وغیرہ وغیرہ جیسے مالی اور تجارتی مسائل تک ہی محدود نہ رکھی جائے گی، کیونکہ جب فکرِ اسلامی کے بارے میں قدم اُٹھایا جارہا ہے تو وہ بھرپور اُٹھنا چاہئے جس میں اس قسم کے تمام مسائل کا ایک ہی بار فیصلہ کردیا جائے۔

اُمید ہے کہ اس تشکیل کے سامنے آجانے پر یہ شبہ بھی حل ہوجائے گا کہ آیا اسلام میں جمود ہے یا ذہنوں میں جمود ہے، جسے اسلام کی طرف منسوب کردیا ہے، حالانکہ اِسے توڑنے والا خود اسلام ہے جیسا کہ اس نے تیرہ صدیوں میں کتنے ہی جامد ذہن اقوام کا جمود توڑا ہے، اسلام نے اپنے اُصولِ فطرت میں ماننے والوں کو محدود کردیا ہے، جس کے معنی جمود کے سمجھے جارہے ہیں، لیکن فطرت میں محدود رہنا جمود نہیں بلکہ جمود شکن ہے!

(ماہنامہ ''الاشرف'' کراچی جنوری تا ستمبر ۱۹۸۸ء)

اسلام کا نظامِ اُخوّت و مساوات

پس جو قومیں انسانوں کو یک جوہر یا یک اصل نہیں بتلاتیں وہ دُنیا میں کبھی بھی حقیقی جمہوریت کی علم بردار نہیں ہوسکتیں۔ جس کے یہاں انسانوں کا کوئی طبقہ سورج کی اولاد ہو اور کوئی پیروں کی مٹی سے پیدا شدہ ہو، ان کے یہاں اُونچ نیچ ہی نہیں چھوت چھات بھی لازم ہوگی، جن کے یہاں گورے کو کالے پر پیدائشی برتری ہو اور رنگ و رُوپ ان کے یہاں ما بہ الامتیاز ہو، جن کے یہاں انسانوں کی کوئی ایک اصل نہ ہو بلکہ انسان کسی جنگل میں پودوں کی مانند زمین سے اُگ آئے ہوں تو ان کے یہاں باہمی جذب و کشش کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور جب انسانوں میں پیدائشی طور پر اُونچ نیچ، چھوت چھات، برتری اور کہتری، اجنبیت اور علیحدگی بتلائی جائے جو میل ملاپ یا اشتراک و یکسانیت اور مساوات کے پیر جمنے ہی نہ دے تو وہاں عالمگیر جمہوریت کے نام لینے کے کوئی معنی ہی نہ ہوں گے، اور پھر بھی لیا جائے گا تو وہ دُنیا کو دھوکا دہی ہوگا جو کبھی شرمندۂ عمل نہ ہوگا۔ یورپ عالمگیر جمہوریت کا دعوے دار ہے اور اس نے بلاشبہ تمدنی وسائل کو عالمگیر بنا ہی دیا ہے، مگر پھر بھی وہ عملاً اسے چلا نہیں سکتا کیونکہ وہاں کالے گورے کا فرق اور خون و نسب کی جوہری تفریق کا جذبہ موجود ہے، اور وہ کسی ایسے مسلک پر اعتقاد نہیں رکھتا جو ان کی رُوحوں اور دِلوں میں حقیقی عالمگیر اور یکسانیت کا جذبہ پیدا کردے، اس لئے اس کا دعویٰ جمہوریت محض سیاسی مفاد کی حد تک آ کر رُک جاتا ہے اور (زبانوں پر رہ کر) حلق سے نیچے نہیں اُترتا چہ جائیکہ کسی مخلصانہ عمل کی داغ بیل ڈالے، ان کا سب سے بڑا

عملی میدان کالوں کو اپنی سیاست پر نچانا اور دعوائے جمہوریت کر کے انہیں نیچ اور غلام بنائے رہنے کی سعی کرتے رہنا اور اپنے سیاسی منافع کے لئے ان کے جذبات سے کھیلنا بلکہ ان کے سکراتِ موت سے تفریح کرنا ہے اور بس۔

ہاں! حقیقی طور پر وہ مسلک دُنیا کے سارے انسانوں کو ایک پلیٹ فارم پر لاسکتا ہے جو انہیں ایک جوہر بتلا کر ایک ماں باپ کی اولاد بتلائے اور ان میں رشتۂ یگانگت ہی نہیں رشتۂ اُخوت ثابت کر کے ان کے باہمی تفرقوں کو مٹا ڈالے اور نسبی فرقوں کو ختم کردے جو انسانی جہالتوں کی ابتدائی فرقہ واریت ہے اور وہ اسلام کے سوا ہمیں کوئی دُوسرا مسلک نظر نہیں آتا۔

غور کیا جائے تو انسانوں میں یہ رشتۂ یگانگت و اُخوت قائم کر کے اسلام نے مذہب ہی کا نہیں انسانیت کا احترام قائم کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ انسانوں کا کوئی طبقہ کسی حالت میں بھی نجس العین نہیں کہ وہ تو وہ، اس سے چھوئی ہوئی چیز بھی نجس بن جائے، انسان انسان ہے اور انس اس سے کسی حال میں بھی منقطع نہیں ہوسکتا، اس کے افعال میں گندگی آسکتی ہے، اس کے خیالات ناپاک ہوسکتے ہیں مگر خود انسان اور انسانیت کا جوہر نہیں مٹ سکتا، اور اس انسانیت کی حیثیت سے بہرحال وہ واجب الاحترام ہی رہے گا، اس کی انسانیت کبھی گندہ نہ ہوگی۔

اس لئے شریعتِ اسلام میں کسی انسان کا (خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم) پس خوردہ پاک ہوگا، یہ وہی پابنداری ہے اور نفسِ انسانیت کا احترام ہے، ورنہ اگر اس کی ہاتھ لگی خشک یا تر چیز یا اس کا پس خوردہ نجس و ناپاک اور واجب الاحتراز بن جائے تو درحقیقت اس کے اصلی جوہر کی ناپاکی اور انسانیت کے گندہ ہونے کا دعویٰ ہوگا جس سے پھر کوئی انسان بھی پاک نہیں ٹھہر سکتا، حالانکہ یہ دُنیا کی اقوام کے اجماع کے خلاف ہے، کوئی قوم بھی علی الاطلاق تمام انسانوں کو ناپاک نہیں ٹھہراسکتی، یہی وجہ ہے کہ شریعتِ اسلام نے حائضہ کو چھو دینے یا اس کا پس خوردہ استعمال کرنے سے یا اس

کے ساتھ مل کر کھانے پینے کو ممنوع نہیں ٹھہرایا، کیونکہ اس کی یہ ناپاکی حکمی ناپاکی ہے، جو عباداتِ خاصہ کی حد تک مؤثر ہوتی ہے، عورت کو نجس العین نہیں بنادیتی کہ اس کے سایہ سے بھی فرار اختیار کیا جائے، یا جاہل عربوں اور یہودیوں کی طرح اس زمانے میں اس کا کھانا پینا سب الگ تھلگ کردیا جائے اور اسے ایک اچھوت کی حیثیت سے پہلے انسانوں سے کاٹ دیا جائے، کیونکہ یہ براہِ راست انسانیت کی توہین ہے، ظاہر ہے کہ جو مذہب اور مسلک اپنے ابتدائی اقوامِ عالم کو بلحاظ جوہر پاک بتلائے، سب کو یک جوہر کہے، سب میں برادری اور اُخوّت کا رشتہ ثابت کرے، سب میں سے مصنوعی اُونچ نیچ ختم کرکے ان میں یکسانی اور برابری ثابت کرے، ان میں چھوت چھات مٹا کر باہمی میل جول اور معاملات کے راستے ہموار کرے وہ اقوامِ عالم کو ملانے والا کہا جائے گا یا ان میں فرقہ واریت اور کشیدگیاں پیدا کرنے والا سمجھا جائے گا، اور آیا وہ سب کو ایک پلیٹ فارم پر لاسکتا ہے یا وہ جو ان میں چھوت چھات، اُونچ نیچ اور تفاوتِ جوہر کا قائل ہو۔ پس جب بھی دُنیا بین الاقوامیت کی طرف آئے گی اور جب بھی وہ عالمی رشتہ اور عالمی یگانگت کا نصب العین لے کر کھڑی ہوگی تو اس کے لئے چارہ کار نہ ہوگا کہ وہ اسلام کے اس اُصولی یک جوہریت اور یک اصلیت کو مانے اور اس کے ذریعہ سے اقوام میں سے نفرتِ باہمی اور اُونچ نیچ کا خاتمہ کرے، ورنہ بین الاقوامیت تو بجائے خود ہے ایک قومیت کی سطح بھی ہموار نہیں رہ سکے گی، اور ایک ہی قوم میں اتنے تفرقے اور اتنی نفرتیں ہوجائیں گی کہ ان کا ایک پلیٹ فارم، ایک معبد، ایک مدرسہ اور ایک خانقاہ میں جمع ہونا محال ہوجائے گا، جیسا کہ اس قسم کی تنگ دِل اقوام میں اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ آج ہر تعلیم یافتہ اور سمجھ دار خواہ وہ کسی قوم کا بھی ہو، ہمہ گیری اور عالمگیری کی طرف آرہا ہے اور اس کے لئے ہر نوع کی اُونچ نیچ کو ختم کرنے پر آمادہ ہے جو اسلام کی خاص تعلیم ہے اور وہی دُنیا میں اس اُخوّت و مساوات یک

اصلی اور یک جوہری کو لے کر آیا تھا۔

اس اُونچ نیچ کے خاتمے پر پھر بھی اگر فرقہ واریت اور باہمی کشیدگی نظر آتی ہے تو وہ مذہبی لائنوں سے آرہی ہے اور اس لئے ہر ملک کی دُنیا مذہبی لائن کو سیاسیات سے ختم کرنے پر تلی ہوئی ہے، کوئی شبہ نہیں کہ دُنیا کا یہ فعل معقول اور لائقِ تحسین ہے، مگر ان ہی مذاہب کی حد تک جو یقیناً ان کشیدگیوں اور صد انواع فرقہ واریتوں کی تعلیم دیں یا اس کے ذمہ دار ہوں۔

لیکن جو مذہب بنیادی اور اُصولی طور پر مال و دولت اور رسمی منصب و وقار کے تفرقے مٹانے کے لئے ہی آیا ہو، فرقہ واریت ختم کرنے اور رنگ و رُوپ، نسب ونسل، دولت و مال اور رسمی منصب و وقار کے تفرقے مٹانے کے لئے، اور اس نے دُنیا کے سامنے اُصول وہی رکھے ہوں جن کے ہوتے ہوئے فرقہ واریت کے جراثیم پل نہ سکیں تو اس کا کیا قصور ہے کہ اسے بھی ملک و ملت اور ان کے معاملات سے خارج کیا جائے، اور اگر آپ اسے خارج بھی کرتے ہیں تو وہ خارج ہوتا کب ہے؟ آپ فرقہ واریت کے مٹانے کے لئے جو اُصول بھی اختیار کریں گے اور اسے رَدّ کر کے بھی اسے قبول ہی کریں گے۔ اگر آپ اُونچ نیچ مٹائیں گے تو آپ نے عقیدۃً یا عملاً اس کی مخالف کب کی اور اگر آپ اُخوّت و مساوات کا اُصول لا رہے ہیں تو آپ دِل و جان سے اسلام کی مخالفت کب کر رہے ہیں، سوائے اس کے کہ زبان سے مخالفت کر رہے ہیں، جو دِل سے الگ ہو کر بول رہی ہے، تو اس کا اعتبار کیا ہے کہ وہ لائقِ توجہ ہو۔ قولِ محض جس کے ساتھ نہ عقیدہ ہو نہ عمل ہو کب وقت رکھتا ہے کہ اسے مانا جائے، پس آپ اسلام کا نام لینے سے تو ڈرتے ہیں لیکن اس کا کام کرنے سے اور اس کو ماننے سے نہیں ڈرتے، پھر ایسی چیز سے بھاگنے اور ڈرنے سے کیا حاصل ہے جو آپ کا پیچھا نہ چھوڑے اور آپ کہیں بھی بھاگ کر جائیں وہ آپ کا پیچھا کرے اور وہیں جا کر پکڑے، پس کیا اچھا ہو کہ آپ زبان سے بھی اس چیز کے نام سے ڈرنا

چھوڑ دیں جو آپ کے دِلوں اور رُوحوں میں گھس چکی ہے۔

قانونی مساوات

انسانوں میں انسانیت کی یگانگت اور یک جہتی کے بعد اگر تفرقہ پھیل سکتا ہے تو وہ قانونی تفاوت سے کہ ایک قوم کے افراد کو مثلاً ایک عبادت گاہ میں برابری کے ساتھ جمع ہونے کا حق نہ ہو، قومی قانون کی کتاب کو یکساں سب کو پڑھنے کا حق نہ ہو، یکساں سننے کا حق نہ ہو، عبادت گاہیں مخصوص خاندانوں کا حق قرار دے دی جائیں، تعلیم گاہیں مخصوص خاندانوں کی ملکیت ہوں، علم مخصوص قبائل کا ورثہ ہو، جس سے ہر ایک کو مساویانہ انداز سے استفادے کا حق نہ ہو، دسترخوان اور اس کے ظروف عوام و خواص کو یکجا نہ کرسکیں، کچھ آئینی طور پر شدھ ہوں اور کچھ قانوناً نیچ ہوں تو یقیناً ایسی قوم تفرقہ کا شکار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی، زمانۂ جاہلیت میں مشرکینِ عرب میں جہاں نسلی اور نسبی امتیازات تھے، وہیں عباداتی امتیازات بھی تھے، حج کے موقع پر عام لوگ تو عرفات میں وقوف اور قیام کرتے ہیں، لیکن اَشرافِ عرب کا رُتبہ اس سے بالاتر تھا وہ صرف منیٰ تک پہنچ کر رُک جاتے تھے اور ان کی امتیازی شان عوام الناس کی برابری یا ان کے دوش بدوش عبادت گزاری برداشت نہیں کرسکتی تھی، گویا قانونِ مذہب ہی نے ان کو امتیازی حق دے کر ہمیشہ کے لئے عبادت کے دائرے میں انہیں اُونچ اور دُوسروں کو نیچ بنادیا تھا، جیسے نصاریٰ کے یہاں پاپائیت کے اقتدار کے دور میں حدود و قصاص اور تعزیرات چھوٹے لوگوں پر جاری کی جاتی تھیں لیکن بڑے لوگ قانون کی گرفت سے مستثنیٰ تھے، گویا وہ قانون کی رُو سے اُونچ تھے اور دُوسرے نیچ۔ کسی قوم میں ایک طبقہ روپیہ کمانے کے لئے مخصوص تھا اور ایک طبقہ اس سے محروم ہوکر ذلیل خدمات کے لئے وقف تھا، گویا ایک خلقت سرمایہ دار بننے کے لئے، اسی کا نتیجہ تھا کہ ان اقوام میں باہمی تفرقے ہی نہ تھے باہم شدید نفرت تھی، ظلم و تحقیر کے

دروازے کھلے ہوئے تھے اور حرب وضرب باہمی کے جراثیم رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھے، جس سے ایک طبقہ دُوسرے طبقے سے کسی وقت بھی مأمون اور مطمئن نہ رہ سکتا تھا، ایک طبقے کی زندگی اجیرن تھی گویا وہ پیدا ہی اس پستی و دنائت کے لئے کیا گیا ہے، اور ایک طبقہ مگن اور مطمئن تھا گویا وہ مخلوق ہی طمانیت اور بشاشت کے لئے ہوتی ہے۔

اسلام نے اس فرقہ واریت کو نیست و نابود کرنے کا پیغام دُنیا کو دیا جو قانونی اُونچ نیچ سے پیدا ہوتی تھی، مثلاً اس نے کہا کہ علم کسی ایک خاندان کی میراث نہیں بلکہ بلاتفریق خاندان ونسل ضروریاتِ دِین کی حد تک علم کا طلب کرنا ہر مسلم و مسلمہ مرد و عورت پر فرض ہے، اور زائد اَز ضرورت عام فرضِ کفایہ، عبادت گاہوں میں محمود و ایاز برابر ہیں، صفوفِ عبادت میں صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ اور ایک حبشی غلام یکساں ہیں، حدود و قصاص اور تعزیرات میں ایک عام آدمی اور سیّد الرسل، صلی اللہ علیہ وسلم، کی بیٹی برابر ہیں، اگر خدانخواستہ پیغمبر کی بیٹی بھی فعلِ سرقہ کی مرتکب ہو تو اس کے ہاتھ بھی عوام کی طرح کاٹے جانے ضروری ہیں۔ حج میں دو کپڑے کا اِحرام شاہ و گدا کے لئے برابر ہے، خواہ ایک عامی ہو یا سلطان ابنِ سعود ہو، دونوں کے لئے عرفات جانا بھی ناگزیر ہے، اور ایک ہی نوع کے اِحرام میں ملبوس ہوکر وہاں ٹھہرنا بھی لازم ہے، مالِ غنیمت سے اگر ایک چادر کسی عام کا حق ہے تو اتنا ہی امیرالمؤمنین کا بھی حق ہے، ورنہ شبہ پر بھی ایک بدوی فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ پر اعتراض کرسکتا ہے اور امیرالمؤمنین کو جوابدہی لازم ہے، قانونِ اسلام کی نگاہ میں سب کے حقوق برابر ہیں۔ بہرحال فرقہ واریت اور قومی تفریق کی ایک بنیاد نسبی اور نسلی امتیازات تھے تو انہیں بھی اسلام نے ختم کردیا اور ایک دُوسری جڑ قانونی امتیازات تھے، ان کی بھی بیخ کنی کردی۔ آیت عنوان کے پہلے جملے: ''اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ ..... اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللهِ اَتْقٰکُمْ'' (تم میں بڑا وہ ہے جو خدا کے نزدیک پارسا ہو) سے قانونی امتیازات کو ختم کردیا، جس کے معنی

مساوات کے ہیں، یعنی جو اس قانونِ تقویٰ و دِین پر زیادہ چلے گا وہی عنداللہ بڑا ہوگا، جو اس سے ہٹا رہے گا وہ ذلیل رہے گا، جس کا حاصل سب پر قانون کی یکساں پابندی اور سب پر قانون کا یکساں حکمران ہونا نکلتا ہے۔ پس نسبی تفوق اُخوّت سے ختم ہو جاتا ہے اور قانونی تفوق مساوات سے جاتا رہتا ہے، اور اُخوّت و مساواتِ انسانی اسلام ہی کا خاص اُصول ہے۔

(ماہنامہ ''الاشرف'' کراچی مئی ۱۹۹۰ء)

قرآن اور حج
مساوات اور اُخوّتِ انسانی کا عملی مظاہرہ

مساوات اور یک رُخی کو برنگِ عبادت عملی صورت دینے کے لئے حق تعالیٰ نے حج کی عبادت مقرّر فرمائی کہ اس قبلہ پر آکر مشرق و مغرب کی قومیں یکساں انداز سے جمع ہوں تاکہ ان میں سے اُونچ نیچ کے جراثیم ختم ہوں۔

اسی بناء پر شریعتِ اسلام نے اس قبلہ کو اوّل تو سارے انسانوں کا قبلہ قرار دیا، چنانچہ آثار و روایاتِ حدیث سے ثابت ہے کہ کوئی نبی دُنیا میں ایسے نہیں گزرے کہ انہوں نے اس قبلہ کا طواف نہ کیا ہو، اور ظاہر ہے کہ جب سارے انبیاء اس بیتِ خداوندی کی عظمت اور اس سے عشق و محبت کرتے آئے ہیں اور اسے اپنا قبلہ تسلیم کر چکے ہیں تو قدرتی طور پر ان کے ماننے والی قوموں کا قبلہ بھی یہی بیت اللہ ثابت ہوتا ہے۔

پھر قرآن نے بھی یہی بتلایا کہ قبلہ کی وضع دُنیا کے سارے انسانوں کے لئے ہوئی ہے، ارشادِ ربانی ہے:-

اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلۡعٰلَمِیۡنَ۔ (آل عمران:۹۶)

ترجمہ:- سب سے پہلا خدا گھر (کعبہ معظمہ) جو لوگوں کے لئے وضع کیا گیا وہ مکہ میں ہے۔

آیتِ کریمہ میں اوّل تو "وُضِعَ لِلنَّاسِ" کا لفظ لایا گیا، یعنی سارے

انسانوں کے لئے، وُضِعَ لِلْعَرَب یا لِلْعَجَم نہیں فرمایا گیا، جس سے عرب اور بقیہ ساری اقوام کا قبلہ یہی بیتِ کریم ثابت ہوا، پھر اسے ہدایت اور راہنما بتلانے کے لئے ''عَالَمِیْنَ'' کا لفظ استعمال فرمایا کہ وہ جہانوں اور عالموں کے لئے ہدایت ہے، جس سے اس قبلہ کا تمام جہانوں کے لئے عالمی ہدایت کا قبلہ ہونا ثابت ہوا، جس کے معنی اس کے سوا دُوسرے نہیں کہ اطراف و اکنافِ عالم سے تمام اصنافِ بشر اور تمام قومیں اس عالمی رہنمائی کے تحت حج کرنے کے لئے اس کی طرف بڑھیں اور اپنی اجتماعیتِ کبریٰ یا عالمی اجتماعیت کا ثبوت دیں۔

اسی لئے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو جنھیں قرآن نے ''امام الناس'' فرمایا ہے کہ: ''اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا'' اور فرمایا کہ: ''اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ'' لوگوں کے لئے حجِ بیت اللہ کا اعلانِ عام کردیں، تو یہاں بھی دونوں جگہ بلاتخصیصِ عرب و عجم ''الناس'' کا لفظ لایا گیا، یعنی مؤذِّن تو امام الناس بنائے گئے جنھیں بلاتخصیص تقریباً دُنیا کی تمام بڑی قومیں اِمام تسلیم کرتی ہیں، اور اس اعلانِ عام کا مخاطب بھی ''الناس'' ہی کو بنایا گیا، جس میں کسی قوم یا ملک کی تخصیص نہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ سارے انسانو! حج کے لئے چلو، اس لئے اِمام العرب، یا اِمام الشام یا اِمام العراق نہیں بلکہ ''اِمام الناس'' کہا گیا، جنھیں یہود و نصاریٰ بھی اِمام مانتے ہیں اور مسلمان بھی انہیں اپنا اِمام تسلیم کرتے ہیں، مجوس اور فارسی قومیں بھی ''زرتشت'' کے نام سے انہیں اِمام تسلیم کرتی ہیں، اور براہمہ بھی براہیم کو اپنا اِمام مانتے ہیں، غالبًا اسی لئے انہوں نے اپنا لقب ''براہمہ'' رکھا ہے، نیز بقیہ اقوام بھی تبعاً اسی ذیل میں آجاتی ہیں، جو ممکن ہے کہ ناموں کے تفاوت سے وہ بھی ان کی اِمامت کو تسلیم کرتی ہوں۔ غرض اعلانِ حج کے لئے اِمام الناس کو منتخب فرمایا جانا اس کی کھلی لامت ہے کہ حج کا یہ اذنِ عام دُنیا جہان کے سارے انسانوں کے لئے تھا، اور حج کے اس اعلانِ عام کا مخاطب ''الناس'' کو بنایا جانا بھی، جس میں کسی ملک یا قوم کی تخصیص نہیں، اس کی کھلی دلیل

ہے کہ حج کا خطاب دُنیا کے سارے انسانوں کے لئے ہے، جس سے صاف واضح ہے کہ حق تعالیٰ نے اس قبلۂ مقدسہ کو مرکزِ ناس اور مرکزِ عالم بنا کر حج کے لئے اس اردگرد سارے ہی انسانوں کو جمع کرنے کا اِذنِ عام دیا ہے، جس سے حج ایک بین الاقوامی عبادت ثابت ہوجاتا ہے، لیکن اگر اور قومیں اس سے منحرف بھی ہوجائیں اور صرف مسلمان ہی اس کی طرف رُجوع کریں تب بھی وہ بین الاقوامی ہی قبلہ ثابت ہوگا، کیونکہ مسلمان دُنیا کے ہر خطے میں موجود ہیں اور وہ یورپ، ایشیا، افریقہ اور امریکہ سے چل کر نوبت بنوبت حج کے لئے آئیں گے تو اس کی بین الاقوامیت پھر بھی نمایاں رہے گی اور اس میں پہنچ کر حج بین الاقوامی ہی عبادت ثابت ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ حج بروئے قرآن اس دُنیا میں ایک عالمی اجتماع ہے جس میں ساری قومیں یکسانی کے ساتھ حصہ لیتی ہیں، اس لئے ان میں قدرتی طور پر اُخوتِ اسلامی، عالمی مساوات اور عالمی بھائی چارہ اور عالمی خدمت کا جذبہ اُبھرنا ہی چاہئے، پھر ساتھ ہی حج میں صورتوں میں بھی مساوات رکھی گئی ہے، پھر اسی پر قناعت نہیں کی گئی کہ اقوام ہی سب یکساں رہیں بلکہ آنے والے افراد میں بھی باہم یکسانی اور مساوات رُونما ہو، لباس بھی سب کا ایک ہو، وضع بھی ایک ہو اور افعال بھی سب کے ایک اور یکساں ہوں، اُمیر و غریب، بادشاہ و گدا، خواص و عوام، عالم و جاہل، نیک و بد، صالح و طالح، متقی اور فاسق، ایک ہی لباس میں، ایک ہی کفن میں، ننگے سر، ننگے پاؤں، یکساں فقیرانہ انداز سے اس بیتِ کریم کے اردگرد جمع ہوں، اِحرام بندھا ہوا ہو اور یک وضع اور یک رُخ ہوکر اس بیتِ کریم کے اردگرد پروانوں کی طرح چکر کھائیں، طواف کریں، اور اس پر اپنی جاں نثاری کا ثبوت دیں۔

عرفاتؔ کے میدان میں بھی اسی ایک وضع میں خاک بر سر ہوکر اپنے رَبّ کے سامنے گڑگڑائیں اور فریاد کریں، مزدلفہ اور منیٰ میں بھی ایک ہی انداز سے گریہ و زاری میں محو اور مست ہوں، صفا مروہ کی پہاڑیوں کے درمیان بھی اسی ایک اندازِ

گرویدگی اور محویت سے عاشقانہ اور والہانہ دوڑ لگائیں، ایک قافلہ دوسرے قافلے کو دیکھے تو بجائے کسی دُنیوی یا معاشرتی نعرے کے "لبیک لبیک" کا نعرہ بلند کرے، تاکہ باہمی یکسانی کے ساتھ ان کی بندگی میں بھی یکسانی رہے، اور ایک ہی متواضعانہ اور سرفروشانہ انداز سے ایک دُوسرے کے سامنے آئیں، خواہ وہ حکمرانِ ملک اور سربراہانِ ریاست ہوں یا عوام الناس اور پبلک مین ہوں، ظاہر ہے کہ جب اس طرح لاکھوں لاکھ انسانوں کی ایک ہی فقیرانہ وردی، ایک ہی سب کی نقل و حرکت، ایک ہی عمل، ایک ہی مرکز، اور ایک ہی رُخ ہوگا تو کیسے ممکن ہے کہ اس مساویانہ انداز میں ہوکر ان میں اُونچ نیچ کا کوئی تصوّر بھی باقی رہے، دُنیا کی کوئی قوم اس عملی مساوات کا نمونہ دِکھلائے تو سہی کہ ایسی بین الاقوامی مساوات کس میں ہے، اور ظاہر و باطن کی برابری اور ہمواری کا ایسا سچا مظاہرہ کس نے کرکے دِکھلایا ہے، یا دِکھلاسکتی ہے۔

پھر اسی کی ساتھ سب کی پارسائی اور زُہد وقناعت کا یہ عالم کہ گھربار چھوڑے ہوئے، زَر و مال بقدرِ ضرورت ہی لئے ہوئے، نہ رسمی عزّت و جاہ کا تصوّر، نہ کسی پر کسی کو بڑائی کا زعم، نہ کسی میں اُونچ نیچ کا وہم، نہ کسی کی زبان پر کوئی فحش و بے حیائی کا کلمہ، نہ آپس میں جھگڑا اور نزاع، نہ جدال و قتال بلکہ قلبی طور پر ایک دُوسرے کے ساتھ گرویدگی، خدمتِ باہمی کا جذبہ، ایثار وقربانی کا ہمہ وقت تصوّر، اور ہر ایک میں بجائے اُونچ نیچ ہونے کے تواضع اور فروتنی کا غلبہ اور بجائے نیچ ہونے کے غناء وتوکل کا جذبہ، رسمی کرّ وفر اور ٹھاٹھ باٹھ سے کوسوں دُور، سادگی اور بے تکلفی سے مخمور، اسی ایک عبادت میں چور چور، اسی کو پکارنا، اسی ایک سے مانگنا، اور اسی ایک کے آگے جھکنا جو سب کا ایک ہی مرکزِ حقیقی، اصل وجود اور خالق و مالک ہے، اور اسی کے اس بین الاقوامی گھر کے اردگرد گھومنا جو سب کا مرکزِ ظہور، سب کی مادّی اصل اور سب کے لئے مرکزِ کشش ہے۔

دُنیا کی کوئی قوم قلوب کی یہ یکسانی، قوالب کی یہ مساوات، افرادِ انسان کی ی

عالمی موانست، اور اولادِ آدم کی یہ عالمی اُخوّت دِکھلائے تو سہی کہ کہاں ہے، جو اسلام اور مسلم نے اپنے رَبّ سے جڑ کر دِکھلائی، اور نہ خود ہی دِکھلائی بلکہ اسی نے دُنیا کو یہ سبق دیا کہ اُونچ نیچ کا مٹانا نعروں سے نہیں بلکہ عملاً یوں ہوتا ہے، اور کبر وغرور کا سر اس طرح توڑا جاتا ہے۔

اسی توجہ الی اللہ اور یک رُخی کا قدرتی اثر ہے کہ اس لاکھوں لاکھ کے مجمع میں جس میں مرد اور عورت مساوات کے ساتھ ایک جگہ، ایک مقام پر جمع ہوتے ہیں، نہ کہیں فحش کا نشان ہوتا ہے، نہ بے حیائی کا وہم وگمان، نہ معصیت کاری کا کوئی داعیہ، نہ کسی کی حق تلفی کا کوئی جذبہ، دِلوں میں بھی امن وسکون اور باہر بھی امن وسکون، نہ مار دھاڑ ہے، نہ طبقہ وارانہ فساد، نہ نزاع و جدال ہے، نہ قتل وقتال، نگاہوں میں پاکی اور دِلوں میں حق شناسی، اور ساتھ ہی ساتھ عبادت اور اللہ سے وابستگی ؎

یوں بہم کس نے کیے ساغر وسنداں دونوں

عملاً دِکھلا دیا جاتا ہے کہ معاصی اور گناہوں سے کیونکر بچا جاتا ہے، اور انسانی ہمدردی اور مساوات کو عبادت کے ساتھ کس طرح بروئے کار لایا جاتا ہے۔

پھر حج میں یہ عالمی اُخوّت و مساوات محض لفظی یا اخلاقی حد تک محدود نہیں رکھی گئی، بلکہ اس کے ساتھ تعاونِ باہمی، ضرورت مندوں کے لئے مالی اعانت و ہمدردی کا سلسلہ بھی قائم فرمایا گیا ہے، تاکہ یہ اُخوّت و مساوات ہر نہج سے مستحکم ہوتی رہے اور اس حسنِ سلوک اور احسانِ عام سے دُنیا کے ہر خطے کے مسلمان دُوسرے ملک کے مسلمانوں کے ساتھ منّت پذیری اور احسان شناسی کے ساتھ مربوط ہوں، کیونکہ خصوصیت سے اس طویل و عریض سفر میں صرف اُمراء ہی نہیں آتے بلکہ غرباء بھی شامل ہوتے ہیں، بلکہ اکثریت غرباء ہی کی ہوتی ہے، جو اپنے ذوق وشوق سے کسی نہ کسی ضروری حد تک ہی سامانِ سفر مہیا کرکے پہنچ پاتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ ان کے پاس رقم کی قلت ہوجائے اور وہ اپنی بعض واجبی ضروریات بھی پوری نہ کرسکیں اور

تکلیف میں مبتلا ہوجائیں یا ضرورت کی حد تک رقم ہو مگر اچانک کوئی غیر معمولی ضرورت پیش آجائے جو ان کی برداشت سے باہر ہو، جیسے بیماری اور دوا دارو وغیرہ کی پریشانی، یا یہ بھی نہ ہو مال چوری چلا جائے اور وہ غنی ہوتے ہوئے بھی اس سفرِ غربت میں فقیر بن جائیں اور مستحقِ امداد بن جائیں، یا ان میں سے کوئی بھی صورت پیش نہ آئے، وقتی حالات کے لئے تألیفِ قلوب ہی ضروری ہوجائے، ان تمام احوال کے پیشِ نظر حدیثِ نبوی نے یہ کہہ کر ان کی مالی اعانتوں کی ترغیب دی کہ حرمِ محترم میں جو بھی غریبوں پر خرچ کیا جائے گا تو اس کا اجر ایک لاکھ گنا ہوگا، یعنی ایک روپیہ کا صدقہ ایک لاکھ روپے کے صدقہ کے مساوی ہوگا، جس کا حاصل یہ ہے کہ غیرحرم میں جو تزکیۂ نفس یا رذیلہ بخل سے پاکی اور غنائے نفس کا ملکہ ایک لاکھ روپیہ صدقہ دے کر پیدا ہوتا ہے وہ حرمِ محترم میں ایک روپیہ دے کر ہوجائے گا، اور رُوحانی ترقی کے درجات ایک سے ایک لاکھ تک بیک دم پہنچ جائیں گے، سو کون ہوگا کہ اس ترغیب کے بعد اس بہتی ہوئی سبیل میں ہاتھ تر نہ کرے۔ پھر قرآنِ کریم نے حج کی قربانیوں تک میں، جو مناسکِ حج میں سے ہیں، غرباء اور ضرورت مندوں کی رعایت فرمائی اور اس حسنِ سلوک کا سلسلہ بھی عالمی بنادیا، ارشادِ حق ہے:-

فَكُلُوا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ. (الحج:۲۸)

ترجمہ:- (سو ان قربانیوں کے جانوروں میں سے) خود بھی کھاؤ اور مصیبت زدہ محتاج کو بھی کھلاؤ۔

غرض حج میں جیسے عالمی اُخوّت و مساوات رکھی گئی ہے، ویسے ہی مالی تعاون کو بھی بین الاقوامی بنادیا گیا ہے، کیونکہ مصیبت زدہ فقیر میں کسی ملک یا وطن کی تخصیص نہیں فرمائی گئی کہ وہ عرب کے ہوں یا عجم کے، بلکہ دُنیا کے کسی خطے کے بھی ہوں سب اس میں داخل ہیں۔

سوال یہ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص صدقہ و خیرات کا جذبہ بھی رکھتا ہے، اور

غریبوں کی مدد بھی کرنا چاہتا ہے، لیکن نقد رقم اس کے پاس اتنی نہ ہو کہ وہ یہ جذبہ پورا کر سکے، تو قرآنِ حکیم نے اس صورت حال کو سامنے رکھ کر اس کی بھی اجازت دی کہ اگر کوئی مالِ تجارت ساتھ لے جا کر فروخت کر سکے جس سے اپنی اور اپنے دُوسرے بھائیوں کی ضرورتیں پوری ہوتی ہوں تو اس پر کوئی گناہ نہیں، اور نہ اس عبادت میں اس سے کوئی فرق پڑے گا، ارشاد فرمایا گیا:-

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ. (البقرۃ:۱۹۸)

ترجمہ:- (اگر حج میں کچھ اسبابِ تجارت ہمراہ لے جانا مصلحت سمجھو تو) تم کو اس میں بھی ذرا گناہ نہیں (جو تمہاری قسمت میں) تمہارے پروردگار کی طرف سے (لکھا) ہے۔

دُوسری جگہ اِک دُوسرے عنوان سے اسی اجازت کو اس طرح دہرایا گیا ہے کہ اس میں ترغیب دینے کی شان بھی پیدا ہوگئی ہے، جہاں ابراہیم علیہ السلام کو حج کا اعلانِ عام کر دینے کا اَمر فرمایا گیا ہے وہیں یہ بھی ارشادِ حق ہے، فرمایا:-

لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ. (الحج:۲۸)

ترجمہ:- (اس اعلانِ عام سے لوگ پیدل اور دُبلی پتلی اُونٹنیوں پر جو دراز راستوں سے پہنچی ہوں گی چلے آئیں گے) تا کہ وہ اپنے فوائد کے لئے آ موجود ہوں۔

یہاں ''منافع'' کا لفظ عام ہے، جس میں اولیت کے ساتھ حج کے اُخروی منافع جیسے رضائے خداوندی، اَجر و ثواب اور آخرت کی ترقیٔ درجات بھی داخل ہیں، اور ثانویت کے ساتھ دُنیوی منافع جیسے قربانی کا گوشت کھانا اور کھلانا اور تجارت یا صنعت و حرفت یا علاج معالجہ وغیرہ سے مال کمانا بھی شامل ہیں۔

پس قرآنِ حکیم نے جیسے حج کے سلسلے سے عالمی اُخوّت و مساوات کے رشتے قائم فرمائے ویسے ہی عالمی تجارت اور بین الاقوامی انداز سے صنعت و حرفت کے

منافع کا راستہ بھی ہموار فرمادیا تاکہ یہ اُخوّت و مساوات، حسنِ سلوک کی مضبوط بنیادوں پر قائم رہے اور عالمگیر طریق پر امدادِ باہمی اور بقائے باہم کے سلسلے جاری رہیں تاکہ مسلمانوں کے روابط صرف اپنے ہی ملک کے مسلمانوں تک محدود نہ رہ جائیں بلکہ دُنیا کے آخری کناروں تک پہنچیں اور بین الاقوامی بنیں۔

بہرحال حج ایک بین الاقوامی عبادت، بین الاقوامی مساوات، بین الاقوامی اُخوّت اور بین الاقوامی تعاون کا ایک بے مثال اور عظیم المرتبت نمونہ ہے، جس میں مرکز بھی ایک، عمل بھی ایک، فکر بھی ایک، لباس بھی ایک، وضع و ہیئت بھی ایک، رُخ بھی ایک، محبت بھی ایک اور سب کی انسانیت بھی ایک ہوکر سامنے آتی ہے، اور اُونچ نیچ، چھوت چھات، نفرت وحقارتِ باہمی کا بیج تک مارا جاتا ہے، پس جو قومیں آج مساوات اور بھائی چارگی کی لفظی رَٹ لگارہی ہیں، وہ قرآن کے دیئے ہوئے اس نمونۂ مساوات کو سامنے رکھ کر عبرت پکڑیں، ورنہ مساوات اور بھائی چارہ کے نمائشی دعوے زبان پر نہ لائیں۔ وہ صرف مساوات، اُخوّت اور بھائی چارہ کے الفاظ رَٹے ہوئے ہیں اور شاید وہ بھی اسلام ہی کی اس عام پکار اور دعوت کی بدولت کہ: ”کلکم بنو ادم وادم من تراب“ تم سب اولادِ آدم ہو اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے، تم میں نہ کوئی سورج کی اولاد ہے نہ چاند کی، نہ کوئی سونے سے بنا ہوا ہے نہ چاندی سے، نہ کوئی خدا کے منہ سے نکلا ہوا ہے نہ اس کے پیروں سے، بلکہ سب اس مشیت وتخلیق سے ایک ہی جوہر سے اور ایک ہی باپ کی اولاد سے پیدا شدہ ہیں اور آپس میں بھائی بھائی ہیں، اور اسلام ہی کے نعرے کی بدولت کہ: ”ان الناس کلھم اخوۃ“ انسان سارے کے سارے آپس میں بھائی بھائی ہیں، اُخوّت و محبت کے لئے بنائے گئے ہیں، وہ لوگ چاند سورج کی اولاد بن کر انسانوں کو اُخوّت و مساوات کا درس نہیں دے سکتے بلکہ آدمِ خاکی کی اولاد ہوکر اور آدمیوں میں مل کر ہی یہ سبق پڑھا سکتے ہیں، وہ بہت سے خداؤں کے بندے بن کر دُنیا کو یک مرکز پر جمع نہیں کرسکتے، بلکہ ایک اور

صرف ایک واحد و قہار اور بے مثل و یکتا خدا کے بندے بن کر ہی وحدت اور مرکزیت کے نقطے پر لا سکتے ہیں، کیونکہ اسی خدائے واحد و بے ہمتا نے عالمی اُخوّت اور محبت کے لئے دُنیا میں تین مرکز: کلام اللہ، بیت اللہ اور رسول اللہ بھیجے ہیں، جنھیں عالمی مرکزیت دی ہے۔

قرآن کو "ذکری للعلمین" بتلایا، بیت اللہ کو "ھدی للعلمین" فرمایا، اور حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو "رحمۃ للعلمین" کہا۔ قرآن سے عالمگیر ہدایت بصورتِ قانونِ حق پھیلی، بیت اللہ سے عالمگیر اُخوّت و مساوات بصورتِ حج اُبھری، اور نبیٔ خاتم سے عالمگیر رحمت و محبت اور انسانیت بصورتِ عمل سامنے آئی۔

اس لئے جو قومیں بھی صحیح ہدایت، صحیح اُخوّت و مساوات اور صحیح انسانیت انسانوں میں دیکھنا چاہتی ہیں، انہیں ان تین مرکزوں سے چارۂ کار نہیں، اور یہ پاک پونجی انہیں ان ہی تین دروازوں سے مل سکتی ہے، اگر تعصّبات کو چھوڑ کر طلبِ صادق کے ساتھ ان کے سامنے آئیں گے تو بلاشبہ کامیاب واپس ہوں گی، حاصل یہ کہ حج جیسے بین الاقوامی اور اجتماعی رنگ کی عبادت ہے، ویسے ہی عالمی اُخوّت و مساوات اور عالمی امدادِ باہمی کا سرچشمہ بھی ہے۔

قرآنِ حکیم نے اُخوّت و مساوات کا ایک مستقل قانون دیا ہے جس کا ایک اہم پہلو حج کی عبادت میں بھی مضمر تھا، اس لئے موضوع کی رعایت سے اسی پہلو کو اس مختصر خطاب اور اس قلیل وقت میں ظاہر کرنا مقصود تھا، ورنہ حج کے سلسلے میں دینی اور دُنیوی فوائد و منافع کی فہرست اس سے کہیں زیادہ طویل ہے، اتنی نہیں کہ ان چند سطروں میں سما سکے، اس کے لئے دفتر درکار ہیں، و باللہ التوفیق۔

(ماہنامہ "الحق" اکوڑہ خٹک ستمبر ۱۹۷۵ء)

حکمتِ نکاح اور خوشگوار ازدواجی زندگی

سفرِ پاکستان کے دوران یہ تقریر حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم دیوبند نے لاہور کی ایک تقریبِ نکاح میں ارشاد فرمائی۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً. الآية. (الروم:۲۱)

اس آیتِ کریمہ میں نکاح کو اللہ کی آیات میں سے ایک آیت کہا گیا ہے، تو یہ جو فعل ہے نکاح اسے تو رات دِن انسان برتتے رہتے ہیں۔

اس میں نشانی یا آیت ہونے کی کیا بات ہے؟ تو اس بارے میں عرض ہے کہ نکاح میں ایک بات ایسی ہے جو انسان کے بس کی نہیں ہے، محض حق تعالیٰ کی قدرت سے پیدا ہوتی ہے، مرد و عورت دو انسان ہیں، دونوں اجنبی ہیں، ایک کا دُوسرے سے کوئی ربط نہیں اور نکاح سے پہلے ان میں سے کسی کوئی تکلیف ہوئی تو دُوسرے پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا، اس لئے کہ کوئی تعلق نہیں، اور نکاح کے دو حرف پڑھتے ہی ایک دَم قلوب بدل جاتے ہیں، ایک یگانگت اور اُلفت اور ایک تعلق فوری طور پر محسوس ہوجاتا ہے، حتیٰ کہ کوئی اس وقت کہہ دے عورت سے یا مرد سے کہ دُوسرے کو تکلیف ہوئی، تو قلب میں تشویش پیدا ہوجائے گی، یہ رابطۂ قلبی یک دَم قائم کردینا یہ آیتِ خداوندی ہے کہ ایک منٹ پہلے کچھ نہ تھا، ایک منٹ بعد ربطِ باہمی پیدا ہوگیا، اس سے گویا نکاح کی خاصیت معلوم ہوتی ہے، اس کے مقاصد تو جو ہیں سو

ہیں، مگر پہلی خاصیت جو اس پر مرتب ہوتی ہے وہ علاقۂ باہمی اور رابطۂ باہمی ہے، اور ربط بھی اتنے عموم کے ساتھ کہ اس ایک رابطے سے پھر ہزاروں رابطے پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں، اس لئے کہ محض دو نہیں جڑتے بلکہ دو کے ساتھ سینکڑوں جڑ جاتے ہیں، خاوند کے عزیز بیوی کے عزیزوں کے ساتھ مربوط ہوجاتے ہیں، ایک خاندانی علاقہ قائم ہوجاتا ہے، اس واسطے تعلقات کی دو ہی نوعیتیں قرآنِ کریم میں ارشاد ہوئیں، فرمایا:-

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا.

(الفرقان:۵۴)

تعلق دو ہیں، ایک تو ہیں جدّی رشتے اور ایک صہری رشتے جو ازدواجی تعلق سے پیدا ہوجاتے ہیں، تو جیسے ایک میں شاخ در شاخ عزیز ہیں، اَعمام ہیں، چچا تایا کے بھائی ہیں، وہی نوعیت یہاں بھی ہوتی ہے، ساس، سسر اور ان کے عزیز۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رشتہ نکاح کی خاصیت ربطِ باہمی اور عمومِ ربط ہے کہ دو کا نہیں سینکڑوں کا باہمی ربط قائم کردیا گیا، پھر تعلق در تعلق ہوتے ہوئے دُور دُور تک اس کے اثرات پہنچتے ہیں۔

اور چونکہ اسلام کا ایک عظیم الشان مقصد ربط اور اِتحادِ باہمی قائم کرنا ہے، اور یہ ایک عظیم مقصد ہے اسلام کا، اور اس کا ذریعہ ہے نکاح بھی تو شریعتِ اسلام نے نکاح کو بہت اہمیت دی اور اس کی ترغیب بھی دی۔ چنانچہ انبیائے کرام علیہم السلام کا مقصد ٹوٹے ہوئے دِلوں کو جوڑنا ہے، یعنی جو بندے خدا سے ٹوٹ گئے انہیں اللہ سے جوڑنا، اور جو بندے باہمی ٹوٹ گئے انہیں آپس میں جوڑنا، تعلق مع الخالق اور تعلق مع الخلق دونوں رشتوں کو مضبوط کرنا اور صحیح اُصول پر قائم کرنا یہ اسلام کا ایک عظیم مقصد ہے، اور نکاح اس کا ذریعہ ہے، تو انبیاء علیہم السلام کو نکاح عزیز ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

النکاح من سنتی فمن رغب عن سنتی فلیس منی.

ترجمہ:- نکاح میرا طریقہ ہے جو اس سے گریز کرے گا وہ مجھ میں سے نہیں۔

ایک تو ہے مجبوری سے نکاح نہ کرنا کہ حالات سازگار نہیں ہیں، اور ایک گریز اور اعراض کہ معاذ اللہ اس کو فضول سمجھے، فرمایا کہ وہ میری جماعت میں شامل نہیں، تو اسے اپنی سنت قرار دیا ہے، سنتِ مرسلین ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے یہ سنت چلی تو مستمراً تمام انبیاء علیہم السلام میں ہوتی آئی، اس لئے فرمایا کہ یہ میری سنت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تعلق کو مضبوط رکھنے کی سعی بھی فرمائی، اور یہی وجہ ہے کہ نکاح توڑنے والی چیز ہے طلاق، تو طلاق کو فرمایا گیا کہ:-

أبغض المباحات عند الله الطلاق.

جائز چیزوں میں سے جس چیز سے اللہ کو سب سے زیادہ بغض ہے وہ طلاق ہے، اس لئے کہ وہ اس رشتے کو توڑتی ہے۔ جائز تو اس لئے کہ بعض حالات مجبوری کے پیش آئے، مگر اس کے باوجود سب سے زیادہ بغض اس کے ساتھ ہے، اس لئے کہ یہ ذریعہ ہے قطعِ نکاح کا اور یہ ذریعہ بنتا ہے قطعِ تعلقات کا، اس سے انتشار پھیلتا ہے قوم میں، خاندانوں میں، اس واسطے اسے مبغوض قرار دیا گیا۔ انبیاء کے ہاں اتحاد کی طرح وسائلِ اتحاد بھی عزیز ہیں کہ کسی طرح باقی رہیں، اس کے بالمقابل شیاطین کا مقصد ہے دُنیا میں عداوت، انتشار اور تفریق پیدا کرنا، اس تعلق میں فرق پڑے تو یہ شیاطین کی انتہائی خوشنودی کا ذریعہ بنتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ شیطان روزانہ اپنا تخت سمندر پر بچھاتا ہے، اور اس لئے کہ مشابہت پیدا کرے حق تعالیٰ سے کہ اس کا عرش پانی پر ہے، اس کے لشکرِ شیاطین ورغلانے والے آ آ کر اسے رپورٹ دیتے ہیں، تو ایک آتا ہے کہ میں نے فلاں سے جھوٹ کہلوا دیا، تو شیطان کہتا ہے کہ بڑا کام کیا تو نے مگر کوئی اتنی بڑی بات نہیں کی۔ ایک آکر کہتا ہے کہ چوری کروائی، غرض گناہوں کی فہرستیں دیتے ہیں مگر وہ کہتا ہے: بہتر ہے، مگر قابلِ انعام

بات نہیں، پھر آ کر کہتا ہے کہ میں نے خاوند اور بیوی میں لڑائی کروادی، تو یہ اُٹھ کر اس سے لپٹ جاتا ہے کہ تو ہے میرا سپوت۔ اس لئے کہ اس سے جتنا عداوت اور ربطِ باہمی کا توڑ پیدا ہوتا ہے، اور کاموں سے اتنا نہیں، اوّل تو دو آدمی ٹوٹتے ہیں، وہ ٹوٹے تو پھر دونوں کے عزیز بھی باہم ٹوٹتے ہیں، اگر بااثر ہوں تو دونوں کے زیرِ اثر بستی کے دو ٹکڑے ہوجاتے ہیں، اور زیادہ بااثر ہیں بادشاہ اور بیگم شاہ ہیں تو لڑائی دونوں فوجوں میں جڑ جائے گی، ملکوں میں انتشار پیدا ہوگا۔

غرض یہ چیز انتشار، نااتفاقی اور ٹوٹ پھوٹ کا ذریعہ بنتی ہے، اس کے ساتھ پھر سینکڑوں گناہ سرزد ہونے لگتے ہیں، غیبتیں الگ، چغل خوری الگ، جھوٹ الگ، مقدمہ بازی الگ، تہمت طرازی الگ، ایک گناہ میں سینکڑوں گناہ چھپے ہوئے ہیں، اس لئے شیطان اسے لپٹ جاتا ہے کہ تو نے بڑا کام کیا۔ ادھر انبیاء کا مقصد یہ ہے کہ تعلق مضبوط رہے، شیاطین کا یہ کہ ٹوٹ جائے، بالمقابل دو قوتیں ہیں۔

اس واسطے شریعتِ اسلام نے زوجین کو مناسبِ حال ہدایتیں دیں تا کہ رشتہ مضبوط رہے، مرد کو شفقت و کرم کا اَمر کیا کہ لطف و مدارات سے عنایات سے پیش آئے، اور عورت کو حکم اِطاعت کا، تابع داری کا دیا، ارشادِ نبوی ہے:-

ان أكرم المؤمنين أحسنكم أخلاقًا وألطفكم أهلًا.

تم میں سے سب سے زیادہ قابلِ تکریم وہ مسلمان ہے کہ جس کے اخلاق بلند اور پاکیزہ ہوں اور عورتوں بیویوں کے ساتھ مدارات کا برتاؤ کرتا ہو، لطف و کرم کرتا ہو۔ تو مرد کو تو ہدایت دی کہ لطف و کرم کرو، اور یہ عقلاً بھی ضروری ہے کہ عورت اپنے ماں باپ، اپنے عزیزوں سب سے الگ تھلگ ہوکر اس کے پاس آگئی ہے، وہ بھی سخت دِلی کرے تو اس کا ٹھکانہ کہیں نہ ہوگا، اس نے سب کو چھوڑا خاوند کی وجہ سے، خاوند نے چھوڑا بداخلاقی کی وجہ سے، تو اس کا کہیں سہارا باقی نہ رہے گا، اس لئے فرمایا گیا کہ: ''ألطفكم أهلًا'' وہی قابلِ تکریم ہیں عنداللہ جو سب سے زیادہ لطف

وکرم سے پیش آنے والا ہو ازواج کے ساتھ، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواجِ مطہراتؓ کے ساتھ انتہائی لطف وکرم کا برتاؤ فرمایا، قدم بقدم دِلجوئی فرمائی۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آؤ ہم اور تم مل کر دوڑیں اور دیکھیں کون آگے نکلتا ہے۔ دوڑ ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم آگے نکل گئے اور صدیقہؓ پیچھے رہ گئیں، اس کے بعد عمر شریف اخیر ہوئی اور بدن تھوڑا سا بھاری ہوگیا، پھر فرمایا: چلو دوڑیں، اب کے حضرت صدیقہؓ آگے نکل گئیں، بدن چھریرا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ذرا بھاری ہوگئے تھے، تو فرمایا: ”تـــلک بتـــلک“ یہ اُس کے بدلے رہا۔ اب کوئی کہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو بھاگ دوڑ سے کیا تعلق، وہ تو دِین اور رہنمائی سعادت پیدا کرنے کے لئے آتے ہیں، یہ بھاگ دوڑ کیسی؟

اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ جو بے تکلفی حتیٰ کہ لہو ولعب جو نامناسب سمجھی جاتی ہیں، یہاں حتیٰ کہ بعض اوقات حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ایک دسترخوان پر بیٹھے ہیں، آپؓ نے منہ میں لقمہ رکھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چھین کر استعمال فرمایا، حالانکہ وہ زمانہ تھا ایام کا، تو ایک طرف تو ہدایت فرمانی تھی کہ ایام میں عورت ناپاک نہیں ہوتی، حقیقی نہیں حکمی ناپاک ہے، جاہلیت میں اسے ایام میں اَچھوت سمجھا جاتا، اس کا رَدّ کرنا مقصود تھا، اور آپ کو یہ بتلانا تھا کہ منہ بھی ناپاک نہیں، لقمہ بھی کھالیا، تو اس میں بھی ناپاکی نہیں، اور ادھر اس بے تکلفی سے دِل کو موہنا تھا اور دِل پر قبضہ کرنا تھا، تو ایسی چیزیں انجام دیں کہ عورتوں کے ساتھ محبت ومروّت اور اخلاق کا برتاؤ ہو اور عورتوں کو حکم دیا کہ تابعداری اور اطاعت کریں، یہاں تک فرمایا کہ اگر غیراللہ کے لئے سجدہ جائز ہوتا تو میں عورتوں کو حکم دیتا کہ اپنے خاوندوں کو سجدہ کیا کریں، یہ انتہائی تاکید تھی کہ عبادت تو نہیں کرسکتیں لیکن اطاعت اور توقیر جتنی کرسکے وہ کی جاوے۔

تو جس گھر کے اندر ایک طرف سے شفقت ہو دُوسری طرف سے اطاعت ہو تو اس سے بہتر خوشگوار زندگی بھلا کہیں ہوسکتی ہے، اور اگر اس کے برعکس ہو جائے کہ مرد میں سخت گیری ہو اور عورت میں بجائے اطاعت کے سرکشی، بغاوت اور تمرّد ہو، وہ گھر کبھی نہیں پنپ سکتا۔ پھر عورتیں تو ناقص العقل ہوتی ہیں، اس لئے مرد کو بغیر صبر و تحمل کے کوئی صورت نہیں، تو مرد کا فرض ہے کہ تحمل اور داشت و برداشت کا معاملہ کرے، جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہے کہ عورت پسلی سے پیدا ہوئی ہے، حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے، اور پسلی تو خلقۃً ٹیڑھی ہوتی ہے، اگر سختی سے دُرست کرنا چاہے ٹوٹ جائے گی، ویسے چھوڑا تو اور زیادہ مڑ جائے گی، تو اعتدال سے کام لینا ہوگا، کچھ نرمی، کچھ گرمی، محبت بھی، پیار بھی اور کبھی دھمکی بھی دیدی: ''درشتی و نرمی بہم .... الخ۔''

دونوں سے مل کر کام چلتا ہے، جیسے جراح نشتر بھی لگاتا ہے اور مرہم بھی کہ ٹھنڈک پہنچ جائے، اب اگر مرد چاہے کہ عورت میری اتنی عقل مند ہو تو فطرت کے خلاف ہے، بلکہ ایک طرف صبر و تحمل اور شفقت اور دُوسری طرف اطاعت، اور یہ سمجھ کر کہ اللہ نے اسے میرے حصے میں لگایا تو اس کے حقوق کی ادائیگی میرا فرض ہے۔

فرمایا: ''تنکح المرأۃ لمالها ولجمالها ولحسبها ولدینها'' چار وجوہ سے شادی کی جاتی ہے، کہیں تو حسن و جمال کی وجہ سے کہ طبیعت مائل ہے، کبھی مال کی وجہ سے کہ عورت مال دار ہے، تو مال میرے بھی کام آئے گا، کبھی حسب کی وہ سے کہ حیثیتِ عرفی اور خاندان اُونچا ہے، میں بھی شامل ہوں گا تو میں بھی اُونچا ہو جاؤں گا، اور کبھی دِین کی وجہ سے کہ عورت صوم وصلوٰۃ کی پابند ہے، تو فرمایا کہ: ''فاظفر بذات الدین'' ترجیح دو دِینی حیثیت کو اس لئے کہ حسن کو بڑھاپا ختم کردیتا ہے، بیماری ختم کردیتی ہے، مدارِ تعلق یہ تھا، ختم ہوگیا تو تعلق بھی بگڑ جائے گا، وہ کیفیتِ انشراح بھی ختم ہو جائے گی، اسی طرح مال بھی چلتی چھاؤں ہے، ہزاروں امیر غریب ہوتے دیکھے گئے تو اعتبار کی چیز نہیں، مال ختم ہوگیا تو تعلق بگڑے گا، اور حیثیتِ عرفی کی وجہ سے تو

انقلابات میں خاندان اُونچے نیچے اور نیچے اُونچے ہوجاتے ہیں، یہ بھی گھٹتی اور بڑھتی چیز ہے، تو جب مدارِ تعلق خاندان ہوتو ناپائیدار چیز ہوگی، مگر دِین سدا بہار چیز ہے، جب دِین کی وجہ سے تعلق ہوگا تو مرد یہ کہے گا کہ اللہ نے اسے میرے حصے میں رکھا ہے چاہے صاحبِ مال ہے یا غریب، چاہے صاحبِ جمال ہے یا نہیں، چاہے خاندان والی ہے یا نہیں، حیثیت بلند ہے یا نہیں، مگر میرا فرض تو حقوق پورے کرنا ہے، بیوی سمجھے گی کہ خدا نے میرے حصے میں لگایا تو مجھے تو اطاعت کرنی ہے، دِین تو مرتے دَم تک ہے، دوامی چیز ہے، تو اس پر مبنی تعلق بھی دوامی ہوگا، اس لئے فرمایا کہ: "فاظفر بذات الدین" ۔ بہرحال مرد کو حکم دیا گیا کہ تجھے قوام بنایا گیا ہے، تو حکمران کو ہدایت شفقت کی ہوئی، اور محکوم کو کہا گیا کہ تیرا کام اطاعت ہے، اس واسطے نکاح کے سلسلے میں بنیادی چیز ایک جانب شفقت اور دُوسری طرف اطاعت ہے، پھر معیشت منزلِ واقعی جنت بن جاتی ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

(ماہنامہ "الحق" اکوڑہ خٹک مئی ۱۹۷۶ء)

شانِ خلفائے راشدینؓ

فقد روی عن علی رضی اللہ عنه قال: قیل لرسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم: من نؤمر بعدک؟ قال: ان تؤمروا أبابکر رضی اللہ عنه تجدوه أمینا زاهدا فی الدنیا راغبا فی الأخرة وان تؤمروا عمر رضی اللہ عنه تجدوه قویا أمینا لا یخاف فی اللہ لومة لائم وان تؤمروا علیا رضی اللہ عنه ولا أراکم فاعلیه تجدوه هادیا مهدیا یأخذ بکم الصراط المستقیم.

(رواه أحمد، مشکوة باب مناقب العشرة)

ترجمہ:- بہ تحقیق حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی کہ اُنھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا کہ: یا رسول اللہ! آپ کے بعد ہم کسے امیر بنائیں؟ فرمایا کہ: اگر (حضرت) ابوبکرؓ کو اَمیر بناؤ تو تم اُنہیں امین اور دُنیا سے بے رغبت اور اور آخرت کا شائق پاؤ گے، اور (حضرت) عمرؓ کو اَمیر بناؤ تو تم انہیں قوی اور امین پاؤ گے جو خدا تعالیٰ کے معاملے میں کسی ملامت کی پروا کرنے والے نہیں ہیں، اور (حضرت) علیؓ کو اَمیر بناؤ اور میں دیکھتا ہوں کہ تم ایسا کرنے والے نہیں ہو تو تم اُنہیں ہدایت کنندہ اور ہدایت یافتہ پاؤ گے جو تمہیں سیدھے راستے پر چلائیں گے۔

اس حدیث میں بظاہر تو خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کو نام بنام متعین کیا گیا ہے اور اُن کے کمالات و مناقب پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس بلیغ اور معجزانہ انداز سے کہ ان ہی تین شانوں کے ذیل میں مراتبِ خلافت اور دستورِ اِمامت و خلافت کو بھی واضح فرمایا گیا ہے، اور ہر سہ شؤون خلافت کو ترتیب وار ذکر فرما کر خلفائے ثلاثہ کے مراتب کی طرف کھلا اشارہ فرمایا گیا ہے، چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں "زاھدًا فی الدنیا راغبًا فی الاٰخرۃ" فرما کر ان کی شان کمالِ قرب بتلائی گئی ہے، اور ظاہر ہے کہ سب شانوں سے قربِ خداوندی سب سے اعلیٰ درجہ ہے، اور جب قرب ہی نبوّت کی اَساس ہے تو صاحبِ قرب پر گویا نبوّت کی عین تجلّی ہوگی، اور اسے نبی سے متصل اور بلا فصل خلیفہ ہونا چاہئے، اس لئے حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ افضل الخلفاء واوّل الخلفاء ہوئے۔

پھر حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کو قوی اور امین فرما کر ان کی شان کمالِ ہدایت بتلائی گئی ہے، اور ظاہر ہے کہ "ہمت" قرب اور ہدایت کے درمیان ایک برزخی مقام ہے کہ خالق سے کمال لے اور مخلوق کو دے، اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ترتیبِ خلافت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے درمیان لایا گیا ہے، اور مقامِ ہدایت چونکہ ہمت کے بعد کا مقام اور اس کے آثار میں سے ہے، اس لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا آخری خلیفہ ہونا ضروری تھا۔

حدیث پر اِشکال اور اس کا مدلل جواب

حدیث میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کا کوئی ذکر نہیں اور نہ ہی ان کی کسی ممتاز صفت کا ذکر ہے، اور اس کا جواب یہ ہے:-

۱- بقاعدہ بلاغت عدمِ ذکر، ذکرِ عدم کو مستلزم نہیں کہ اگر اس حدیث میں مذکور نہیں تو اسے معدوم مان لیا جائے، کیونکہ اگر اس حدیث میں خلافتِ عثمانی کا ذکر نہیں تو دُوسری حدیثوں میں تو ہے۔

۲- دراصل اس حدیث میں خلافتِ نبوّت کی تین شانیں: قرب، ہمت اور ہدایت کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ میں جو امتیازی شان اور وصفِ خصوصی تھا وہ اَساسی اُصول اِستخلاف میں شامل نہیں بلکہ ان ہی اوصافِ ثلاثہ میں سے بعض اوصاف کا تتمہ ہے، چنانچہ وصفِ عثمانی، وصفِ فاروقی کا تتمہ تھا، اور خلافتِ عثمانی خلافتِ فاروقی کا تکملہ تھی۔

تفصیل اس اِجمال کی یہ ہے کہ کمالِ ہمت کے دو آثار ہیں، ایک شدّت و غضب، دُوسرے حیاء و مروّت، اور یہ ایک وتیرہ طبعی ہے کہ ہمت کے سلسلے میں پہلے شدّت وغضب اپنا کام کرتے ہیں اور اس کی تکمیل پر حیاء و مروّت کا کام آتا ہے اور اپنی کارگزاری دِکھاتا ہے، چنانچہ اَوّلین اثر (شدّت وغضب) پہلے فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ پر ظاہر ہوا اور دُوسرا اثر حیاء و مروّت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ میں نمایاں ہوا، اور اس معنے میں یہ دونوں خلافتیں مل کر ایک خلافت کے ہوجاتی ہیں، گوصورۃً اور عدداً دو تھیں، اس لئے حدیث میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے وصفِ مشترک ''ہمت'' کا ذکر ہوا، گویا خلافتِ عثمانی، خلافتِ فاروقی کا تتمہ تھی۔ چنانچہ فتوحات کا جو سیلاب دورِ فاروقی میں بہنا شروع ہوا وہ دورِ عثمانی میں مکمل ہوا۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ہمت ملاحظہ ہوا کہ جامِ شہادت نوش فرمالیا مگر قمیصِ خلافت نہ اُتاری، یہ عزمِ محکم اور ہمتِ عالی کی شان وہی ہمتِ فاروقی سے ملتی جلتی شان ہے، صرف رنگ کا فرق ہے اس لئے حدیث میں اصل کا ذکر آجانا فرع کے اور اثر کے آجانے کے مترادف ہے یا بسلسلۂ اوصافِ خلافت اصل کو بیان کرکے تکملہ کی ضرورت نہ سمجھی گئی۔

حضراتِ خلفائے راشدینؓ کو بالترتیب خلافت اسی زمانے میں ملی جب اُس کی ضرورت تھی

ذاتِ بابرکات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد متصلاً رنگِ نبوّت کے خوگر

انسانوں کو اگر طلبِ ربانی، قربِ رحمانی اور تربیتِ نفسانی کی جستجو اور تلاش تھی تو ذاتِ صدیقی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے وابستہ کیا گیا جو شانِ قرب کی وجہ سے ذاتِ نبوّت کا عکس لئے ہوئے تھی، اور دورِ صدیقی کے بعد نبوّت کے عینی اور ذاتی رنگ سے بُعد ہوجانے کے سبب فتن کے خطرات اور مہماتِ عظیمہ درپیش تھے تو دامنِ فاروقی کی پناہ دی گئی جو شانِ قوت و ہمت کے سبب شجاعتِ نبوّت کا ظلِ کامل تھے، اور تنفیذِ اَحکامِ دِین میں کسی کی رورعایت یا اندیشۂ ملامت یا کسی خوف وخطر کی پروا کرنے والے نہ تھے۔

اور شدّت وغضب کے سبب قلوب میں ہیبتِ خلافت کا اثر بیٹھ جانے اور سارے گردن کشوں کے مغلوب ہوجانے کے بعد اس کا رَدِّعمل حیاء ومروّت سے ممکن تھا تو پیکرِ حیاء ومروّت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سریر خلافت ہوئے، اور جب حیاء و مروّت کا غلبہ ہوگیا (کیونکہ شروع میں آثار شدّت کی غلبہ حیاء سے تعدیل ہوتی رہی، لیکن زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ شدّتِ فاروقی کے آثار ماضی ہوتے گئے اور حیاءِ عثمان رضی اللہ عنہ خالص ہوتی گئی) تو فتنہ سامان طبیعتیں بے روک ہوکر اُبھرنی شروع ہوئیں، اور جفا پیشہ منظّم لوگوں کے ہاتھوں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہوگئے اور ہدایت کے آسمان پر گھٹائیں چھانے لگیں تو کمالِ ہدایت والے اِمام حضرت علی رضی اللہ عنہ جن کا وصفِ غالب ہی ہدایت اور اِستقامت تھا خلیفہ بنے جو گنجینۂ معارف، خزینۂ علوم وحقائق اور آفتابِ ہدایت تھے۔

حضراتِ خلفائے راشدینؓ کی عملی زندگی میں ان شانوں کا اثر

حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ چونکہ منقطع عن الخلائق یعنی زاہد فی الدنیا اور متصل بالخالق یعنی راغب فی الآخرت تھے اس لئے ان کی نظر بغیر اللہ تعالیٰ کے کسی غیر پر نہ پڑتی تھی اور نہ کسی غیر کی طرف التفات تھا، اس لئے آپ کا تکیہ کلام اُٹھتے بیٹھتے وقت کلمۂ اِخلاص یعنی ''لا اِلٰہ اِلا اللہ'' تھا جو اعلیٰ ترین مقامِ توحید ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نگاہ باطنِ غیر پر پڑتی تھی، مگر اس سے نفیِ عظمت و کمال کے لئے غیر اللہ کو نہایت حقارت سے دیکھتے تھے اور کسی غیر کی ادنیٰ سی عظمت بھی ان کے قلب کو مشغول نہیں کرسکتی تھی، اس لئے آپ کا تکیہ کلام ''اللہ اکبر'' تھا، جو اعلیٰ ترین مقامِ تفرید ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نگاہ غیر پر ضرور پڑتی تھی اور اس کے لئے اِثباتِ کمال سے بھی گریز نہیں تھا، لیکن کمال خالص نہیں بلکہ نقص آمیز، نقص اور سمات نقص سے بریت دیکھتے تو صرف اللہ کے لئے، اس لئے ان کا بکثرت ذکر ''سبحان اللہ'' تھا جو اعلیٰ ترین مقامِ تنزیہ ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نگاہ بلاشبہ غیر پر پڑتی تھی مگر وہ غیر اللہ کے کمال کو نقص آمیز دیکھنے کے بجائے اس کمال کے اصل اور نسبت پر نگاہ رکھ کر اس سے کمالاتِ حق کا مشاہدہ فرماتے جو ہدایت اور اِستقامت کا حاصل ہے، اس لئے آپ کا کلام ''الحمدللہ'' تھا جو اعلیٰ ترین مقامِ تجرید ہے۔

میں ان مقامات اولیہ اور ان حقائق کو جس روایت سے سمجھا ہوں وہ ابنِ عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے ''الریاض النضرة فی مناقب العشرة'' میں اس طرح نقل فرمائی ہے:۔

سئل جعفر الصادق عن الصّحابة فقال: ان أبا بكرٍ الصديق ملئ قلبه بمشاهدة الربوبية وكان لا يشهد مع الله غيره فمن أجل ذٰلک كان أكثر كلامه لا اِلٰه الّا الله، وكان عمر یریٰ كل ما دون الله صغيرًا حقيرًا فی جنب عظمة الله وكان لا يرى التعظيم لغير الله فمن أجل ذٰلک كان أكثر كلامه الله اكبر، وعثمان كان يرى ما دون الله معلولًا اذا كان مرجعه الى الفناء وكان لا يرى

التنـزيه الا لله فمن أجل ذٰلک کان أکثر کلامہٖ سبحان الله، وعلـی بن أبی طالب کان یریٰ ظهور الکون من الله وقیـام الـکـون بـالله ورجـوع الـکـون الی الله فمن أجل ذٰلک کان أکثر کلامہٖ الحمد لله.

اللہ تعالیٰ نے ان چاروں کلمات کو ملا کر ایک مجموعی ذکر بنادیا جس کا لقب کلمۂ تمجید ہے، جو ایک جامعِ توحید و تفرید و تنزیہ و تجرید ہے، یعنی: ''سُبْحَانَ اللهِ وَالْحَمْدُ لِلهِ وَلَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللهُ وَاللهُ أَكْبَرُ'' کوئی شبہ نہیں اس کلمے کی تکرار اور اس کے ذکر کی مشق و عادت ڈال لی جائے تو یقیناً خلفائے اَربعہ کی نسبتوں سے مناسبت پیدا ہوسکتی ہے، اور آدمی ان چاروں مقاماتِ باطن پر فائز ہوسکتا ہے۔ گویا ان چاروں مقاماتِ باطن کے اقطاب یہ خلفائے راشدینؓ ہیں اور بعد کے ان مقامات کو پانے والے لوگ ان کے عیال ہیں، اس طرح خلافتِ راشدہ ان احوال و مقامات کی جامع ہے جو اس کلمے کے ذکر میں پنہاں ہیں۔

حدیث پر ایک اور اِشکال اور اُس کا جواب

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وصفِ خاص کا ذکر فرماتے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وَلَا اَرَاكُمْ فَاعِلِیْنَ'' سے یہ مراد نہیں ہوسکتی کہ تم انہیں سرے سے خلیفہ نہ بناؤ گے، کیونکہ اس طرح یہ قولِ نبوی معاذ اللہ غلط اور خلافِ واقعہ ہوگا، کیونکہ بہرحال حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضراتِ صحابہؓ نے خلیفہ بنایا اور بالاتفاق سب نے تسلیم کیا۔

اس جملے سے خلیفہ بلافصل بھی مراد نہیں ہے، کیونکہ خود حدیثِ نبوی میں ان کی خلافت تیسرے نمبر پر رکھی گئی ہے، جو بالفصل ہونے کی دلیل ہے نہ کہ بلافصل۔

سو اس جملے کا مطلب یہ ہوگا کہ میں نہیں دیکھتا کہ تم تیسرے نمبر پر حضرت

علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بناؤ گے، سو یہ واقعہ بھی ہے کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے انہیں تیسرے نمبر پر خلیفہ نہیں بنایا، اس میں معاذ اللہ ان کی کوئی خود غرضی نہیں تھی، ورنہ کلامِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اس کی خبر ہوتی، پس اب کوئی اِشکال نہ رہا۔

وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ

(ماہنامہ ''الحق'' اکوڑہ خٹک مئی ۱۹۷۸ء)

باتیں دارالعلوم دیوبند کی
اور اکابر کی مجلس میں

حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب مدظلہٗ مہتمم دارالعلوم دیوبند کی پاکستان آمد اور مختصر قیام کی اطلاع ملک بھر کے ابنائے دارالعلوم دیوبند کے شوقِ ملاقات و زیارت میں اضافہ، ملاقات نہ کرسکنے کے افسوس کا موجب بنی ہوگی۔ آیئے ہم آپ کو ان کی ایک مجلس میں لئے چلتے ہیں اور مجلس بھی حکیم الاسلام مدظلہٗ اور شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہٗ کی، جس میں زیادہ تر مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند کے تازہ حالات پر گفتگو ہوئی، اسے ہم ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے من وعن پیش کرتے ہیں۔ (مدیر ''الحق'')

حکیم الاسلام: ویسے تو خوشی کی انتہاء ہوگئی مگر تکلیف بھی ہوئی آپ کی تکلیف فرمانے سے حضرت کی شفقت اور محبت کی بات ہے۔ شیخ الحدیث: آپ کی صحت کیسی ہے؟ حکیم الاسلام: ضعف کافی بڑھ گیا ہے، کچھ عمر کا ضعف ہے، کچھ عوارض بڑھ گئے ہیں، مگر یہ غنیمت ہے کہ کام ابھی تک رُکا نہیں۔ شیخ الحدیث: صاحبزادگان ٹھیک ہیں، ساتھ تشریف نہیں لائے؟ حکیم الاسلام: اسلم کو لانے کا ارادہ تھا، ان کے بچے بھی تیار تھے، مگر اس بار دو چار دن قیام تھا، افریقہ کا سفر بھی درپیش تھا کہ ہمارے مولانا عبیداللہ (جامعہ اشرفیہ) پہنچ گئے، ویزا لائے کہ دس بارہ دن سہی۔ شیخ الحدیث: یہ حضرت مفتی صاحبؒ (مفتی محمد حسنؒ) کی کرامت ہے کہ آپ تشریف لے آئے ہیں۔ افریقہ جانے کا ارادہ ہے؟ حکیم الاسلام: وہ بیچ میں پاسپورٹ ویزا وغیرہ کی وجہ سے لٹک گیا ہے،

اب بیچ میں سفر آ گیا ہے امریکہ کا جہاں کئی مسلم سوسائٹیوں نے دعوت دی، اب تو افریقہ جانا سفرِ امریکہ کے بعد ممکن ہوگا۔ شیخ الحدیث: امریکہ میں مسلمان تو بہت زیادہ ہیں۔ حکیم الاسلام: جی ہاں! میرے کئی عزیز، دو نواسے، ان کے بیوی بچے وغیرہ بھی وہاں ہیں۔ شیخ الحدیث: دارالعلوم (دیوبند) کی حالت تو بہتر ہے؟ حکیم الاسلام: جی ہاں! الحمدللہ تعمیرات بھی جاری ہیں۔ شیخ الحدیث: طلبہ کی تعداد تو زیادہ ہے؟ حکیم الاسلام: جی ہاں! مگر پاکستانی تو کچھ بھی نہیں، نہ اساتذہ میں سے کوئی، مولانا عبدالخالق بھی آ گئے، جناب بھی یہیں آ گئے، مولانا شمس الدین کشمیری بھی (غالباً مولانا محمد شریف مدظلہٗ) یہیں رہ گئے۔ شیخ الحدیث: تعمیر کا سلسلہ بھی جاری ہے؟ حکیم الاسلام: جی ہاں! تعمیر کا سلسلہ برابر جاری ہے، ابھی ایک دارالمدرّسین بنوایا مگر وہ تنگ ہوگیا، بہت سے حضرات رہ گئے، کرایہ پر مکانات دستیاب نہیں ہوتے، پھر دُوسری جگہ باب الظاہر کے بالکل سامنے مغرب کی طرف زمین خریدی گئی، اس میں دس بارہ مدرّسین کے لئے مکان بننے کا اندازہ ہے۔ شیخ الحدیث: دارِخام تو بالکل پختہ ہوگیا ہوگا؟ حکیم الاسلام: ابھی تک تو پختہ نہیں، کچھ مرمت کرائی گئی تھی اس میں بھی رہتے ہیں لوگ۔ شیخ الحدیث: بخاری شریف تو حضرت ہی کے پاس ہے؟ حکیم الاسلام: جی ہاں! نام پر تو میری ہے، مگر سفر اتنے درپیش ہوجاتے ہیں کہ ایک آدھ باب ہی پڑھا سکا ہوں، مولانا رشید احمد خان صاحب جو نائب مہتمم ہیں متقی، صالح، ذی استعداد علماء میں سے ہیں، اب ان کے سپرد کردی ہے، نام تو صدر مدرّس کا مولانا فخرالحسن کا ہے مگر وہ اتنے ضعیف ہوچکے ہیں کہ چلنا پھرنا بھی دُشوار ہے۔ شیخ الحدیث: اور مولانا معراج الحق صاحب؟ حکیم الاسلام: جی ہاں! وہ پڑھا رہے ہیں، مگر عوارض بڑھ گئے، وہ بھی کمزور ہیں۔ شیخ الحدیث: قسمت کی بات تھی کہ پاکستان بننے کی وجہ سے ہم آپ کے قدموں سے دُور ہوگئے، خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اتنی دُوری آجائے گی۔ حکیم الاسلام: جی ہاں! شیخ الحدیث: مولانا اعزاز علی صاحبؒ سے ایک دن میں نے پوچھا

کہ تقسیم ہو بھی جائے تو کیا ہوگا؟ فرمایا: تمہارا کیا خیال ہے؟ میں نے کہا کہ ایسا ہوگا جیسے ایک ضلع سے دُوسرے ضلع میں آیا جایا کرتے ہیں، فرمایا: نہیں! ایسا نہیں ہوگا، پھر ایک دُوسرے کے دیکھنے کے لئے ترسیں گے۔ حکیم الاسلام: جی ہاں! ایسا ہی ہوا، یعنی اب واقعی لندن، امریکہ جانا آسان ہے مگر لاہور آنا مشکل ہے، اس کے باوجود آجا بھی رہے ہیں لوگ۔ شیخ الحدیث: اب تو کچھ اُمیدافزا تعلقات پیدا ہو رہے ہیں۔ حکیم الاسلام: جی ہاں! خدا کرے کہ مسالمت کی صورت ہوجائے۔ شیخ الحدیث: اللہ تعالیٰ آپ کو عافیت عطا فرمائے تاکہ فیض جاری رہے، مجھے کئی امراض لاحق ہیں، بینائی کام نہیں دے رہی، ایک آنکھ کا آپریشن ناکام رہا، اتنا ہے کہ راستہ کچھ نظر آجائے مگر یہ صدمہ ہے کہ درس کا سلسلہ منقطع ہوا۔ حکیم الاسلام: اوہو، اللہ رحم کرے، یہ تو واقعی صدمہ ہے کہ درس منقطع ہوا، مگر بہرحال آپ کا تو وجود بھی غنیمت ہے، اللہ تعالیٰ فیض اور برکت جاری رکھے۔ شیخ الحدیث: یہ سب اللہ کا احسان ہے اور آپ حضرات کی دُعائیں، ورنہ ...... حکیم الاسلام: ہم تو دُعائیں برابر کرتے ہیں، اور تو کسی کام کے ہی نہیں، حضرت مجھ پر تو بہت بوجھ پڑا، آپ کی تشریف آوری سے خوشی بھی بہت ہوئی، مگر اتنی تکلیف فرمائی، میرے لئے تو سعادت ہے مگر ...... شیخ الحدیث: ہمارا فریضہ ہے کہ آپ کا شرفِ نیاز حاصل کریں، بزرگوں میں آپ کو اللہ نے ہر حیثیت سے بزرگی عطا فرمائی ہے، ظاہری معنوی بزرگی، وجاہت، اساتذہ کی دُعائیں، شفقتیں۔ حکیم الاسلام: اب وہاں ویزا ایک یا زیادہ سے زیادہ دو جگہ کا دیتے ہیں، یہاں آئے اور کوئی بنائے تو الگ بات ہے، (اشارہ تھا اکوڑہ خٹک نہ جاسکنے کا، جبکہ عموماً تشریف آوری ہوتی رہتی تھی)۔ حکیم الاسلام: اب کون پڑھا رہے ہیں آپ کی جگہ؟ شیخ الحدیث: فضلاء دیوبند اور سہارنپور کے معمر قابل اساتذہ ہیں اور نوجوان فضلاء بھی ہیں۔ حکیم الاسلام: الحمدللہ کہ کام تو برابر جاری ہے۔ شیخ الحدیث: حضرت! دارالعلوم کی مالی حالت کیسی ہے؟ حکیم الاسلام: الحمدللہ بہتر ہے، مصارف بڑھتے جارہے ہیں، اس

سال کوئی ۲۶ لاکھ کا خرچ ہے، کبھی لوگ پوچھتے ہیں کہ خزانے میں کیا ہوگا؟ کہا: دو تین لاکھ، تو وہ پوچھتے ہیں کہ یہ خرچ پھر کیسے چلے گا؟ میں نے کہا کہ ہم یہ بتا نہیں سکتے کہ کیسے چلے گا، مگر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ضرور چلے گا۔ کہا: یہ کیا؟ اُصول تو کوئی ایسا ہے نہیں، میں نے کہا: اُصول سے بالاتر ہے یہ معاملہ، یہ محض فضلِ خداوندی ہے۔ شیخ الحدیث: حضرت نے یہی ایک دفعہ فرمایا کہ لوگ بجٹ کو آمدنی کے تابع بناتے ہیں مگر ہم ضرورت کو دیکھ کر نہ کہ آمدنی کو، بس پھر خدا مدد کر ہی دیتا ہے۔ حکیم الاسلام: میرے والد ماجد کا زمانہ تھا اہتمام کا تو اس دوران حضرت شیخ الہندؒ نے خواب میں حضرت نانوتویؒ کو دیکھا اور یہ فرمایا کہ احمد سے کہہ دینا کہ وہ ہمارے زمانے کی بات تو نہیں آسکتی اب، لیکن پیسے میں کمی نہیں کوئی فکر نہ کرے۔ یہ خواب جب حضرت شیخ الہندؒ نے میرے والد ماجد کو سنایا تو انہوں نے کہا کہ پھر لائیے پیسے، حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا: یہ تو ان سے مانگئے جنہوں نے وعدہ کیا ہے، میں تو واسطہ ہوں۔ بس یہ ان بزرگوں کی دُعاؤں کا نتیجہ ہے، ورنہ ایسے حالات میں اتنے بڑے مصارف کا پورا ہوجانا سوائے کرامت کے اور کیا کہا جائے۔ شیخ الحدیث: غلّے کا بندوبست ہوجاتا ہے؟ حکیم الاسلام: پہلے تو پنجاب تھا اور یہاں سے ہمیں کم قیمت پر مل جاتا تھا، کچھ ویسے مدد کرتے تھے، یہ راستہ بند ہوگیا، تو یوپی کے حضرات، میرٹھ، مظفرنگر نے غلّہ کی ذمہ داری لی اور بلاقیمت دینے کا وعدہ کیا، صرف لدان ہمارے ذمہ ڈالا، تو اَب وہ اس سے بھی کم میں پورا ہوجاتا ہے، سفراء بھی سفر کرتے ہیں مگر ان کے ذریعہ سے آمدنی دو تین لاکھ ہو بھی جائے تو ۲۶ لاکھ کو پورا کرنا محض فضلِ خداوندی ہے۔ شیخ الحدیث: طلبہ کی تعداد بھی تو اب زیادہ ہوگی؟ حکیم الاسلام: (حضرت حکیم الاسلام فضلاء دارالعلوم کے بارے میں سمجھے تو فرمایا) دستار ملنے والے جن کی وجہ سے یہ صد سالہ جلسہ ہو رہا ہے کی تعداد گیارہ ہزار بنتی ہے، مگر اندازہ ہے کہ پانچ چھ ہزار سے زیادہ نہیں ہوسکیں گے، بہت سے جو گزر گئے، بہت سوں کے پتے ابھی صحیح بھی نہیں

ہوئے، جن لوگوں کے صحیح پتے درج ہوسکے ہیں وہ تقریباً ۶ ہزار کے قریب ہیں اور مختلف ملکوں میں، ہندوستان میں، انڈونیشیا میں، ملائیشیا میں، برما، افریقہ سب جگہوں میں پھیلے ہوئے ہیں، ادھر پاکستان میں تو ہزاروں کی تعداد ہے بحمداللہ۔ شیخ الحدیث: ان سب کے لئے وہاں جلسہ گاہ قیام وغیرہ کا بندوبست جلسے کے موقع پر ہوسکے گا؟ حکیم الاسلام: ایک تو مدعو ہوں گے جن کا دارالعلوم ذمہ دار ہوگا، جن کی تعداد آٹھ دس ہزار رکھی گئی ہے، جس میں فضلاء بھی ہوں گے اور مہمان بھی اور ایک ہوگا اعلانِ عام پر آمد، ان کے لئے اتنا انتظام تو ضرور کرلیا جائے گا کہ وہ رات گزر بسر کرسکیں اور ظاہر ہے کہ ایک پورا شہر بسانا ہوگا خیموں کا، ویسے ہوٹل وغیرہ بھی کھولے جائیں گے۔ شیخ الحدیث: باب الظاہر کی طرف ارادہ ہے؟ حکیم الاسلام: دارالعلوم میں یا اس کے قرب و جوار میں تو اتنی زمین نہیں، لوگوں کا اندازہ ۸۰، ۹۰ ہزار کا ہے، مگر ظاہر ہے کہ کوئی قید آمد پر تو لگائی نہیں جاسکتی، تو اندازہ ہے کہ لاکھوں کی تعداد میں آمد ہو، ہر صوبے میں انتظار ہے، اور ایک ایک آدمی نے ۳۰-۴۰ اوروں کو بھی تیار کر رکھا ہے، تو اتنی جگہ تو ہے نہیں کھلا ہوا میدان چاہئے، تو وہاں کے ہندوؤں نے کہا کہ دیوی کنڈ کے متصل جو میدان ہے وہ بہت مسطح اور بہت دُور تک ہے، کہا کہ اس میں آپ جلسہ کریں، بلکہ یہاں تک کہا کہ ہم سب کے مکانات موجود ہیں، آپ اس میں مہمانوں کو ٹھہرائیں، میرے خیال میں مدعوین کو دارالعلوم کے احاطے میں ٹھہرانے کی سعی ہوگی، پنڈال وغیرہ بھی ہوگا، جو چھوٹا موٹا تو ہوگا نہیں۔ مولانا سمیع الحق: حضرت سب سے مشکل مسئلہ پاکستان والوں کا ہے، ہزاروں لوگ مشتاق ہیں، اس کے لئے بڑی سطح پر بات ہونی چاہئے کہ ویزا وغیرہ بروقت بنایا جاسکے، واضح صورتِ حال سامنے نہیں آرہی، لوگ دریافت کرتے رہتے ہیں۔ حکیم الاسلام: پہلے تو اس سال نومبر کا مہینہ طے تھا مگر اسی مہینے میں ہوگا حج، تو مکہ مکرمہ سے خطوط آئے کہ اس زمانے میں یہاں سے کوئی نہیں جاسکے گا، اور حجاج بھی نہیں آسکیں گے، اور ہزاروں آدمی محروم رہ جائیں گے،

اس لئے اب مارچ ۱۹۷۹ کا مہینہ رکھا ہے، دسمبر میں سردی شدید ہوتی ہے، مارچ میں موسم بھی معتدل ہوجاتا ہے، یہی خیال ہے کہ یہاں ایک کمیٹی بھی بنائی گئی ہے کہ پاسپورٹوں کا بندوبست اُوپر کی سطح پر مل ملاکر کریں مگر بظاہر اتنے ہزاروں افراد کے پاسپورٹ اور ویزے کا مسئلہ ہے، سو دوسو کو تو عرسوں وغیرہ میں دے دیتے ہیں، مگر دس بارہ ہزار آدمیوں کے پاسپورٹ اور ویزے کا مسئلہ مشکل لگ رہا ہے۔ مولانا سمیع الحق: اگر بروقت اقدامات نہ ہوئے تو یہاں کے لوگ محروم رہ جائیں گے، آدھا دیوبند تو ادھر ہے، ایک خیال تو یہ ہے کہ ایک جشن صد سالہ یہاں پاکستان میں منایا جائے۔
حکیم الاسلام: جی ہاں! یہی خیال کچھ اوروں نے بھی ظاہر کیا ہے کہ تین جلسے ہوں، ایک یہاں اور یہاں کے لوگ اس کی ذمہ داری لیں، ایک بنگلہ دیش اور یک بھارت کے لئے دارالعلوم میں۔ مولانا سمیع الحق: لیکن حضرت لوگ تو دارالعلوم جاکر وہاں کی برکات اور وہاں کے در و دیوار کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ حکیم الاسلام: جی اصل تو یہی ہے کہ وہاں کی برکات اور رُوحانیات حاصل ہوسکیں۔ مولانا سمیع الحق: حضرت! کئی علمی اور تصنیفی کاموں میں اور ویسے بھی دارالعلوم دیوبند کے فضلاء کی ایک جامع اور مکمل فہرست نہ ہونے سے مشکلات پیدا ہوجاتی ہیں، ایسی فہرست جس میں تمام فضلاء کے نام اور پتے ہوں۔ حکیم الاسلام: یہ تو کرلیں گے، وہاں تو یہی کیا ہے، کہ جن کے پتے معلوم ہوئے ان کے پاس فارم بھیج دیئے کہ کس زمانے میں اور کیا خدمات انجام دیں؟ تصانیف حدیث میں، تفسیر میں جن کی آئیں وہ تصانیف بھی لاکھوں تک پہنچتی ہیں۔

(ماہنامہ ''الحق'' اکوڑہ خٹک جون ۱۹۷۸ء)

قرآنی سیرت

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

سرکارِ دو عالم فخرِ بنی آدم رسول الثقلین حضرت محمد مصطفیٰ احمدِ مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مقدسہ اپنی ظاہری باطنی وسعتوں اور پہنائیوں کے لحاظ سے کوئی شخصی سیرتِ مقدسہ نہیں بلکہ ایک عالمگیر اور بین الاقوامی سیرت ہے، جو شخصِ واحد کا دستورِ زندگی نہیں بلکہ جہانوں کے لئے ایک مکمل دستورِ حیات ہے۔

قرآنِ حکیم کے مختلف مضامین سے اپنی اپنی نوعیت اور مناسبت کے مطابق سیرت کے مختلف الانواع پہلو ثابت ہوتے ہیں، قرآن کی ذات و صفات کی آیتیں آپؐ کے عقائد ہیں اور اَحکام کی آیتیں آپؐ کے اعمال ہیں، تکوین کی آیتیں آپؐ کا اِستدلال ہیں اور تشریع کی آیتیں آپؐ کا حال، قصص و اَمثال کی آیتیں آپؐ کی عبرت، تذکری کی آیتیں آپؐ کی موعظت، خدمتِ خلق کی آیتیں آپؐ کی رحمت وشفقت ہیں اور کبریائی حق کی آیتیں آپؐ کی عظمت، اخلاق کی آیتیں آپؐ کا حسنِ معیشت ہیں اور معاملات کی آیتیں آپؐ کا حسنِ معاشرت، توجہ الی اللہ آیتیں آپؐ کی خلوَت ہیں اور تربیت خلق اللہ کی آیتیں آپؐ کی جلوَت، قہر اور غلبہ کی آیتیں آپؐ کا جلال ہیں اور مہر و رحمت کی آیتیں آپؐ کا جمال، تجلیاتِ حق کی آیتیں آپؐ کا مشاہدہ ہیں اور ابتغاء وجہ اللہ کی آیتیں آپؐ کا مراقبہ، ترکِ دُنیا کی آیتیں آپؐ کا مجاہدہ ہیں اور احوال ونشر کی آیتیں آپؐ کا محاسبہ، نفئ غیر کی آیتیں آپؐ کی فنائیت ہیں اور اِثباتِ حق کی آیتیں آپؐ کی

بقائیت، اَنا واَنت کی آیتیں آپؐ کا شہود ہیں اور ھُــو کی آیتیں آپؐ کی غیبت، نعیمِ جنت کی آیتیں آپؐ کا شوق ہیں اور جحیمِ نار کی آیتیں آپؐ کا ہم وغم، رحمت کی آیتیں آپؐ کی رجاء ہیں اور عذاب کی آیتیں آپؐ کا خوف، انعام کی آیتیں آپؐ کا سکون و اُنس ہیں اور اِنتقام کی آیتیں آپؐ کا حزن، حدود و جہاد کی آیتیں آپؐ کا بُغض فی اللہ ہیں اور امن وترحم کی آیتیں آپؐ کا حب فی اللہ، نزولِ وحی کی آیتیں آپؐ کا عروج ہیں، تبلیغ وتعلیم کی آیتیں آپؐ کا نزول، تنفیذِ اَوامر کی آیتیں آپؐ کی خلافت ہیں اور خطاب کی آیتیں آپؐ کی عبادت وغیرہ وغیرہ۔

غرض کسی بھی نوع کی آیت لو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی نہ کسی پیغمبرانہ سیرت اور کسی نہ کسی مقامِ نبوّت کی تعبیر ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اس کی تفسیر جس سے عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے اس زرّیں مقولے "وکان خلقه القران" سے قرآن اور ذاتِ اقدس نبوی کی کامل تطبیق اور صدیقۂ پاک کی علمی گہرائیوں اور ذاتی ذکاوتوں کا نشان ملتا ہے۔ اس لئے یہ دعویٰ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ثابت ہوتا ہے کہ اگر قرآن کے علمی عجائبات کبھی ختم نہیں ہوسکتے تو سیرتِ نبوی کے عملی عجائبات بھی کبھی ختم ہونے والے نہیں، اور اگر قرآن عملی طور پر تاقیامت اپنے شاخ در شاخ علوم سے بنی نوعِ انسان کی تکمیل کا ضامن ہے تو یہ سیرتِ جامعہ تا یومِ محشر اپنے شاخ در شاخ عملی اُسووں سے اقوامِ عالم کی تکمیل وتسکین کی کفیل رہے گی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی اور سیرت کے بے شمار عملی نمونے اور اُسوے ہمہ وقت جس رُوح سے زندہ و پائندہ تھے وہ یہی ذکرِ الٰہی، تفویضِ مطلق اور عبادتِ خداوندی کی رُوح تھی، گویا اس کے لئے اس پاک زندگی کا لمبا ڈھانچہ بنایا گیا تھا، کہ اس میں ذِکر وفکر کی رُوح پھونکی جائے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ہر لمحہ ذِکر اللہ سے معمور اور فکرِ آخرت سے بھرپور تھا، ذِکرِ عام کے بارے میں حدیث میں ہے:-

كان يذكر الله علٰى كلّ أحيانه.

ترجمہ:- آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر لمحہ ذِکرِ الٰہی میں لگے رہتے تھے۔

اور فکرِ دائمی کے بارے میں ارشادِ حدیث ہے کہ:-

كان دائم الفكرةِ حزيناً.

ترجمہ:- آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ متفکر اور غمزدہ رہتے تھے۔

پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور زندگی کی سیرت بالاصل نہ ملوکیت تھی نہ ریاست، نہ غلبہ وقہر تھی نہ تسلط و استیلاء، نہ تعیش تھی نہ تزین، نہ آرائش و زیبائش تھی نہ راحت طلبی و آسائش، بلکہ بندگی سرافگندگی، نیازیشی، عبودیت اور اطاعت وعبادت تھی جس میں خوئے ذِکر اور بوئے فکر سمائی ہوئی تھی، اور جو کچھ بھی زندگی یا نقل و حرکت تھی وہ اسی فکرِ دائمی اور ذِکرِ دوامی کے رنگ میں تھی، قرآن نے اس ذِکر وفکر کے مجموعے کو دانائی کہا، گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مقدسہ اُصولاً زندگی کے تین شعبوں پر مبنی ہے: تعلق مع اللہ، تعلق مع الخلق اور تعلق مع النفس۔

تعلق مع النفس کے سلسلے میں پاک دامنی اور پاک نفسی، عفت وعصمت، حیاء وانکسار، غیرت وحمیت، ہمت وشجاعت، صبر وسماحت، علم وضبط، اعتماد وتوکل، زُہد وقناعت، مجاہدہ وریاضت، تحملِ شدائد ومصائب وخدا ترسی وغیرہ کے اعلیٰ ترین ملکات اور اخلاقِ حمیدہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرتِ صالحہ کا خمیر ہیں۔

ادھر **تعلق مع الخلق** کے سلسلے میں خدمتِ خلق اللہ، صلہ رحمی، مظلوم کی نصرت واعانت، نادار کے لئے جود وسخا، ضرورت مندوں کے لئے ایثار وعطا، محتاجوں کو راحت رسانی، اور راہ گیروں کو کفِ اَذیٰ وایذا رسانی سے بچنا، عفو ودرگزر، محبت و شفقت، دِلسوزی وہمدردی، تعلیم وتربیت، ارشاد وتزکیہ وغیرہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک طبیعت کے فطری جوہر تھے۔

تعلق مع اللہ کے سلسلے میں عبادت و ریاضت، مجاہدہ و مراقبہ، کسرِ شہوات و لذّات، تقرّب و انابت، توبہ و اِستغفار، تہجد و شب بیداری، ذِکر اور فکر وغیرہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک فطرت کی افتاد تھی۔

لیکن ان تینوں تعلقات میں تعلق مع اللہ ہی دونوں تعلقات کی استواری کی رُوح تھی جو نفس اور ربّ کے تعلقات کو صحیح نہج پر قائم کرتی ہے، اگر نفسِ انسانی کو تعلق مع اللہ سے آشنا اور اس کے تقاضوں کا خوگر نہ بنایا جائے تو تعلق مع الخلق اور تعلق من النفس صحیح بنیادوں پر کبھی قائم نہیں رہ سکتا، آج بھی جو لوگ اللہ سے منقطع ہو کر ان تعلقات کو خوشنما بنانے کی فکر میں ہیں وہ طرح طرح کی لغزشوں کا شکار اور نفسانی جذبات میں گرفتار ہیں جن کی مہلک لغزشوں سے دُنیا فتنہ و فساد کا گھر بنی ہوئی ہے۔

(ماہنامہ ''الحق'' اکوڑہ خٹک جولائی ۱۹۷۹ء)

دارالعلوم دیوبند
بنیادی اُصول اور مسلک
(بسلسلۂ اجلاس صد سالہ دارالعلوم دیوبند)

تیرہویں صدی ہجری آخری سانس لے رہی تھی، ہندوستان میں اسلامی شوکت کا چراغ گل ہو چکا تھا، صرف اُٹھتا ہوا دُھواں رہ گیا تھا جو چراغ بجھ جانے کا اعلان کر رہا تھا، دہلی کا تختِ مغل اقتدار سے خالی ہو چکا تھا، صرف ڈھول کی منادی میں ملک بادشاہ کا رہ گیا تھا، اسلامی شعائر رفتہ رفتہ رو بہ زوال تھے، دِینی علم اور تعلیم گاہیں پشت پناہی ختم ہو جانے سے ختم ہو رہی تھیں، علمی خانوادوں کو بیخ و بُن سے اُکھاڑنے کا فیصلہ ہو چکا تھا، دِینی شعور رُخصت ہو رہا تھا اور جہل و ضلال مسلم قلوب پر چھاتا چلا جا رہا تھا، مسلمانوں میں پیغمبری سنتوں کی بجائے جاہلانہ رُسوم و رواج، شرک و بدعت اور ہویٰ پرستی وغیرہ زور پکڑتے جا رہے تھے، مشرقی روشنی چھپتی جا رہی تھی اور مغربی تہذیب وتمدن کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا، جس سے دہریت و اِلحاد وفطرت پرستی اور بے قیدیٔ نفس، آزادیٔ فکر اور بے باکی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں جس سے نگاہیں خیرہ ہو چکی تھیں، اسلام کی جیتی جاگتی بیمار آنکھوں میں دُھندلی نظر آنے لگی تھی اور اتنی دُھندلی کہ اسلامی خد و خال کا پہچاننا بھی مشکل ہو چکا تھا، چمنِ اسلام میں خزاں کا دور دورہ تھا، خوش آواز وشیریں اَدا پرندوں کے زمزمے مدہم ہوتے جا رہے تھے اور ان کی جگہ زاغ و زغن کی مکروہ آوازوں نے لے لی تھی، یہ اور اسی قسم کے اور ہزارہا حوادث اور اَلمناک واقعات کے چند اِجمالی عنوانات ہیں جن سے اس وقت کے ہندوستان کی

مسموم فضا کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں ہے ؎

اند کے باتو بگفتیم وبدل ترسیدیم
کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

ان حالات سے یقین ہو چلا تھا کہ اسلام کا چمن اب اُجڑا اور یہ کہ اب ہندوستان بھی اسپین کی تاریخ دہرانے کے لئے کمربستہ ہو چکا ہے کہ اچانک چند نفوسِ قدسیہ نے بالہامِ خداوندی اپنے دِل میں ایک خلش اور کسک محسوس کی، یہ خلش علومِ نبوّت کے تحفظ، دِین کو بچانے اور اس کے راستے سے ستم رسیدہ مسلمانوں کو بچانے کی تھی، وقت کے یہ اولیاء اللہ ایک جگہ جمع ہوئے اور اس بارے میں اپنی اپنی قلبی واردات کا تذکرہ کیا جو اس پر مجتمع تھیں کہ اس وقت بقائے دِین کی صورت بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ دِینی تعلیم کے ذریعے مسلمانانِ ہند کی حفاظت کی جائے اور تعلیم و تربیت کے راستے سے ان کے دِل و دِماغ کی تعمیر کرکے ان کی بقاء کا سامان کیا جائے، اور اس کی واحد صورت یہی ہے کہ ایک درس گاہ قائم کی جائے جس میں علومِ نبویہ پڑھائے جائیں اور ان ہی کے مطابق مسلمانوں کی دِینی، معاشرتی، تمدنی زندگی اسلامی سانچوں میں ڈھالی جائے، جس سے ایک طرف تو مسلمانوں کی داخلی راہ نمائی ہو اور دُوسری طرف خارجی مدافعت، نیز مسلمانوں میں صحیح اسلامی تعلیمات بھی پھیلیں اور ایمان دارانہ سیاسی شعور بھی بیدار ہو۔ ان مقاصد کے لئے کمر باندھ کر اُٹھنے والے یہ لوگ رسمی قسم کے راہ نما اور لیڈر نہ تھے، بلکہ خدارسیدہ بزرگ اور اولیائے وقت تھے، اور ان کی یہ باہمی گفت وشنید کوئی رسمی قسم کا مشورہ یا تبادلۂ خیال نہ تھا، جیسا کہ میں نے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ مہتممِ سادِس دارالعلوم دیوبند سے سنا کہ وقت کے ان تمام اولیاء اللہ کے قلوب پر بہ یک وقت یہ واضح ہوا کہ اب ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ و بقاء کی واحد صورت قیامِ مدرسہ ہے۔ چنانچہ اس مجلسِ مذاکرہ میں کسی نے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ حفظِ دِین و مسلمین

کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا جائے، کسی نے کہا کہ مجھے کشف ہوا ہے کہ ایک مدرسہ قائم ہو، کسی نے کہا کہ میرے قلب پر وارد ہوا ہے کہ مدرسہ کا قیام ضروری ہے، کسی نے بہت صریح لفظوں میں کہا کہ من جانب اللہ محسوس ہوا کہ ان حالات میں تعلیمِ دِین کا ایک مدرسہ قائم ہونا ضروری ہے۔ ان اہل اللہ کا اس تبادلۂ واردات کے بعد قیامِ مدرسہ پر جم جانا درحقیقت عالمِ غیب کا ایک مرکب اجتماع تھا جو قیامِ مدرسہ کے بارے میں من جانب اللہ واقع ہوا۔

اس سے جہاں یہ واضح ہوا کہ اس وقت کے ہندوستان میں قیامِ مدرسہ کی تجویز کوئی رسمی تجویز نہ تھی بلکہ من جانب اللہ تھی، وہیں یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس تجویز کے پردے میں اسلامی علوم وفنون کی تعلیم اور اسلامی نسلوں کی دِینی، اخلاقی، اجتماعی اور رُوحانی تربیت کا مسئلہ درپیش تھا اور ملک گیر اصلاح کی رُوح چھپی ہوئی تھی، جو محض مقامی یا ہنگامی نہ تھی کیونکہ اسلامی شوکت ختم ہوجانے کا اثر بھی مقامی نہ تھا، جس کے تدارک کی فکر تھی وہ پورے ملک پر پڑ رہا تھا اس لئے اس کے دفعیہ کی یہ ایمانی رنگ تحریک بھی مقامی انداز کی نہ تھی بلکہ اس میں عالمگیریت پنہاں تھی۔ گو ابتداء میں اس کی شکل ایک چھوٹے سے تخم کی سی تھی، مگر اس وقت اس میں ایک تناور شجرۂ طیبہ لپٹا ہوا تھا، جس کی جڑیں سچے قلوب کی زمین میں پھیلی ہوئی تھیں اور شاخیں آسمان سے باتیں کررہی تھیں۔ اس سلسلے میں ان نفوسِ قدسیہ کے سربراہ حجۃ الاسلام حضرتِ اقدس مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ تھے جنھوں نے اس غیبی اشارے کو سمجھا اور اسے ایک تجویز کی صورت دی، حضرتِ اقدس نے بانیٔ اعظم دارالعلوم کی حیثیت سے اسلامی زندگی کے لئے جس آفاقی رُوح سے کام لیا تھا اس کی برکت سے ملک کے مختلف حصوں میں جامعہ قاسمیہ، قاسم العلوم، مدرسہ قاسمیہ کے نام سے مدارس ومکاتب کا عظیم سلسلہ شروع ہوگیا اور ایک ایسی مقدس علمی برادری قائم ہوگئی جس کے ہزاروں افراد اپنے نام کے ساتھ ''قاسمی'' لکھنا باعثِ برکت سمجھتے ہیں اور یہ افراد ہر براعظم

میں پائے جاتے ہیں۔

بنائے دارالعلوم

کچھ وقت گزرنے کے بعد یہ مبارک تجویز عملی صورت میں نمودار ہوئی اور ۵؍محرّم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰؍مئی ۱۸۸۶ء کو دارالعلوم کی بنیاد رکھی گئی، بنیاد رکھنے کی تفصیلات سوانحِ قاسمی میں ملیں گی، اس بنا پر خصوصیت سے حضرت حاجی سیّد عابد حسین صاحب قدس سرہٗ اور حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب قدس سرہٗ اور حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب قدس سرہٗ قابلِ ذکر ہیں، جن کا ہاتھ ابتداء ہی سے تأسیسِ مدرسہ میں تھا، یہ حضرات خصوصیت سے بانیٔ اعظم حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کے دست و بازو رہے ہیں اور بنائے مدرسہ کے بعد بھی اس کی ذمہ دار مجلس کے رُکنِ رکین کی حیثیت سے مدرسہ کے تمام اُمور میں عملاً شریک رہے ہیں، بعد میں حضرتِ اقدس مولانا شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اس مجلسِ خیر کے رکنِ رکین ہوئے اور بالآخر حضرت نانوتویؒ کے ارشادات و ایماء پر دارالعلوم کے عہدۂ اہتمام پر فائز ہوئے، اور آپ کا عہدۂ اہتمام خیر و برکت کا سرچشمہ ثابت ہوا، دارالعلوم کی معنوی بنا کے لئے تو حضرت نانوتوی قدس سرہٗ نے آٹھ اُصول تحریر فرمائے جو اِس ادارے میں تمام قوانین کے لئے اَساس و بنیاد کا درجہ رکھتے ہیں، اور حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے آٹھ اُصولِ عملی تحریر فرمائے جو اِس ادارے کے نظم و انتظام کی اَساس و بنیاد ہیں، دونوں بزرگوں کے اُصولِ ہشت گانہ درج ذیل ہیں جو اِس دارالعلوم کی حکمتِ عملی اور نظم و انتظام کی اَساس ہیں۔

۸ بنیادی اُصول

۱۔ اُصولِ اوّل یہ ہے کہ تامقدور کارکنانِ مدرسہ کی ہمیشہ تکثیرِ چندہ پر نظر رہے، آپ کوشش کریں، اوروں سے کرائیں، خیر اندیشانِ مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے۔

۲-ابقاء طعامِ طلبہ بلکہ افزائشِ طعامِ طلبہ میں جس طرح ہوسکے خیر اندیشانِ مدرسہ ہمیشہ ساعی رہیں۔

۳-مشیرانِ مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور اُسلوبی ہو، اپنی بات کی پچ نہ کی جائے، خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی کہ اہلِ مشورہ کو اپنی مخالفت رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بنیاد میں تزلزل آجائے گا۔ القصہ تہہ دِل سے ہر وقت مشورہ اور نیز اس کے پس و پیش میں اُسلوبی مدرسہ ملحوظ رہے، سخن پروری نہ ہو، اور اس لئے ضروری ہے کہ اہلِ مشورہ اظہارِ رائے میں کسی وجہ سے متأمل نہ ہوں، اور سامعین بہ نیتِ نیک اس کو سنیں، یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دُوسرے کی بات سمجھ میں آجائے گی تو اگرچہ مخالف ہی کیوں نہ ہو بہ دِل و جان قبول کریں گے، اور نیز اسی وجہ سے یہ ضرور ہے کہ مہتمم اُمورِ مشورہ طلب میں اہلِ مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کرے، خواہ وہ لوگ جو ہمیشہ مشیرِ مدرسہ رہتے ہیں یا کوئی وارد و صادر جو علم و عقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیر اندیش ہو، اور نیز اسی وجہ سے ضرور ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے مشورہ کی نوبت نہ آوے اور بقدرِ ضرورت اہلِ مشورہ کی مقدار معتد بہ سے مشورہ کیا گیا ہو تو پھر وہ شخص اس وجہ سے ناخوش نہ ہو کہ مجھ سے کیوں نہ پوچھا، ہاں! اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا تو پھر اہلِ مشورہ معترض ہوسکتا ہے۔

۴- یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرّسین باہم متفق المشرب ہوں اور مثل علمائے روزگار خود بیں اور دُوسروں کے درپئے توہین نہ ہوں، خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی تو پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں۔

۵- خواندگیٔ مقرّرہ اسی انداز سے جو پہلے تجویز ہو پوری ہوجایا کرے، ورنہ یہ مدرسہ اوّل تو خوب آباد نہ ہوگا اور اگر ہوگا تو بے فائدہ ہوگا۔

۶- اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں، جب تک یہ مدرسہ اِن شاء اللہ بشرطِ توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا، اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی

حاصل ہوگئی جیسے جاگیر یا کارخانہ، تجارت یا کسی اُمیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف و رجا جو سرمایۂ رُجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا اور اِمدادِ غیبی موقوف ہوجائے گی، اور کارکنان میں باہم نزاع پیدا ہوجائے گا۔ القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی رہے۔

۷- سرکار کی شرکت اور اُمراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔

۸- تامقدور ایسے لوگوں کا چندہ موجبِ برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندے سے اُمید ناموری نہ ہو، بالجملہ حسنِ نیت اہلِ چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔

۸ انتظامی اُصول

۱- ہر کارخانہ کے اُمورِ جزیہ کی بنا ایک شخص کی رائے پر رہنی چاہیے، اسی قاعدہ پر اس کارخانہ کے اُمورِ جزئیہ کے انجام میں کسی صاحب کو اہلِ مشورہ میں سے دخل نہ ہو، اِلاّ مشورہ اور رائے کہ وہ اپنے موقع پر اظہار فرمادیں، جیسے اہلِ شوریٰ مل کر پسند کریں۔

۲- اُمورِ جزئیہ میں کوئی صاحب بندہ کے مددگار ہوں گے یا اچھا مشورہ دیں گے، بندہ ان کا مشکور ہوگا مگر انجام ان کا موقوف بندہ ہی کی رائے پر رہنا چاہئے۔

۳- جس کسی صاحب کو خواہ اہلِ شوریٰ، خواہ اور عام خلق، کوئی اَمر قابلِ اعتراض معلوم ہو تو مہتمم سے مزاحمت نہیں جلسۂ شوریٰ میں پیش کرکے اس کو طے کرالیں اور جیسا قرار پائے اس کے انجام پر مہتمم کو عذر نہ ہوگا۔

۴- مشورہ کے جلسے جب کبھی ہوں بے حاضری مہتمم نہ ہوں، اگرچہ اس کی ہی بات پر خوردہ ہو اور یوں اہلِ شوریٰ کو اختیار اعتراض کا ہر وقت ہے اور مہتمم کو موقع جواب کا۔

۵- مہتمم اگر اہلِ شوریٰ کے اجتماع تلک کسی اَمرِ ضروری کے انجام پر انتظار نہ کر سکے تو بذریعہ خط سب صاحبوں کو اطلاع دے گا، اور اس ضروری اَمر کو صاحبوں کو قبول کرنا ہوگا۔

۶- آمدنی مدرسہ کی مہتمم کے ہاتھ میں رہے گی، کیونکہ صَرفِ ضروریہ کے لئے کسی قدر روپیہ مہتمم کے ہاتھ میں رہنا ضروری ہے، حاجتِ ضروری سے زیادہ روپیہ جمع ہو جائے تو خزانچی کے پاس جمع کر دیا جائے گا۔

۷- ہر روز وقتِ مقرّرہ مدرسہ پر مہتمم مدرسہ جایا کرے گا، اور اسی وقت میں اُمور متعلقہ مدرسہ کو انجام دیا کرے گا۔

۸- مناسب ہے کہ سب اہلِ شوریٰ مل کر اپنے دستخط اس مفروضہ پر فرما دیں کہ مہتمم کو جائے سند رہے۔

دارالعلوم کی تاسیس اور پیشین گوئیاں

دیوبند کی ایک چھوٹی سی مسجد میں جسے چھتہ کی مسجد کہتے ہیں، ایک اَنار کا درخت ہے، اس درخت کے نیچے سے آبِ حیات کا یہ چشمہ پھوٹا اور اسی چشمے نے ایک طرف دِین کے چمن کی آبیاری شروع کر دی اور دُوسری طرف اس کی تیز و تند رو نے شرک و بدعت، فطرت پرستی، اِلحاد و دہریت اور آزادیٔ فکر کے ان خس و خاشاک کو بھی بہانا اور راستے سے ہٹانا شروع کر دیا جنھوں نے مسلمانوں کے قلوب میں جڑ پکڑ کر انہیں یہ روزِ بد دِکھایا تھا۔

بانیٔ دارالعلوم کا یہ خواب کہ: ''میں خانۂ کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوں اور میرے ہاتھوں پیروں کی دسوں اُنگلیوں سے نہریں جاری ہیں اور اَطرافِ عالم میں پھیل رہی ہیں'' پورا ہوا اور مشرق و مغرب میں علومِ نبوّت کے چشمے جاری ہونے کی راہ ہموار ہوگئی۔ دارالعلوم کے مہتممِ ثانی حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب مہاجرِ مدنی قدس

سرہٗ کا یہ خواب کہ: ''علومِ دینیّہ کی چابیاں میرے ہاتھ میں دے دی گئی ہیں'' خواب ہی نہ رہا بلکہ حقیقت کے لباس میں جلوہ گر ہوگیا۔

اور اس مدرسہ کے ذریعہ ان چابیوں نے ان قلوب کے تالے کھول دیئے جو علم کا ظرف تھے یا ظرف بننے والے تھے، جن سے علم کے سوتے ہر طرف سے پھوٹنے لگے اور چند نفوسِ قدسیہ کا علم آن کی آن میں ہزارہا علماء کا علم ہوگیا ہے، حضرت سیّد احمد شہیدؒ رائے بریلوی دیوبند سے گزرتے ہوئے جب اس مقام پر پہنچے تھے جہاں دارالعلوم کی عمارت کھڑی ہے تو فرمایا تھا کہ: ''مجھے اس جگہ سے علم کی بو آتی ہے'' پس وہ خوشبو جس کو سیّد صاحب کی رُوحانی قوتِ شامہ نے سونگھا تھا ایک سدا بہار گلاب کا پھول بلکہ گلاب آفریں درخت کی شکل میں آگئی، جس سے ہزاروں پھول کھلے اور ہندوستان کا اُجڑا ہوا چمن تختۂ گلاب بن گیا۔ کسے معلوم تھا کہ یہ خوشبو بیج بنے گی، بیج سے کلی بنے گی، شگفتہ کلی سے پھول کھلے گا، پھول سے گلدستہ بنے گا، اور اس گلدستے کی خوشبو سے سارا عالمِ انسانیت مہک اُٹھے گا۔ اور کسے پتہ تھا کہ ایشیا کی فضا میں مغربی استعماریت کے جو جراثیم پھیلے ہوئے ہیں وہ اس کی جراثیم کش مہک سے آپ ہی اپنی موت مرنے شروع ہوجائیں گے، چنانچہ اس وقت کے برطانوی ہند میں فاتح قوم (انگریز) کو فکر تھی کہ ہندوستان کے دِل و دِماغ کو یورپین سانچے میں کس طرح ڈھالا جائے جس سے برطانویت اس ملک میں جڑ پکڑ سکے، ظاہر ہے کہ دِل و دِماغ کے بدل دینے کا واحد ذریعہ تعلیم ہوسکتی تھی، جس نے ہمیشہ ان سانچوں میں دِلوں اور دِماغوں کو ڈھالا ہے، جن کو لے کر تعلیم آگے آتی ہے، اس لئے ہندوستان کو فرنگی رنگ میں ڈھالنے کے لئے لارڈ میکالے نے تعلیم کی اسکیم پیش کی اور وہ اسکولی اور کالجی تعلیم کا نقشہ لے کر یورپ سے ہندوستان پہنچا اور ہ نعرہ بلند کیا کہ: ''ہماری تعیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ اور نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں اور دِل و دِماغ کے لحاظ سے انگلستانی ہوں۔'' یقیناً یہ آواز جبکہ ایک فاتح اور برسرِ

اقتدار قوم کی طرف سے اُٹھا اور تھا بھی وہ تعلیم کا، جو بذاتِ خود ایک انقلاب آفریں حربہ ہے تو اس نے ملک پر ذہنی انقلاب کا خاطرخواہ اثر ڈالا، اس تعلیم سے ایسی نسلیں اُبھرنا شروع ہوگئیں جو اپنے گوشت پوست کے لحاظ سے یقیناً ہندوستانی تھیں لیکن اپنے طرزِ فکر اور سوچنے کے ڈھنگ کے اعتبار سے انگریزی جامے میں نمایاں ہونے لگیں۔ اس ذہنی مگر خطرناک انقلاب کو دیکھ کر بانیٔ دارالعلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ نے دارالعلوم قائم کرکے اپنے عمل سے یہ نعرہ بلند کیا کہ: ''ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ ونسل کے اعتبار سے جو کچھ بھی ہوں، دِل و دِماغ کے لحاظ سے ان میں اسلامی شعور زندہ ہو۔'' اس کا ثمرہ یہ نکلا کہ مغربیت کے ہمہ گیر اثرات پر بریک لگ گیا اور یہ بات یک طرفہ نہ رہی بلکہ ایک طرف مغربیت شعار نے جنم لینا شروع کیا تو دُوسری طرف مشرقیت نواز اور اسلامیت طراز جتھہ بھی برابر کے درجے میں آنا شروع ہوگیا، جس سے یہ خطرہ باقی نہ رہا کہ مغربی سیلاب سارے خشک وتر کو بہالے جائے گا، بلکہ اگر اس کی رو کا ریلا بہاؤ پر آئے گا تو ایسے بند بھی باندھ دیئے گئے ہیں جو اسے آزادی سے آگے نہ بڑھنے دیں گے۔
بہرحال وہ ساعتِ محمود آگئی کہ مدرسہ کا آغاز ہوا اور اس کی تعمیر و دِفاع کی ملّی تعلیم عملاً ساحت وجود پر آگئی، مُلّاَ محمود دیوبندیؒ نے (جو حضرت بانیٔ دارالعلوم کے اَمر پر مدرسہ دیوبند کا یہ تعلیمی منصوبہ جاری کرنے کے لئے بہ حیثیت مدرّس میرٹھ سے دیوبند تشریف لائے) اپنے سامنے ایک شاگرد کو کہ ان کا نام بھی محمود ہی تھا اور آخرکار شیخ الہند مولانا محمد حسن کے لقب سے دُنیا میں مشہور ہوئے، بٹھا کر کسی عمارت میں نہیں جو مدرسہ کے نام بنائی گئی ہو بلکہ چھتہ کی مسجد کے کھلے صحن میں ایک اَنار کے درخت کے سایہ میں بیٹھ کر اس مشہورِ عالم درس گاہ دیوبند کا افتتاح کردیا۔ نہ کوئی مظاہرہ تھا، نہ شہرت پسندی کا کاروبار اور جذبہ، نہ نام ونمود کی تڑپ تھی اور نہ پوسٹر و اشتہارات کی بھرمار، بس ایک شاگرد اور ایک اُستاذ، شاگرد بھی محمود اور اُستاذ بھی محمود، دو نفر سے یہ

لاکھوں کے ایمانوں کی حفاظت کی اسکیم معرضِ وجود میں آ گئی۔ سادگی اور ندرتِ ایمان کا دُور شروع ہوگیا، جو سنتِ نبوی اور اِتباعِ سلف کی رُوح ہے، مقصد نہ طرفہ تھا اور نہ تنعّم، نہ تعیش، نہ تزئین، نہ تفاخر، نہ تکاثر بلکہ صرف "ما أنا عليه اليوم و أصحابي" کا مرقع بنانا اور "عليكم بسنتي .... الخ" اور "وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ أَنَابَ اِلَيَّ" کی سیدھی راہ کی عملی تصویر کھینچنی تھی۔

دارالعلوم کا سلسلۂ سند و اسناد

دارالعلوم کا سلسلۂ سند حضرت اِمام شاہ ولی اللہ صاحب فاروقی قدس سرہ العزیز سے گزرتا ہوا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک جاپہنچتا ہے، شاہ صاحبؒ اس جماعتِ دیوبند کے مورثِ اعلیٰ ہیں، جن کے مکتبِ فکر سے اس جماعت کی تشکیل ہوئی، حضرتِ ممدوح نے اوّلاً اس وقت کے ہندوستان کے فلسفیانہ مزاج کو اچھی طرح پرکھا، پھر علومِ شریعت کو ایک مخصوص جامع عقل و نقل طرز میں پیش فرمایا، جس میں نقل کو عقل کے جامے میں ملبوس کر کے نمایاں کرنے کا ایک خاص حکیمانہ انداز پنہاں تھا۔

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ بانئ دارالعلوم دیوبند نے ولی اللہ سلسلے کے تلمذ سے اس رنگ کو نہ صرف اپنایا جو انہیں ولی اللّٰہی خاندان سے ورثے میں ملا تھا، بلکہ مزید تنوّر کے ساتھ اس کے نقش و نگار میں اور رنگ بھرا، اور وہی منقولات جو حکمتِ ولی اللّٰہی کے معقولات کے لباس میں جلوہ گر تھے، حکمتِ قاسمیہ میں محسوسات کے لباس میں جلوہ گر ہوگئے، پھر آپ کے سہل ممتنع اندازِ بیان نے دِین کی انتہائی گہری حقیقتوں کو جو بلاشبہ علمِ لدنی کے خزانے سے ان پر بالہامِ غیب منکشف ہوئیں، استدلالی اور لمیاتی رنگ میں آج کی خوگرمحسوس یا حس پرست دُنیا کے سامنے پیش کر دیا اور ساتھ ہی اس خاص مکتبِ فکر کو جو ایک خاص طبقے کا سرمایہ اور خاص حلقے تک محدود تھا دارالعلوم دیوبند جیسے ہمہ گیر ادارہ کے ذریعہ ساری اسلامی دُنیا

میں پھیلادیا، اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ ولی اللّٰہی مکتبِ فکر کے تحت دیوبندیت درحقیقت ''قاسمیت'' یا قاسمی طرزِ فکر کا نام ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ کے وصال کے بعد اس دارالعلوم کے سرپرستِ ثانی قطبِ ارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ نے قاسمی طرزِ فکر کے ساتھ دارالعلوم کی تعلیمات میں فقہی رنگ بھرا، جس سے اُصول پسندی کے ساتھ فروعِ فقہیّہ اور جزئیاتی تربیت کا قوام بھی پیدا ہوا، اور اس طرح فقہ اور فقہاء کا سرمایہ بھی اس میراث میں اضافہ ہوگیا۔

ان دونوں بزرگوں کی وفات کے بعد دارالعلوم کے اوّلین صدر مدرّس جامع العلوم اور شاہ عبدالعزیزؒ ثانی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہٗ نے جو حضرت بانیٔ دارالعلوم سے سلسلۂ تلمذ بھی رکھتے تھے دارالعلوم کی تعلیمات میں عاشقانہ اور والہانہ اور مجذوبانہ جذبات کا رنگ بھرا جس سے صہبائے دیانت سہ آتشہ ہوگئی۔

آپؒ کے وصال کے بعد دارالعلوم دیوبند کے سرپرستِ ثالث حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہٗ صدر المدرّسین دارالعلوم دیوبند جو حضرت بانیٔ دارالعلوم قدس سرہٗ کے تلمیذِ خاص بلکہ علم و عمل میں نمونۂ خاص تھے، ان تمام علوم کے محافظ ہوئے، اور انہوں نے چالیس سال دارالعلوم کی صدارت تدریس کی لائن سے علوم و فنون کو تمام منطقہ ہائے اسلامی میں پھیلایا اور ہزار ہا تشنگانِ علوم ان کے دریائے علم سے سیراب ہوکر اَطرافِ عالم میں پھیل گئے، اس لحاظ سے یوں سمجھنا چاہئے کہ شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہٗ جماعتِ دارالعلوم کے جدِ اَمجد ہیں، حضرت مولانا نانوتوی قدس سرہٗ جدِ قریب، حضرت گنگوہی اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہما اَخ الجد، اور حضرت شیخ الہندؒ بمنزلہ پدر بزرگوار ہیں، حضرت شیخ الہندؒ نے اس عالمگیر علمی فیضان کے ساتھ ہندوستان کی آزادی، اسلامی دُنیا کی آزادی اور دُنیا بھر کے غلاموں کی آزادی کے لئے عظیم قائد کی حیثیت سے کام ہی نہیں کارنامے انجام

دیئے ہیں، جن کا اَجر اللہ ہی دے سکتا ہے۔

دارالعلوم کا مسلک

علمی حیثیت سے یہ ولی اللٰہی جماعت مسلکاً اہل السنّت والجماعت ہے، جس کی بنیاد کتاب و سنت اور اِجماع و قیاس پر قائم ہے، اس کے نزدیک تمام مسائل میں اَوّلین درجہ نقل و روایت اور آثارِ سلف کو حاصل ہے، جس پر پورے دِین کی عمارت کھڑی ہوئی ہے، اس کے یہاں کتاب وسنت کی مروات، اقوالِ سلف اور ان کے متوارث مذاق کی حدود میں محدود رہ کر محض قوتِ مطالعہ سے نہیں بلکہ اساتذہ و شیوخ کی صحبت و ملازمت اور تعلیم و تربیت ہی سے متعین ہوسکتی ہے۔ اسی کے ساتھ عقل و درایت اور تفقّہ فی الدین بھی ان کے نزدیک فہمِ کتاب وسنت کا ایک بڑا جزء ہے، وہ روایات کے مجموعے سے حنفی فقہ کی روشنی میں شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کی غرض و غایت کو سامنے رکھ کر تمام روایات کو اسی کے ساتھ وابستہ کرتا ہے اور سب کو درجہ بدرجہ اپنے اپنے محل پر اس طرح چسپاں کرتا ہے کہ وہ ایک ہی زنجیر کی کڑیاں دِکھائی دیں، اس لئے جمع بین الروایات اور تعارف کے تطبیق احادیث اس کا خاص اُصول ہے، جس کا منشاء یہ ہے کہ وہ کسی ضعیف سے ضعیف روایت کو بھی چھوڑنا اور ترک کردینا نہیں چاہتا، جب تک کہ وہ قابلِ استدلال ہو۔ اسی بناء پر اس جماعت کی نگاہ میں نصوصِ شرعیہ میں کہیں تعارض اور اختلاف نہیں محسوس ہوتا، بلکہ سارے کا سارا دین تعارض اور اختلاف سے مبرا رہ کر ایک گلدستہ دِکھائی دیتا ہے جس میں ہر رنگ کے علمی، عملی پھول اپنے اپنے موقع پر کھلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی کے ساتھ بطریق اہلِ سلوک جو رسمیات اور رواجوں اور نمائشی حال و قال سے بیزار و بَری ہے، تزکیۂ نفس اور اصلاحِ باطن بھی اس کے مسلک میں ضروری ہے، اس نے اپنے منتسبین کو علم کی رفعتوں سے نوازا، عبدیت و تواضع جیسے انسانی اخلاق سے بھی مزین کیا، اور اس

جماعت کے افراد ایک طرف علمی وقار، استغناء (علمی حیثیت سے) کی بلندیوں پر فائز ہوئے، وہیں فروتنی، خاکساری اور ایثار و زُہد کے متواضعانہ جذبات سے بھی بھرپور ہوئے، نہ رعونت اور کبر ونخوت کا شکار ہوئے اور نہ ذِلتِ نفس اور مسکنت میں گرفتار، وہ جہاں علم واخلاق کی بلندیوں پر پہنچ کر عوام سے اُونچے دِکھائی دینے لگے، وہیں عجز و نیاز، تواضع وفروتنی اور خاکساری کے جوہروں سے مزین ہوکر عوام میں ملے جلے اور "کَأَحَدٍ مِنَ النَّاس" بھی رہے، جہاں مجاہدہ ومراقبہ سے خلوَت پسند ہوئے، وہیں مجاہدانہ اور غازیانہ اسپرٹ، نیز قومی خدمت کے جذبات سے جلوہ آرا بھی ثابت ہوئے۔ غرض علم، اخلاق، خلوَت وجلوَت اور مجاہدہ و جہاد کے مخلوط جذبات و دواعی سے ہر دائرۂ دِین میں اعتدال اور میانہ روی ان کے مسلک کی امتیازی شان بن گئی، جو علوم کی جامعیت اور اخلاق کے اعتدال کا قدرتی ثمرہ ہے۔ اسی لئے ان کے یہاں "محدّث" ہونے کے معنی فقیہ سے لڑنے، یا "فقیہ" ہونے کے معنی محدّث سے بیزار ہوجانے، یا نسبتِ احسانی کے حامل ہونے کے معنی متکلم دُشمنی، یا علمِ کلام کی حذاقت کے معنی تصوّف بیزاری کے نہیں، بلکہ اس کے جامع مسلک کے تحت اس تعلیم گاہ کا فاضل درجہ بدرجہ بیک وقت محدّث، فقیہ، مفسر، مفتی، متکلم، صوفی اور حکیم ومربی ثابت ہوا، جس میں زُہد وقناعت کے ساتھ عدمِ تقشّف، حیا وانکسار کے ساتھ عدمِ مداہنت، رأفت و رحمت کے ساتھ امر بالمعروف ونہی عن المنکر، قلبی یکسوئی کے ساتھ قومی خدمت اور خلوَت در اَنجمن کے ملے جلے جذبات راسخ ہوگئے، اور ہر علم وفن اور تمام اَربابِ علوم وفنون کے بارے میں اعتدال پسندی اور حقوق شناسی نیز ادائیگیٔ حقوق کے جذبات ان میں بطور جوہرِ نفس پیوست ہوگئے۔ بنابریں دِینی شعبوں کے تمام اربابِ فضل وکمال اور راسخین فی العلم خواہ محدثین ہوں یا فقہاء، صوفیا ہوں یا عرفاء، متکلمین ہوں یا اُصولین، اُمرائے اسلام ہوں یا خلفاء، اس کے نزدیک سب واجب الاحترام اور واجب العقیدت ہیں، اس لئے جذباتی رنگ سے کسی طبقے کو بڑھانا اور کسی

کو گرانا یا مدح و ذم میں حدودِ شرعیہ سے بے پروا ہو جانا اس کا مسلک نہیں۔

خدمات: سائبیریا سے لے کر سماٹرا تک

اس جامع طریق سے دارالعلوم نے اپنی علمی خدمات سے (شمال میں) سائبیریا سے لے کر (جنوب میں) سماٹرا اور جاوا تک، اور مشرق میں برما سے لے کر مغربی سمتوں میں عرب اور افریقہ تک علومِ نبویہ کی روشنی پھیلا دی، جس سے پاکیزہ اخلاق کی شاہراہیں صاف نظر آنے لگیں۔ دُوسری طرف سیاسی خدمات سے بھی اس کے فضلاء نے کسی وقت بھی پہلو تہی نہیں کی، حتیٰ کہ ۱۹۰۳ء سے ۱۹۴۷ء تک اس جماعت کے افراد نے اپنے اپنے رنگ میں بڑی بڑی قربانیاں پیش کیں، جو تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں، کسی وقت بھی ان بزرگوں کی سیاسی اور مجاہدانہ خدمات پر پردہ نہیں ڈالا جاسکتا، بالخصوص تیرھویں صدی ہجری کے نصفِ آخر میں مغلیہ حکومت کے زوال کی ساعتوں میں خصوصیت سے حضرت شیخ المشائخ مولانا حاجی امداداللہ صاحب قدس سرہٗ کی سرپرستی میں ان کے دو مریدانِ خاص حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ اور منتسبین اور متوسلین کی مساعیٔ انقلاب، جہادی اقدامات اور حریت و استقلالِ ملّی کی فداکانہ جدوجہد، گرفتاروں کے وارنٹ پر ان کی قید و بند وغیرہ وہ سب تاریخی حقائق ہیں جو نہ جھٹلائی جاسکتی ہیں نہ بھلائی جاسکتی ہیں، جو لوگ ان حالات پر محض اس لئے پردہ ڈالنا چاہتے ہیں کہ وہ خود اس راہِ سرفروشی میں قبول نہیں کئے گئے، تو اس سے خود انہی کی نامقبولیت میں اضافہ ہوگا، اس بارے میں ہندوستان کی تاریخ سے باخبر اور اَربابِ تحقیق کے نزدیک ایسی تحریریں خواہ وہ کسی دیوبندی النسب کی ہوں یا غیر دیوبندی کی، جن سے ان بزرگوں کی ان جہادی خدمات کی نفی ہوتی ہو، لایعبا بہ اور قطعاً ناقابلِ التفات ہیں۔ اگر حسنِ ظن سے کام لیا جائے تو ان تحریرات کی زیادہ سے زیادہ توجیہ صرف یہ کی جاسکتی ہے کہ ایسی تحریریں

وقت کے مرعوب کن عوامل کے نتیجے میں محض ذاتی حد تک خوف واحتیاط کا مظاہرہ ہے، ورنہ تاریخی اور واقعاتی شواہد کے پیشِ نظر نہ ان کی کوئی اہمیت ہے اور نہ وہ قابلِ التفات ہیں۔ ان خدمات کا سلسلہ مسلسل آگے تک بھی چلا، اور ان ہی متوارث جذبات کے ساتھ ان بزرگوں کے اَخلافِ رشید بھی سرفروشانہ انداز سے قومی اور ملّی خدمات کے سلسلے میں آگے آتے رہے، خواہ وہ تحریکِ خلافت ہو یا اِستخلاصِ وطن، اور بروقت انقلابی اقدامات میں اپنے منصب کے عین مطابق حصہ لیا۔ مختصر یہ کہ علم و اَخلاق کی جامعیت اس جماعت کا طرۂ امتیاز رہا، اور وسعتِ نظری، روشن ضمیری اور رواداری کے ساتھ دِین و ملت اور قوم و وطن کی خدمت اس کا مخصوص شعار، لیکن ان تمام شعبہ ہائے زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت اس جماعت میں مسئلۂ تعلیم کو حاصل رہی ہے، جبکہ یہ تمام شعبے علم ہی کی روشنی میں صحیح طریق پر بروئے کار آسکتے تھے اور اسی پہلو کو اس میں نمایاں رکھا، اس لئے اس مسلک کی جامعیت کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ جامع علم ومعرفت، جامع عقل وعشق، جامع عمل واخلاق، جامع مجاہدہ و جہاد، جامع دیانت و سیاست، جامع روایت و درایت، جامع خلوَت و جلوَت، جامع عبادت و مدنیت، جامع حکم وحکمت ہے۔

(ماہنامہ ''الحق'' اکوڑہ خٹک فروری/ مارچ ۱۹۸۰ء)

علم کی روشنی

عن أنس بن مالک رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: مفھومان لا یشبعان مفھوم فی العلم لا یشبع منہ ومفھوم فی الدنیا لا یشبع منہ.

(رواہ البیھقی فی شعب الایمان)

بزرگانِ محترم، برادرانِ عزیز! آپ حضرات کی دعوت پر میں حاضر تو ہوگیا، لیکن سوچتا ہوں کہ آپ کے سامنے کیا کہوں، ظاہر ہے کہ جو کچھ کہوں گا وہ آپ جانتے ہیں، ایسی کوئی نئی بات سمجھ میں نہیں آتی جو آپ کے علم میں نہ ہو اور میں اسے علم میں لاؤں۔ آپ جانتے ہیں کہ دُنیا میں علم کی دولت سب سے بڑی دولت ہے، اور علم کی روشنی سب سے بڑی روشنی ہے، آپ کو سورج کی روشنی سب سے بڑی معلوم ہوتی ہے، پورے عالم پر پھیلی دِکھائی دیتی ہے، مگر اس کے ذریعہ صرف رنگ اور صورت کا علم ہوتا ہے، لیکن علم کی روشنی اسلام اور کفر کا فرق بتلاتی ہے، سنت و بدعت میں امتیاز سکھاتی ہے، حق و باطل کی پہچان کا ذریعہ ہوتی ہے، یہ انبیاء علیہم السلام کا طفیل ہے، ان کی جوتیوں کا صدقہ ہے اور ان حضرات کا لاکھ لاکھ کرم و احسان ہے کہ انہوں نے علم کی روشنی پیش کی جو ہمارے لئے اچھائی بُرائی، بھلے اور بُرے کے درمیان تمیز کا ذریعہ بنی۔

تحصیلِ حاصل

آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ علم تعلیم سے آتا ہے، اور آپ سبھی حضرات تعلیم میں مشغول ہیں، اسباق میں حاضری ہے، مطالعہ ہے، آپس میں مذاکرہ ہے، غرضیکہ

رات دن آپ علم ہی کے حصول میں لگے رہتے ہیں، اس لئے اس کی نصیحت کرنا تحصیلِ حاصل ہے، اور اگر عمل کے سلسلے میں کچھ کہا جائے تو آپ کہیں گے کہ سب سے بڑا عمل خود علم کا حصول ہی ہے، یہی وجہ ہے کہ حضراتِ فقہاء کے درمیان جب یہ بحث ہوئی کہ کثرتِ نوافل افضل ہے یا زیادتِ علم؟ تو کثرت سے فقہاء زیادتِ علم ہی کی افضلیت کے قائل ہوئے۔ آپ حضرات تحصیلِ علم میں لگے ہوئے ہیں جو سب سے بڑا عمل ہے، اس کے علاوہ فرائض وغیرہ کی ادائیگی میں بھی آپ کی جانب سے کسی قسم کی کوتاہی نہیں ہوتی، نماز کے لئے آپ جوق در جوق آتے ہیں، ہر وقت مسجد بھری ہوئی دِکھائی دیتی ہے، دارالعلوم کی مسجد تو آپ سے پُر رہتی ہے، شہر کی مسجدیں بھی آپ لوگوں سے آباد ہیں، لہٰذا اگر عمل کے سلسلے میں کچھ عرض کروں تو بھی آپ کہیں گے کہ عمل تو ہم کر ہی رہے ہیں۔ جہاں تک آپ لوگوں کی اخلاقی حیثیت کا تعلق ہے تو وہ بھی دُرست ہے، یہ بات ضرور ہے کہ اگر ہم پچھلوں کے اخلاق سے موازنہ کرتے ہیں تو کچھ کمی محسوس ہوتی ہے، لیکن اگر ہم دورِ حاضر کے دُوسرے طبقوں کے اخلاق و کریکٹر پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں نہ صرف یہ کہ آپ لوگوں کے اخلاق کو دیکھ کر خوشی ہوتی ہے بلکہ ہم کہنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ آپ حضرات ہی کا وہ طبقہ ہے جو اس اخلاقی قحط کے دور میں بھی اپنی ایک امتیازی شان رکھتا ہے، لہٰذا اس سلسلے میں بھی کچھ کہنا فائدے سے خالی ہی ہوگا۔ اور اُصولی و نوعی طور پر یہی کچھ دائرے تھے کہ جن کے متعلق کچھ کہا جاسکتا تھا، اور بفضلہٖ تعالیٰ یہ ساری چیزیں آپ کو حاصل ہیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سی چیز آپ حضرات کے سامنے رکھی جائے جو مفید ہو۔ اس وقت مجھے مولانا گنگوہیؒ کا واقعہ اور مقولہ یاد آیا، وہ یہ کہ آپؒ جب حضرت حاجی امداداللہ صاحبؒ سے بیعت ہوکر واپس ہوئے ہیں تو کافی عرصے تک کوئی خط و کتابت نہیں کی، آخرکار حضرت حاجی صاحبؒ نے مولاناؒ کے پاس ایک خط لکھا کہ جملہ متوسلین کے خطوط برابر آتے رہتے ہیں جس سے ان کے حالات معلوم ہوتے ہیں، مگر ایک

مدّت گزری آپ کی کوئی حالت معلوم نہ ہوسکی، اپنے حالات لکھئے تا کہ اندازہ ہوسکے۔

مولاناؒ نے جواب دیا اور ابتداء اس طرح کی: ''حضرت! مجھ محروم القسمت کا تو کوئی حال ہی نہیں، اگر کوئی حال ہوتا تو عرض کرتا'' پھر اخیر میں لکھا کہ: ''البتہ حضرت کی جوتیوں کے طفیل میں تین باتیں اپنے اندر پاتا ہوں، ایک یہ کہ اُمورِ شرعیہ اُمورِ طبعیہ بن گئے ہیں، گویا نماز روزہ اور دُوسری عبادات ادا کرنے کے لئے ایسا مجبور ہوں جیسے بھوک کے وقت کھانے کے لئے اور پیاس میں پانی کے لئے۔ دُوسری بات یہ کہ مادح و ذام یکساں نظر آتے ہیں، کوئی ہزار تعریف کرے، ہزار مذمت کرے نفس میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوتا، گویا مخلوق کچھ بھی کہتی رہے، اس کی نہ کچھ پروا ہوتی ہے اور نہ قلب پر کوئی اثر ہوتا ہے۔ اور تیسرے یہ کہ نصوصِ شرعیہ میں کہیں تعارض نہیں معلوم ہوتا، تعارض تو کیا موزونیت اتنی معلوم ہوتی ہے کہ ہر کلی اپنی جگہ پر ٹھیک اور دُرست دِکھائی دیتی ہے۔''

یہ قوتیں

اُمورِ شرعیہ اُمورِ طبعیہ بن جائیں تو یہ قوتِ عملیہ سے ہوتا ہے، اور لوگوں کی تعریف و بُرائی کا یکساں معلوم ہوتا ہے، یہ قوتِ اخلاقی کا تقاضا ہے، قوتِ عملی کی انتہاء یہ ہے کہ آدمی میں طاعت کی رغبت اس درجہ پیدا ہوجائے کہ بغیر اس کے کئے ہوئے چین ہی نہ آئے، قوتِ اخلاقی کی انتہاء یہ ہے کہ اس درجہ غنا پیدا ہوجائے کہ لوگوں کی تعریف و بُرائی یکساں معلوم ہونے لگے، اسی طرح قوتِ عملی کی انتہاء یہ ہے کہ قرآن و سنت کی ہر چیز اپنی جگہ پر بالکل دُرست اور ٹھیک معلوم ہو اور شریعتِ اسلامیہ ایک گلدستہ نظر آتی ہو، سعادتِ انسانی کے لئے انہیں تین چیزوں کے پیدا کرنے کی ضرورت ہے: علمی قوت، عملی قوت، اخلاقی قوت، اور آپ ایسی جگہ میں ہیں جو علمی، عملی، اخلاقی سبھی قوتوں کا مرکز ہے، جہاں ایسی ایسی شخصیتیں پیدا ہوئیں جو ہر اعتبار

سے کامل و مکمل تھیں، میں اپنی بڑی سعادت سمجھتا ہوں کہ ایسی باکمال شخصیتوں کی شکلیں دیکھنے اور بعض سے کچھ استفادے کا بھی موقع ملا۔ اُستاذِ محترم حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ، اللہ اکبر، چلتا پھرتا کتب خانہ تھے، اِتباعِ سنت کا یہ حال کہ ان کے عمل کو دیکھ کر مسائل نکالے جاتے تھے، ایسے ہی حضرت مولانا مدنیؒ جو اپنی مثال آپ تھے، اور حضرت شیخ الہندؒ ان تمام حضرات کی زیارت کے شرف کے ساتھ ساتھ ان سے کچھ استفادے کا بھی موقع ملا، حضرت تھانویؒ کی زیارت بھی نصیب ہوئی اور حسبِ توفیق استفادے کا بھی شرف نصیب ہوا۔ یہ ایسی جگہ ہے کہ جہاں کا ایک ایک شخص پوری، پوری قوم کے برابر ہے، حضرت تھانویؒ نے ملک کے گوشے گوشے میں مواعظ کہے اور ایک ہزار کے قریب تصانیف کیں، بہت سے علماء مل کر بیٹھیں تو بھی اتنا کام مشکل سے ہو سکے گا، حق تعالیٰ نے آپ سے ایسے کام لئے جس کا ایک قوم اور ایک جماعت سے ہونا اگر محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

جائے بزرگاں بجائے بزرگاں

یہ کیسے ممکن ہے کہ ان بزرگوں کے اثرات اس جگہ اور اس ادارہ میں نہ ہوں، ایک پھول کپڑے کو لگ جاتا ہے تو اس پر اپنے اثرات چھوڑ جاتا ہے، اور اس کی وجہ سے دیر تک کپڑے سے خوشبو آتی رہتی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شجرۃ الرضوان کے نیچے بیٹھ کر چودہ سو صحابہؓ سے بیعت لی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس تھوڑے سے قیام کی وجہ سے اس جگہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک نسبت حاصل ہوگئی تھی، اور وہ جگہ مقدس و متبرک ہوگئی تھی، چنانچہ حضراتِ صحابہؓ ان برکات کو محسوس کرتے تھے، اس درخت کے نیچے بیٹھتے تھے، دُعائیں مانگتے تھے، بعد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا: ابھی تو خیر القرون ہے، اور اس درخت کے ساتھ اُمت کی عقیدت کا یہ حال ہے، بہت ممکن ہے کہ کل کو ایسی نسلیں آئیں جو عقیدت میں غلوّ سے

کام لیں اور پھر اس کی وجہ سے شرک و بدعت کا دروازہ کھل جائے، اس درخت کو کٹوادیا۔ اس واقعہ سے آپ کو یہ بتانا تھا کہ جائے بزرگاں بجائے بزرگاں والا مقولہ بالکل صحیح ہے، پس یہ ادارہ جہاں اکابر اولیاء اور اپنے وقت کے مُسلَّم قطب و ولی رہ چکے ہیں، ان کے پاکیزہ اثرات سے اس کے در و دیوار کب خالی رہ سکتے ہیں۔

حاصل یہ کہ آپ ایک ایسے ادارے میں ہیں جسے طرح طرح کی نسبتیں اور تقدس حاصل ہے، جو برکات یہاں ملتی ہیں وہ دُوسری جگہ نظر نہیں آتیں، دارالعلوم کی ایک ایک جگہ کے بارے میں اکابرین کے مکاشفات ہیں، نودرہ کی عمارت کے بارے میں مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا مکاشفہ ہے کہ عرش سے ایک مسلسل لڑی ہے جو نوردہ کی درس گاہوں تک پہنچتی ہے، چنانچہ تجربہ یہ ہے کہ جتنا یہاں بیٹھ کر کتابیں سمجھ میں آتی ہیں، دُوسری جگہ نہیں آتی۔ نوردہ کے سامنے کی جگہ جہاں جنازہ رکھا جاتا ہے، اس کے متعلق مولانا یعقوب صاحبؒ کا مکاشفہ ہے کہ جس کے جنازے کی نماز یہاں ہوجائے وہ مغفور ہوتا ہے۔

اِلہامی درس گاہ

بھائی! یہ مدرسہ اِلہامی مدرسہ ہے، اس کا آغاز بھی اِلہام سے ہوا ہے، اس کی تعمیر بھی اِلہام سے ہوئی، اور طلباء کا داخلہ بھی اِلہام سے ہی ہوتا ہے، بلکہ بعض واقعات سے یہ بھی ثابت ہے کہ اس کے اساتذہ کا تقرّر اور تعین بھی خاص زاویوں میں ہوتا ہے، اور یہاں کی خدمت ہر شخص کو نصیب نہیں ہوتی۔ اس مدرسہ کا آغاز اور مدرسوں کی طرح کسی رسمی مشورے سے نہیں ہوا بلکہ وقت کے اکابر و مشائخ کا ایک اجماع سا ہے، میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ دارالعلوم کی تأسیس کے وقت میں کسی کو مکاشفہ ہوا کہ یہاں پر ایک دِینی مدرسے کی بنیاد ڈالنی چاہئے، کسی نے خواب میں دیکھا کہ یہاں ایک مدرسہ کا قیام ہونا چاہئے، کسی پر اِلقاء ہوا کہ اب

ہندوستان میں اسلام کا تحفظ دینی اداروں سے ہی ہوسکتا ہے۔ اسی طرح تعمیر کے وقت بنیاد کھودنے کے لئے کچھ نشانات لگادیئے گئے، جتنا احاطہ اب ہے اس سے آدھے پر نشان لگایا گیا تھا۔

دارالعلوم کے پہلے مہتمم

دارالعلوم کے سب سے پہلے مہتمم حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ تارک الدنیا اور نہایت ہی قوی النسبت بزرگ تھے، نہ لکھنا جانتے تھے اور نہ کتاب پڑھ سکتے تھے، مولانا نانوتویؒ نے انہیں بلایا اور اہتمام پیش کیا، آپؒ نے قبول کرنے سے انکار کردیا، اور فرمایا کہ میں نہ تو لکھنا جانتا ہوں، نہ پڑھنا، مجھے مہتمم بناکر کیا کیجئے گا، حضرتؒ نے فرمایا: نہیں، من جانب اللہ یہی مقدّر معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہی اہتمام قبول کریں، چنانچہ آپؒ نے قبول فرمالیا۔

مبشرات

حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے ایک دن خواب میں دیکھا کہ مولسری کے احاطے میں جو کنواں ہے اس کی من پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف رکھتے ہیں اور دُودھ تقسیم فرمارہے ہیں، دُودھ لینے والوں میں سے بعض کے ہاتھ میں گھڑا ہے، بعض کے ہاتھ میں لوٹا ہے، اور کسی کے ہاتھ میں پیالہ ہے، اور جس کے پاس کچھ نہیں ہے وہ ہاتھ پھیلا کر چُلّو ہی سے پی لیتا ہے۔ حضرتؒ جب بیدار ہوئے تو مراقبہ فرمایا کہ آخر یہ کیا چیز ہے، کچھ دیر مراقب رہنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ دُودھ صورتِ مثالی علم کی ہے، اور قاسم العلوم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، آپ علم تقسیم فرمارہے ہیں اور طلباء فرقِ مراتب کے ساتھ علم حاصل کررہے ہیں۔

اس واقعہ کا علم لوگوں کو اس طرح ہوا کہ ایک بار شاہ رفیع الدین صاحبؒ احاطہ مولسری میں کھڑے تھے، ایک طالبِ علم شوربہ کا پیالہ لے کر آپ کے سامنے آیا

اور اسے پھینک کر کہنے لگا: ''نہ اس میں گھی ہے اور نہ مصالحہ اور شاید مفتی صاحب اس سے وضو کے جواز کا فتویٰ بھی دے دیں، یہ ہے آپ کا اہتمام۔''

جب وہ طالبِ علم چلا گیا تو آپؒ نے پوچھا کیا: یہ مدرسہ دیوبند ہی کا طالبِ علم ہے؟ لوگوں نے کہا: ہاں حضرت یہ مدرسے ہی کا طالبِ علم ہے اور مطبخ سے اس کا کھانا ہے اور مطبخ کے رجسٹر میں اس کا نام درج ہے۔ آپؒ نے فرمایا: نہیں! یہ مدرسہ کا طالبِ علم معلوم نہیں ہوتا۔ تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ اسی نام کا ایک دُوسرا طالبِ علم ہے، اصل میں کھانا اس کا تھا لیکن نام میں اشتراک کی بناء پر غلطی سے ٹکٹ اسے مل گیا تھا، طلبہ آپؒ کے پاس حاضر ہوئے اور کہا: حضرت! بات تو وہی ہوئی جو آپ نے فرمایا تھا، مگر آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا؟ اس پر آپؒ نے دُودھ والا واقعہ بیان فرمایا اور اس کے بعد جو عجیب بات فرمائی وہ یہ کہ: ''جب شوال میں طلباء داخل ہوتے ہیں تو میں ایک ایک کو دیکھ کر پہچان لیتا ہوں کہ یہ بھی اس مجمع میں تھا، اس طالبِ علم پر میں نے تین مرتبہ نگاہ ڈالی تو مجھے یہی معلوم ہوا کہ یہ اس مجمع میں شریک نہیں تھا۔''

بہرحال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ مدرسہ اِلہامی مدرسہ ہے، اس کا آغاز بھی اِلہام سے ہوا اور طلبہ کا اِنتخاب بھی اِلہام سے ہوتا ہے، اور اس کا سنگِ بنیاد بھی اِلہام ہی سے رکھا گیا، بنیاد کے لئے لوگوں نے جو نشان لگایا تھا، اس پر ابھی کام شروع نہیں ہوا تھا کہ حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے خواب میں دیکھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں، عصائے مبارک ہاتھ میں ہے اور فرماتے ہیں کہ: ''یہ احاطہ تنگ رہے گا، کافی نہیں ہوگا'' چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مولانا نصیر احمد صاحب کی درس گاہ کے پاس سے نشان لگایا۔

حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ نیند سے بیدار ہوتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ لکیریں بالکل اسی طرح موجود ہیں، پھر شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ بنیاد اسی پر کھودی جائے گی، اب مجھے کسی سے مشورہ کی ضرورت نہیں ہے۔

لیکن تو چیزے دیگری

آپ حضرات ایک ایسے مقام پر ہیں کہ جسے سینکڑوں بزرگوں کی نسبتیں حاصل ہیں، مجموعی اور غیر شعوری طور پر وہ ساری نسبتیں کام کر رہی ہیں، اس لئے میں نے ابھی آپ سے کہا تھا کہ جو علم اور جو خیر و برکت یہاں ہے، دُوسری جگہ نظر نہیں آتی، کتابیں وہی ہوتی ہیں، الفاظ وہی ہوتے ہیں، مگر حقائق و کیفیات میں فرق ہو جاتا ہے۔ میں نے مشکوٰۃ شریف اپنے والد مرحوم مولانا حافظ احمد صاحبؒ سے پڑھی تھی، والد صاحبؒ جس وقت برزخ، موت، قیامت، حشر و نشر سے متعلق احادیث پر پہنچے اور تقریر شروع ہوئی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میدانِ قیامت سامنے ہے، یہ قبر ہے، حساب کتاب ہے، عذاب وثواب ہے، اس انداز اور ایسی کیفیت سے تعلیم ہوتی کہ ہم محسوس کرتے کہ یہی حالات ہمارے اُوپر طاری ہو رہے ہیں۔

یہ چمن یوں ہی رہے گا

دارالعلوم پر ایک وقت وہ بھی گزرا ہے کہ مہتمم سے لے کر دربان تک سب ہی اہلِ نسبت تھے، حاجی عبداللہ صاحبؒ دربان تھے، نوشت و خواند کچھ نہ تھی، لیکن صاحبِ نسبت بزرگ تھے، صبحِ صادق پر جو دارالعلوم میں گھنٹہ بجتا ہے، اس کے بجانے کا کام انہی کے سپرد تھا، پہلی ضرب لگاتے تو زبان پر سبحان اللہ ہوتا، دُوسری پر الحمدللہ اور تیسری پر اللہ اکبر کے ایک نعرہ کے ساتھ، پھر یہ شعر زبان پر عجیب کیفیت سے لاتے۔

یہ چمن یونہی رہے گا اور ہزاروں بلبلیں
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اُڑ جائیں گی

یہ منظر کچھ ایسا ہوتا کہ جو سنتا بے اختیار اس پر بکاء طاری ہو جاتا، حاصل یہ کہ یہ ایک مثالی جگہ ہے، اسے نہ جانے کیسی کیسی نسبتیں حاصل ہیں، یہاں کم سے کم درجے کا طالبِ علم آتا ہے اس کو بھی کچھ نہ کچھ ضرور ملتا ہے، اس جگہ پر رہ کر محروم

رہنے کا کوئی سوال نہیں۔ تو بھائی! اگر نسبتوں کے بارے میں کچھ بات کی جائے تو بفضلہٖ تعالیٰ وہ بھی موجود ہے، مگر ہاں! اسی کے ساتھ ساتھ ایک بات اور ہے، وہ یہ کہ ایک تو اصل علم اور رأس العلم ہے، جسے آپ حاصل کر رہے ہیں، اور جو آٹھ دس سال میں حاصل ہو جاتا ہے، لیکن اسی پر قناعت نہ کرنا چاہئے بلکہ اضافے کی برابر کوشش کرتے رہنا چاہئے، جس طرح اصل علم مطلوب ہے ویسے ہی زیادۃ فی العلم بھی مطلوب ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دُعا فرمایا کرتے تھے: "رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا" حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ علوم دیئے گئے تھے جو ساری کائنات میں سے کسی کو نہیں دیئے گئے، چونکہ یہ انسان کی صفت نہیں ہے بلکہ اللہ کی صفت ہے اور آپ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ساری صفات غیر محدود ہیں، اس لئے آپ جتنا بھی علم حاصل کرتے جائیں گے جہالت دُور ہوتی چلی جائے گی اور آگے میدان مزید نظر آئے گا۔

فنا فی العلم شخصیت

حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ مرضِ وفات میں ہیں، ڈاکٹروں نے سختی سے منع کر دیا ہے کہ آپ مطالعہ نہ فرمایا کیجئے، مگر جب ڈاکٹر چلے جاتے تو آپؒ فوراً مطالعے میں مشغول ہو جاتے۔ لوگ کہتے کہ حضرت! ڈاکٹر نے منع کیا ہے، تو فرماتے: بھائی! کیا کروں، یہ مرض مطالعے کا بالکل لاعلاج مرض لگا ہے۔ چوبیس گھنٹوں میں شاید آپؒ چند ساعت ہی ترکِ مطالعہ کرتے، ان کے بارے میں یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ آپؒ کی دلالتِ اُولیٰ مطالعے پر ہی تھی، حضرتؒ کو زیادۃ فی العلم کی ایک دُھن لگی ہوئی تھی، اسی کے ساتھ ساتھ حق تعالیٰ نے حفظ اتنا قوی دیا تھا کہ جو چیز ایک بار دیکھ لیتے تو عمر بھر کے لئے کافی ہو جاتی۔ خود ایک بار درس میں فرمایا کہ جو چیز نظر سے گزر جاتی ہے، پھر فراموش نہیں ہوتی۔ درس میں معروف و مشہور کتب تو درکنار غیر متعارف قلمی نادر کتب کا حوالہ بقید صفحات و سطور اس طرح دیتے کہ محسوس ہوتا کہ شاید گزشتہ

رات ہی حضرت نے ان کتابوں کا مطالعہ فرمایا ہے، لیکن اس قدر قوتِ حفظ کے ہوتے ہوئے حضرتؒ نے تیرہ بار فتح الباری کا اَز اَوّل تا آخر مطالعہ کیا تھا، بتایئے کہ جس کے ایک بار کتاب دیکھ لینے کے بعد یہ عالم ہو کہ سالہا سال کے بعد بھی مستحضر، تو تیرہ بار فتح الباری کا مطالعہ کرنے کے بعد کیا عالم ہوگا، آپؒ کے یہاں حدیث کا درس ہوتا تھا، مگر حقیقت یہ ہے کہ سارے ہی فنون کا درس ہوتا تھا، افسوس کہ آپؒ کی بتائی ہوئی باتیں اور تقاریر محفوظ نہ رکھ سکا۔

جدو جہد اور علمی مجاہدے

تو بھائی! علم آدمی کو محنت سے ملتا ہے، دُھن سے ملتا ہے، یہ دُھن پیدا ہوجانی چاہئے کہ ہمیں علم حاصل کرنا ہے، اور اس کو سود در سود کرکے بڑھاتے ہی چلے جانا ہے، جب دُھن پیدا ہوجائے گی تو آپ زیادہ سے زیادہ کتب بینی کریں گے اور جب آپ کتب بینی کے عادی ہوجائیں گے تو پھر آپ میں تفقّہ پیدا ہوگا، اور جب تفقّہ پیدا ہوجائے گا تو آپ کسی شے کے محض حکم ہی پر قناعت نہ کریں گے بلکہ اس کی حکمت کو بھی معلوم کرنے کی کوشش کریں گے، اور جب حکمت معلوم کرلیں گے تو اس سے بڑھ کر علت معلوم کرنے کی خواہش پیدا ہوگی، اور جب علت معلوم ہوجائے گی تو آپ اس پر قناعت نہیں کریں گے بلکہ اس وقت آپ یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ علت کا رابطہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفت سے ہے۔

قدیم روایت

ایک بات آپ حضرات سے کہہ دُوں کہ جس طرح آپ علم حاصل کرنے کے لئے محنت کرتے ہیں، مجاہدہ کرتے ہیں، مشقتیں برداشت کرتے ہیں، اسی طرح آپ کی عملی اور اخلاقی قوت مضبوط نہیں ہوگی، علم کام نہیں دے گا، ایک عالم میں اگر کبر ہو، حسد ہو، بغض ہو، کینہ ہو، حرص ہو، تو وہ خود بھی ذلیل ہوگا اور علم کو بھی ذلیل

کرے گا۔ اسلاف جب علم سیکھ لیتے تھے تو اس کے بعد مستقل طور پر عمل بھی سیکھتے تھے، خود دارالعلوم پر نصف صدی ایسی گزری تاوقتیکہ شیخِ کامل سے اجازت نہ ہوتی، دارالعلوم اپنی علمی سند نہ دیتا، گویا علم وعمل کی تکمیل کا نام سند تھا۔ میں نے آپ کے سامنے جو حدیث پڑھی تھی کہ یعنی نہ تو کوئی طالبِ دُنیا کبھی سیر اور نہ طالبِ علم سیر ہوتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ نہ کسی طالبِ مال کو کسی حد پر قناعت ہوتی ہے اور نہ طالبِ علم کو، بلکہ حرص بڑھتی ہی جاتی ہے۔ اگر کسی کے پاس سو روپیہ ہیں تو وہ دوسو کی خواہش میں رہتا ہے، اگر دوسو ہیں تو چارسو کی خواہش ہوتی ہے، اسی طرح کسی عالم کو اگر سو مسئلے معلوم ہوگئے تو وہ دوسو معلوم کرنے کی کوشش میں رہتا ہے، جب علم کی طلب اس درجہ تک پہنچ جائے گی تو علم خود ہی عمل کو دعوت دے گا، اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: "اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا" جس قدر علم بڑھتا جائے گا خشیت بڑھتی جائے گی اور جب خشیت بڑھے گی تو آپ یقیناً طاعت کی جانب مائل ہوں گے، اس لئے کہ علم کے لوازم میں عمل ہے۔

اِحساسِ مسئولیت

ابھی تو آپ حضرات کا طالب علمی کا زمانہ ہے، ابھی آپ دُوسروں کی نگرانی میں رہتے ہیں اور یہاں رہ کر آپ صالح بن رہے ہیں، گویا یہاں سے جانے کے بعد آپ خود نگران بنیں گے اور آپ کو مصلح بننا ہوگا، پھر آپ کے سامنے مختلف قسم کے مسائل آئیں گے اور اس کے مطابق آپ کو تدابیر اختیار کرنی پڑیں گی، آپ کے سامنے ملک وقوم کے حالات ہوں گے اور آپ کو یہ دیکھنا ہوگا کہ اس وقت قوم میں کون سی بیماریاں ہیں، کیا کوتاہیاں ہیں، ان کے اسباب کیا ہیں؟ اور ازالے کی تدابیر کیا ہوں گی؟ ایسے ہی یہاں سے نکلنے کے بعد آپ کے سامنے شرک و بدعت کا میدان ہوگا اور عیسائیت و یہودیت سے بھی مقابلہ رہے گا، اگر آپ نے ان کاموں

کے لئے ابھی سے تیاری نہ کی اور محنت و مشقت کر کے میدان کو ہموار نہ کرلیا تو آگے چل کر آپ کو جن پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا وہ ظاہر ہے۔

ایک تمنا اور نخل آرزو

میری خواہش ہے کہ آپ یہاں سے صرف عالم اور صالح ہی بن کر نہ نکلیں بلکہ معلّم اور مصلح بن کر نکلنے کی کوشش کریں، اس لئے کہ قوم منتظر ہے کہ ہمارے نونہال دارالعلوم میں پڑھنے گئے ہیں، وہ آئیں گے ہماری اصلاح کریں گے، ہمیں غلط راستے سے ہٹا کر صحیح راستے پر لگائیں گے اور ہماری پریشانیوں کا حل ہوں گے، لہٰذا آپ ان چیزوں کے سلسلے میں خود بھی سوچیں، اس کا حل نکالیں، اپنے اساتذہ سے سوالات کریں، پھر نہ آپ کو ایسا وقت ملے گا، نہ ایسے اساتذہ ملیں گے، اور اگر آپ یہ کہیں کہ ہم یہ سب بھی کرتے رہتے ہیں تو خیر کوئی حرج نہیں اس لئے میں نے یہ چند باتیں آپ لوگوں سے عرض کردیں، آپ نے جس محبت و خلوص سے یاد فرمایا میں اس کا شکرگزار ہوں اور صرف شکرگزار ہی نہیں اس لئے کہ یہ تو ایک وقتی اور رسمی چیز ہوگئی ہے، میں آپ حضرات کے لئے خلوصِ قلب سے دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو علمِ نافع اور عملِ صالح کی توفیق دے۔

ذرّہ آفتاب تابانیم

میں کیا ہوں، کچھ بھی تو نہیں، بس ایک نام کی نسبت لگ گئی ہے، ان بزرگوں کے ساتھ جن کے طفیل میں ہم اور آپ آج یہاں موجود ہیں، غالبؔ نے کہا ہے ؎

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اِتراتا
وگر نہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

ہمارا تو جو کچھ بھی ہے، انہیں بزرگوں کی وجہ سے ہے، ہمیں تو روٹیاں بھی مل رہی ہیں انہیں بزرگوں کے طفیل میں، سپاسنامے اور تعارف میں تو اکثر مبالغے ہی سے

کام لیا جاتا ہے، اور اس میں ایران توران کی باتیں کہی جاتی ہیں، آپ لوگوں کی جانب سے جو سپاسنامہ پیش کیا گیا ہے، اس میں مجھے ہر طرح سے اچھا اور لائق دِکھانے کی کوشش کی گئی ہے، مگر کیا عجب ہے کہ جب اتنے لائق لوگ ایک نالائق کو لائق کہہ رہے ہیں، تو اللہ تعالیٰ اتنے لائقوں کی لاج رکھ لیں اور یہی میری بخشش کا ذریعہ بن جائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

(ماہنامہ ''الحق'' اکوڑہ خٹک فروری ۱۹۸۱ء)

سائنس اور مذہب کی حقیقت

سائنس کے آثار

ایک عرصہ میں دُنیا میں خلائی فتوحات کا غلغلہ ہے، اور حالیہ تجربات نے یہ چیز ثابت کردی ہے کہ حضرتِ انسان واقعی بڑی چیز ہے، لیکن مذہب و سائنس کے دائرۂ کار اور حدود سے لاعلمی، طبیعاتی علوم میں ناپختگی اور مذہب سے دُوری یا کم علمی کی وجہ سے بہت سے مسلمان اِحساسِ کمتری، مرعوبیت اور شکوک و شبہات کا شکار ہوچکے ہیں، اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ اُصولی طور پر یہ عرض کردیا جائے کہ سائنس اور مذہب کی حقیقت کیا ہے اور ان کا آپس میں کیا تعلق ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ سائنس اور اسلام آپس میں نہ تو ایک دُوسرے کی ضد ہیں، جیسا کہ بدقسمتی سے بعض حلقوں میں یہ تصوّر موجود ہے، اور نہ ہی سائنس اِلحاد کے مترادف ہے، جیسا کہ ایک دُوسرا طبقہ اس کا قائل ہے، بلکہ بقول ایک محقق مشرقی عالم: ''سائنس اور اسلام میں وسیلہ اور مقصود کی نسبت ہے'' جیسے بدن رُوح کے لئے وسیلۂ عمل ہے، ایسے ہی سائنس اُصولی طور پر اسلامی کارناموں کے لئے ''ایک وسیلہ، ذریعہ اور ڈھانچہ ہے'' اور اگر ہم ذرا گہری نظر سے سائنس کے موضوع کو سمجھ لیں تو دعویٰ خودبخود ثابت ہوجائے گا، اس لئے اوّلاً سائنس کے موضوع پر گفتگو کی جاتی ہے۔ آج کے دورِ ترقی میں جب تمدنی ایجادات و مادّیات کے لئے نئے نئے انکشافات کا چرچا ہوتا ہے تو بطور تکملہ سائنس کا ذکر بھی ساتھ ہی ہوتا ہے، مثلاً وسائلِ خبررسانی کے سلسلے میں ٹیلیفون، ٹیلیگراف، ریڈیو لاسلکی، ٹیلیویژن اور ایسے ہی دُوسرے برقی آلات کا ذکر

ہوتا ہے، تو ساتھ ہی یہ کہا جاتا ہے کہ یہ سائنس کے سنہری اُصول ہیں۔

وسائلِ نقل و حرکت کے سلسلے میں ریل، موٹر اور ہوئی جہاز وغیرہ بادپا سواریوں کا تذکرہ ہوتا ہے تو ساتھ ہی یہ کہا جاتا ہے کہ یہ سب سائنس کا طفیل ہے۔ یا مثلاً صنائع وحراف کے سلسلے میں لوہے، لکڑی کے خوشنما اور عجیب وغریب سامانِ تعمیر کے نئے نئے ڈیزائن اور نمونے، سیمنٹ اور اس کے ڈھلاؤ کی نئی نئی ترکیبیں، اور انجینئری کے نئے سے نئے اختراعات جب سامنے آتے ہیں تو سائنس کا نظرفریب چہرہ بھی سامنے کردیا جاتا ہے کہ یہ سب اسی کے خم و اَبرو کی کارگزاریاں ہیں۔ اسی طرح نباتاتی لائن میں زراعتی ترقیات، پھل پھول کی افزائش کے جدید طریقے اور نباتات کے جدید آثار و خواص کے متعلق انکشافات کا جب نام لیا جاتا ہے تو وہیں سائنس کا نام بھی پورے احترام کے ساتھ زبانوں پر آجاتا ہے۔ اسی طرح حیوانی سائنس میں مختلف تأثیرات پہنچانے کے ترقی یافتہ وسائل، آپریشنوں کی عجیب وغریب پھرتیلی صورتیں، کیمیاوی طریقِ فن پر دواسازی کی حیرت انگیز ترقی، تحلیل وترکیب کی محیرالعقول ترکیبیں، بجلی کے ذریعہ معالجات کی صورتیں جب زبانوں پر آتی ہیں تو ساتھ ہی انتہائی وقعت کے ساتھ سائنس کا نام بھی زبان پر ہوتا ہے کہ یہ سب اسی کے درخشاں آثار ہیں۔

طاقتوں کا منبع

اس تفصیل سے انسان کی ناقص عقل اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ سائنس کا موضوع عمل موالیدِ ثلاثہ: جمادات، نباتات اور حیوانات کے دائرے سے باہر نہیں ہے، پھر چونکہ ان موالید کی ترکیب عناصرِ اَربعہ: آگ، پانی، مٹی اور ہوا سے ہوتی ہے، جو ایک مُسلّمہ چیز ہے اور جس پر کسی استدلال کی ضرورت نہیں ہے، اس لئے گویا سائنس کا موجوع بلحاظِ حقیقت عناصرِ اَربعہ ٹھہر جاتے ہیں، جس کی خاصیت اور آثار کا

عملاً سمجھنا اور پھر کیمیاوی طریق پر ان کی تحلیل وترکیب کے تجربات سے عملاً نئی نئی اشیاء کو پردۂ ظہور پر لاتے رہنا سائنس کا مخصوص دائرۂ علم وعمل ہوجاتا ہے، پس سائنس کی یہ تمام رنگ برنگ تعمیر درحقیقت انہیں چار ستونوں (عناصرِ اَربعہ) پر کھڑی ہوئی ہیں۔

اور اگر اس ساری تفصیل کا مختصر لفظوں میں خلاصہ کیا جائے تو سائنس کا موضوع ''مادّہ اور اس کے عوارضِ ذاتیہ'' سے بحث کرنا ثابت ہوگا، اس لحاظ سے مادّیات میں جس کا زیادہ انہماک ہوگا وہی سب سے بڑا سائنس دان اور ماہرِ سائنس کہلائے گا۔ (واللہ اعلم)

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ سائنس کا موضوع عناصرِ اَربعہ ہیں تو دیکھنا یہ ہے کہ ان چاروں کے خواص و آثار اور ذاتی عوارض یکساں ہیں یا نہیں؟ ظاہر بات ہے کہ ان کے عوارض یکساں نہیں بلکہ بہت حد تک متفاوت ہیں، بلکہ ان کی جوہری طاقت بھی ایک درجے کی نہیں ہے، بلکہ کوئی عنصر ان میں ضعیف، کوئی قوی، کوئی قوی تر اور یہ ضعف وقوت کا تفاوت اتفاقی نہیں بلکہ معیاری ہے، اور وہ معیار یہ ہے کہ ان عناصر میں سے جس میں بھی لطافت بڑھتی گئی ہے اسی قدر اس کی طاقت بڑھتی گئی ہے، اور طاقت کے لحاظ سے غلبہ وتسلط اور شان واقتدار ہوتی چلی گئی۔

اس کا راز ماسوائے اس کے اور کیا ہے کہ لطافت ایک وصفِ کمال ہے جو کثافت کی ضد ہے، اور ہر وجودی کمال کا مخزن حضرت واجب الوجود کی ذات ہے، اس لئے لطافتوں کا منبع بھی وہی ہے، اندازہ فرمائیں اس کی طاقتوں کا تو یہ عالم ہے کہ آنکھوں سے اوجھل حواس و خیال کی حدود سے بالاتر اور ادراک و انکشاف کی حد بندیوں سے وراء الوراء ہے، اور اس کی طاقت کا یہ عالم ہے کہ تمام جہانوں پر صرف اور صرف اپنی شہنشاہی کا نظامِ محکم قائم کئے ہوئے ہے، اس سے جس چیز میں بھی لطافت کا کوئی کرشمہ ہے وہ درحقیقت اسی کی ذات و صفات کا پَرتو ہے جس کا بقدرِ استعداد اس نے قبول کرلیا ہے۔

لطافت کی طاقت

اس بناء پر جس چیز میں جتنی لطافت ہوگی اتنی ہی اس میں غلبہ و اقتدار کی شان ہوگی۔ اس تفصیل کے بعد عناصرِ اربعہ کی ذاتی عوارض کی کیفیت ملاحظہ فرمائیں تو معلوم ہوگا کہ ان میں مٹی سب سے زیادہ کثیف ہے، نہ صرف کثیف بلکہ کثاوت آور بھی ہے، دُنیا کی ہر چیز میں کثافت اور غلاظت آتی ہے تو اس مٹی سے، اس کثافت کو ملاحظہ فرمانا ہو تو تجربے کے طور پر ایک ڈھیلا اُوپر پھینکیں، آپ کی قوت جب تک کام کرے گی وہ اُوپر جائے گا، پھر "کل شئ یرجع الیٰ أصله" کا نظارہ ہوگا، یہی سبب ہے کہ خدا نے زمین کو ذلیل ہی نہیں بلکہ ذلول (ذلت کا مبالغہ) فرمایا، "هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا"۔

البتہ زمین کا ایک جزو پہاڑ بھی ہیں جن میں نسبتاً کچھ لطافت اور ستھرائی ہے، اور پھر پتھر کی مختلف قسمیں لطافت و ستھرائی کی بناء پر عزیز الوجود ہیں، یعنی مٹی پتھر پر گرے تو کچھ نہ بگڑے گا، اور ایک پتھر منوں مٹی پر گر پڑے تو جو حشر ہوگا وہ ظاہر ہے، پتھر کے مقابلے میں لوہے کو لیں، ایک بالشت بھر لوہے کی کدال کے سامنے بڑی بڑی چٹانوں کی کیا حیثیت ہے؟ وہی جو بے دست و پا قیدی کی ہوتی ہے، اس کا سبب بھی وہی لطافت و ستھرائی ہے جو لوہے نے بمقابلہ پتھر کے زیادہ قبول کرلی ہے۔

اس کے بعد دُوسرے عنصر یعنی آگ کا نمبر آتا ہے، یہاں طاقت ور لوہے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے آگ کے سامنے کیا حیثیت رکھتے ہیں؟ ذرا سی دیر لوہے کو بھٹی میں رکھو نتیجہ سامنے آجائے گا، اس کا راز بھی وہی طبعی اور عقلی اُصول ہے، آگ میں لوہے سے بھی زیادہ طاقت ہے اور کثرتِ لطافت کثرتِ طاقت کے مترادف ہے۔

اس کے بعد عنصرِ آب ہے، جس کے سامنے لوہے کو پگھلا دینے والی آگ کی کوئی حیثیت نہیں، ایک طرف آگ کے ترفع و اعلیٰ اور رُعب و دبدبے کو دیکھیں، پھر

جب قطراتِ آب اس پر ڈال کر اس کا تماشا کریں تو نتیجہ سامنے آجائے گا، چند لمحہ پہلے جو کرّ وفر تھا وہ راکھ کا ڈھیر بن چکا ہے، ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ پانی آگ کے مقابلے میں زیادہ لطیف ہے، اور لطافت جہاں جس قدر ہوگی طاقت بھی اسی اعتبار سے موجود ہوگی۔

اس کے بعد عنصرِ ہوا ہے جس کی طاقت وقوّت کا یہ عالم ہے کہ جب ہوا کے جھکڑ چلتے ہیں تو بڑے بڑے سمندر تہہ و بالا ہوجاتے ہیں اور اثر کا یہ عالم ہے کہ خوق و تحت کا کوئی گوشہ اور کوئی منفد ایسا نہیں جہاں یہ جوہرِ لطیف نہ ہو، آخر ایسا کیوں ہے؟ اس کا راز بھی اس کی لطافت اور اس کے بقدر طاقت ہے۔

انسان کی کارکردگی

اب اگر ان عناصرِ اَربعہ اور ان کے تینوں موالید جمادات، نباتات، حیوانات کی بے انتہاء شاخوں کو ایک طرف رکھ کر حضرتِ انسان کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ عناصرِ اَربعہ اس کے دست بستہ غلام ہیں، انسان ان پر غالب و متصرف ہے، یہ سب عناصر اپنی کارگزاری میں اس کے محتاج ہیں، اگر انسان کی کارکردگی الگ کردی جائے تو اَربعہ عناصر اپنی پوری قوت و طاقت کے باوجود کوئی کام سرانجام نہیں دے سکتے، لوہا خود بخود پتھروں کو کچل نہیں سکتا، آگ خود لوہے کو گرماتی اور پگھلاتی نہیں، پانی خود آگ بجھاتا نہیں، بلکہ انسان ہی ہے جو کدالیں بناتا اور پتھر توڑتا ہے، وہی بھٹیاں بناکر لوہے کو تپاتا ہے، وہی مشکیزے اور ظروف میں پانی لاتا ہے اور چولہے ٹھنڈے کرتا ہے، وہی ہوا کو قید کرتا اور سیالات کو اُڑاتا ہے، اور انسان نہ ہو تو کچھ بھی نہیں ہوسکتا، اور انسان ہی کی طاقتوں کا یہ عالم ہے کہ اس نے زمین کے قلب وجگر کو چیرا، کنویں بنائے، تہہ خانے تیار کئے، ارضی معدنیات سرمہ، ہڑتال، سونا، چاندی اور پیتل وغیرہ کے خزانے چھین لئے۔

پہاڑوں کو تراش کر بلند و بالا مکانات بنائے، ''تَنۡحِتُوۡنَ مِنَ الۡجِبَالِ بُیُوۡتًا''، ان میں سڑکیں نکالیں اور دفائنِ زمین کا راز فاش کر کے زمین کے خزانے کو عالم آشکارا کرادیا۔ الغرض زمین اور اس کے ہر ذرّے سے چاکروں کی سی خدمت لے رہا ہے۔

پانی کو حضرتِ انسان نے کس طرح رُسوا کیا ہے، جگہ جگہ کنویں بنائے، واٹر ورکس کا انتظام کیا اور جہاں چاہا پانی لے گیا، ابوالمیاہ سمندرِ اعظم جس کی کوہ پیکر موجوں کے لگاتار سلسلے سے خشکی سے کناروں پر اس طرح حملہ آور محسوس ہوتا ہے کہ گویا ابھی کرۂ زمین کو نگل جائے گا، اس کا یہ حشر ہے کہ انسان کے پاؤں کے نیچے روندا جارہا ہے، اس کے جہاز اور آب دوزیں چل رہی ہیں، سمندر کے خزانے اُگلوائے، اس کی چیزوں کو بازاروں میں رُسوا کیا، حتیٰ کہ سمندر کے پانی کو تحلیل کرڈالا، اس سے آگے بڑھ کر ذلیل خدمات لی جارہی ہیں، نجاستوں کا دھونا، میلے کپڑے پاک کرنا، ظروف کا صاف کرنا وغیر ذالک، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انسان نے پانی جیسے عنصرِ لطیف کو کس طرح اپنا قیدی بنا رکھا ہے۔

آگ جیسے خونخوار عنصر کو دیکھو، انسان نے اس کو کس طرح اپنا مطیع کیا ہے، لوہے پتھروں سے اسے نکالا، وہ آفتاب میں چھپی تو آتشی شیشوں کے ذریعہ اسے گرفتار کیا، خود اسے چھپانا چاہا تو ذرا سی دیر دیا سلائی کے سرے پر ذرا سے مصالحے میں بند کردیا، جب چاہا اسے رگڑا اور آگ نکال لی، جو آگ اپنے ترفع و تعلّی کی بناء پر سر نیچا ہی نہ کرتی تھی، وہ آج کس طرح انسان کی غلام و محکوم ہے۔

ہوا کی لطافت کا یہ عالم تھا کہ انسان کی لطیف ترین نگاہیں اسے پھاند سکتی تھیں، لیکن آخر انسان نے اُڑتے پرندہ کو کھلونا بنالیا، اس میں اپنے جہاز اُڑائے، خبررسانی کی خدمات پر مجبور کیا، گویا وہ ایک چھٹی رساں ہے جو مشرق سے مغرب تک انسان کی بلا اُجرت چاکری کر رہی ہے، انسان اسے کہیں برقی پنکھوں میں پہنچا رہا ہے، کہیں موٹر کے پہیوں اور سائیکل کے ٹائروں میں بند کر رکھا ہے، انسان کے

سامنے مجبور و بے بس ہے، پھر اسی پر بس نہیں کہ عناصرِ اَربعہ سے کام علیحدہ علیحدہ خدمت لے کر انسان کی طبیعت قناعت کرے بلکہ انہیں آپس میں لڑا لڑا کر ایجادات کر رہا ہے، آگ پانی کے درمیان لوہے کا پردہ حائل کر کے آگ کو دھونکا دیا، آگ جوش میں پانی کو اُڑانا چاہتی ہے، پانی کھول کر آگ کو ٹھنڈا کرنا چاہتا ہے، لیکن انسان کے جوش و خروش سے اسٹیم کی طاقت پیدا کر کے انجن مشین چلا رہا ہے، پھر پانی کو پانی سے ٹکرا کر برق پیدا کر لی، وہ بجلی جو آنِ واحد میں اقلیموں کی خبر سنائے، اسے تانبے اور جست کے پتلے سے تار میں اس طرح باندھ رکھا ہے کہ بایں زور و طاقت باہر نہیں جاسکتی، ذرا سا سوئچ ہے اسے دبادو تو موجود، اُٹھادو تو غائب، پھر اسی پر بس نہیں بلکہ آسمان کی جہاں سوز بجلی کو بے بس کر دیا، بڑی بڑی بلڈنگوں پر چپٹے تار چڑھا دیئے، اِدھر یہ بجلی گری، اُدھر ان میں غلطاں و پیچاں ہو کر رہ گئی۔

پیٹرول جیسی سیال چیز میں آگ لگادی اور آگ اور تیل لڑ رہے ہیں جس سے گیس پیدا ہو رہی ہے، اور حضرتِ انسان کا جہاز اُڑ رہا ہے، موٹر دوڑ رہی ہے۔

الغرض ایک مشت استخواں نے ساری کائنات کا ناک میں دَم کر رکھا ہے، سوال یہ ہے کہ اس غلبہ و تسلط کا سبب کیا ہے؟ جسمانی طاقت سے تو ناممکن ہے، اس لئے ضروری ہے کہ اس کا راز کچھ اور ہی ہو۔

اندرونی طاقت

ایک شیر نے اپنے خورد سالہ بچے کو نصیحت کی تھی کہ انسان سے بچنا یہ بڑی چیز ہے، بچہ شیر اس بڑی چیز کے دیدار میں مارے مارے پھرتا تھا کہ آخر دیکھوں تو سہی وہ انسان کیا بلا ہے جس سے سلطان الصحراء بھی لرزتے ہیں، کپکپاتے ہیں، چلتے چلتے گھوڑے پر نظر پڑی، اس کی مخصوص صفات سے بچہ شیر کو انسان کا دھوکا ہوا، پوچھا تو معلوم ہوا، گھوڑے نے کہا: توبہ بھلا میں انسان کے ہاتھ میں ایک بے بس قیدی

ہوں اس سے بچنا۔ اب بچہ شیر اور گھبرایا، آگے بڑھنے پر اُونٹ پر نظر پڑی، اس کے عجیب الخلقت جسم کو دیکھ کر سوچا کہ بنی نوعِ انسان ہوگا، پوچھنے پر پتہ چلا کہ نہ صاحب ہم تو اس کے ادنیٰ چاکر ہیں، وہ جو ہماری درگت بناتا ہے تو بہ بھلی اس سے بچنا۔ ذرا آگے ہاتھی پر نگاہ پڑی اس نے بھی اپنی چاکری کا اعتراف کرتے ہوئے پناہ مانگی۔ بچہ شیر حیران تھا کہ یا اللہ! وہ انسان کیا بلا ہے جس سے گھوڑا، اُونٹ اور ہاتھی تک لرزتے ہیں۔ اسی اثناء میں ایک بڑھئی کے بچے کو دیکھا جو ایک بڑے شہتیر کو چیر رہا تھا، اور جتنا چیر چکا تھا اس میں ایک کھونٹی گاڑ رکھی تھی، بچہ شیر کا تصوّر بھی نہ ہوسکتا تھا کہ یہ انسان ہوگا، لیکن معلومات کے لئے پوچھا تو پتہ چلا کہ حضرتِ انسان یہی ہے، بچہ شیر نے کہا کہ: میرا باپ اور ہاتھی، گھوڑا، اُونٹ بڑے احمق تھے، اس سے ڈرتے رہے، ایک چپت میں اس کا کام تمام کردُوں گا، بڑھئی کے بچے نے سوچا بُرا وقت آیا، کیا کیا جائے؟

اس نے بچے کی خوب تعریف کی جس سے وہ مست سا ہوگیا، پھر اس نے کہا کہ میں کمزور ہوں، حسنِ اتفاق سے آپ جیسا قوی آگیا، شہتیر کی کھونٹی سرکانا چاہتا ہوں، آپ اس کے شگاف میں ہاتھ اندر ڈال کر ذرا تھام لیں کہ میں سرکالوں، شیر نے ایک کے بجائے دونوں ہاتھ ڈال دیئے، بڑھئی کے بچے نے کھونٹی نکال لی، اس کا نکلنا تھا کہ دونوں پٹ مل گئے، پھر بچہ شیر کا جو حشر ہوا وہ ظاہر ہے، شیر نادم ہوا کہ بڑوں اور تجربہ کاروں کی نصیحت کی قدر کرنی چاہئے، لیکن ساتھ ہی یہ سوچا کہ انسان حقیر اور کمزور ہے، اس کا جثہ اس قابل نہیں، ہاں! البتہ کوئی اندرونی طاقت ہے جس سے اس نے ساری دُنیا کو بے بس کر رکھا ہے۔

الغرض یہ حکایت عبرت اور انسانی طاقت سامنے لانے کے لئے پیش کی گئی ہے، اور مشاہدات کی رُو سے ماننا پڑتا ہے کہ انسان میں ان عناصر سے کہیں زیادہ طاقت ہے، جب ہی تو اس نے جہانِ رنگ و بو کو تہہ و بالا کر رکھا ہے، اور جیسا کہ ثابت

ہوگیا کہ عناصرِ اَربعہ سے اس میں طاقت کہیں زیادہ ہے تو ماننا پڑے گا کہ اس میں لطافت بھی زیادہ ہے کیونکہ پہلے ثابت ہوچکا ہے کہ لطافت ہی طاقت کا سرچشمہ ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ لطافت کیا ہے؟ تو سیدھا اور آسان جواب ہے کہ رُوحِ انسانی۔

رُوحِ انسانی

اور رُوحِ انسانی کی لطافت کا یہ عالم ہے کہ باوجود انسان کے رگ و پے میں سمائے ہونے کے کبھی اس کا دھکا تک انسان کو نہیں لگا، بلکہ کبھی مس ولمس تک کا احساس نہیں ہوا، جبکہ ہوا جیسی لطیف چیز میں بھی دھکا اور لمس ومس سے بچنا محال ہے، رُوح منفعل ہے تو اتنی کہ اس کے بغیر انسانی زندگی کا تصوّر نہیں، اور منفعل ایسی کہ کسی حاسہ کی اس تک رسائی نہ ہو، خود اس پر کوئی سرد وگرم نہ پہنچ سکے اس لئے وہ صرف فقط اپنے بدن پر ہی نہیں بلکہ عناصرِ اَربعہ پر غالب آجائے تو ظاہر ہے کہ انسان میں ایسی چیز فقط رُوح ہی ہے، کیونکہ انسان بدن و رُوح کے مجسّمے کا نام ہے، بدن مادّیات کا مرکب ہے، وہ تو یہ کام نہیں کرسکتا، لہٰذا رُوح ہی باقی رہی اور یہی ہمارا دعویٰ ہے کہ انسانی غلبہ وتسلط کا راز رُوح ہی میں ہے، رُوح کی لطافت وحسن نورانیت کا یہ عالم ہے کہ آج تک انسانی عقل اس کا ادراک نہیں کرسکی، اس کا فوٹو نہیں لیا جاسکا، اسے ہوا کی طرح کنٹرول کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں بن سکا، اور ایک رُوح ہے کہ سب کچھ اس کے کنٹرول میں ہے، جہاں بھر کا فوٹو وہ لے لے، سینری وہ بنالے اور سب پر غلبہ و تسلط حاصل کرلے۔

سوال یہ ہے کہ رُوح کیا ہے؟ پیغمبر علیہ السلام سے سوال ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے من جانب اللہ جواب دیا: ''اَلرُّوْحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّیْ'' اور اس اَمرِ رَبی کو رَبِّ کائنات سے عجیب مماثلت ہے، مثلاً حق تعالیٰ غیرمرئی طریق پر تمام عالم کا قیوم و مدبر ہے تو اسی طرح رُوح کائناتِ بدن کی قیوم و مربی ہے، پھر جس طرح انوارِ باری تعالیٰ

کائنات کے ذرّے ذرّے میں آشکارا ہیں اور ہر ہر خطّے و جزء میں اس کی مناسبت سے کام لے رہے ہیں، اور اس ظہور نام کے باوجود آج تک کسی نے انہیں دیکھا نہیں، اسی طرح انوارِ رُوح کائناتِ بدن کے ہر عضو میں اس طرح پھیلے ہوئے ہیں کہ ہر عضو سے مناسب کام لے رہے ہیں، اور اس ظہور نام کے باوجود آج تک کسی نے انہیں نہیں دیکھا، اسی طرح رُوح کے انوار کام ہر عضو میں کر رہے ہیں، نظر نہیں آتے ؎

بے حجابی یہ کہ ہر ذرّہ سے جلوہ آشکارا
اس پہ گھونگھٹ یہ کہ صورت آج تک نادیدہ ہے

گو جس طرح وہ ظاہر ہے اور باطن بھی، اسی طرح یہ بھی ظاہر بھی باطن بھی۔

پھر جس طرح اس کائنات کی زندگی اور زندگی کی ہر نقل و حرکت سے ذاتِ حق اوّل اور تعدم ہے کہ اللہ ہی معلیٰ وجود ہے اسی طرح ذاتِ حق کائنات کی ہر نقل و حرکت کا منتہا بھی ہے ٹھیک اسی طرح بدنی کائنات کی نقل و حرکت بلکہ اس کے نفس کی ہستی سے بھی رُوح اوّل بھی ہے اور آخر بھی، کیونکہ رُوح ہی بدنی حیات کا باعث ہے، جب یہ نہ تھی تو بدن نہ تھا اور بعد میں بھی یہی ہوگی، تو یہ کہنا بجا ہے کہ جس طرح کائناتِ عالم اوّل و آخر ذاتِ حق ہے، اسی طرح کائناتِ بدنی کی اوّل و آخر رُوح ہے۔

قوّت کا سرچشمہ

پھر جس طرح ذاتِ حق عالم سے متصل اتنی کہ: ''نَحْنُ أَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ'' اور ''هُوَ مَعَكُمْ أَیْنَ مَا كُنْتُمْ'' اس کی شان ہے، اور پھر منفصل اتنی کہ وراء الوراء ثم وراء الوراء، مخلوق ظلمتِ محض اور وہ نورِ مطلق، ٹھیک اسی طرح رُوح بھی بدن سے متصل تو اتنی ہے کہ زندہ بدن کی کسی رگ کا کروڑواں حصہ بھی اس سے الگ نہیں، ورنہ زندہ نہ رہے، لیکن دُور بھی اتنی ہے کہ اس کی پاکیزگیاں بدن سے کوئی لگاؤ ہی نہیں رکھتیں کیونکہ لطیف و کثیف میں کیا تناسب اور کیا رشتہ؟

اس ساری تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ انسانی قوّت و طاقت کا سرچشمہ رُوح ہے اور اسے ذاتِ حق سے مناسبتیں ہی نہیں مماثلتیں بھی ہیں اور یوں بھی رُوح اَمرِ رَبّی ہے، کما مرّ، تو اس کو جتنا صحیح استعمال کیا جائے گا اتنے بہت فوائد رُونما ہوں گے، جتنی غلط روی کا طریق اپنایا جائے گا اتنی ہی بربادیاں ہوں گی، تو پہلے ایک مشرقی محقق کا قول لکھا تھا کہ سائنس میں مقصود وسیلہ کی نسبت ہے، کتنا دُرست قول ہے، اللہ تعالیٰ جو سراپا لطافت ہی نہیں بلکہ منبعِ لطافت ہے، کما قال: "اِنَّ اللهَ لَطِيفٌ" (لقمان:۱۶)

دُوسری طرف رُوح بھی اَمرِ رَبّی ہونے کے سبب لطیف ہے، اور لطافت ہی قوّت کا سرچشمہ ہے، اور بغیر قوت سائنسی ایجادات ناممکن ہیں، تو بے جا نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ جس طرح لطافتوں کا منبع حق تعالیٰ کی ذات ہے اسی طرح منبعِ طاقت بھی وہی ہے، اور جب منبعِ طاقت وہ ہے تو سائنسی ایجادات کا سرچشمہ اور محوَر و مرکز بھی اسی کی ذات ہے، اپنی پاک دامنی، نیک نفسی اور قوت و تقویٰ و نیکی کی بنا پر جس کی رُوحانیت جتنی بلند ہوگی اس میں اکتشافات و ایجادات کی طاقت ہوگی، جب یہ مقدمات ثابت ہوگئے تو یہ کہنا بالکل بجا ہوگا کہ منبعِ لطافت و طاقت کی طرف سے بھیجا ہوا آخری اور مکمل دِین اِیجاد و اِکتشافات سے کس طرح روک سکتا ہے اور ترقی کی راہ میں کس طرح آڑے آسکتا ہے؟ وہ دُنیا والوں کی ترقی کی راہیں بتاتا ہے، اس پر اُبھارتا ہے کہ کما قال: "فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ"، "وَفِي ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ"۔ لیکن مادّیاتِ محض میں انہماک اور غلوّ اور رُوحانی ترقی سے پہلو تہی انتہائی کورچشمی اور بدبختی ہوگی۔ جب یہ اُمرِ مُسلَّمہ ہے کہ اسلام مقصود ہے اور سائنس وسیلہ تو مقصود کے لئے اس کے تناسب سے اور وسیلے کے لئے اس کے تناسب سے کوشش کرنا دانش مندی ہے۔ بدقسمتی سے آج مقصود کو کوئی پوچھتا نہیں اور وسیلے کے لئے جو کچھ ہو رہا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں، (یہ ہم آئندہ عرض کریں گے کہ وسیلے کے لئے جائز و ناجائز کوششوں سے دُنیا کو کیا فائدہ پہنچا اور تعمیر و ترقی کے عالم میں ان کوششوں

کا حصہ کیا ہے) پھر بد قسمتی سے مسلمانوں کے ہاں سوائے سائنس کا لٹریچر پڑھنے کے کوئی عملی کارفرمائی ہے ہی نہیں، گویا ۔

نہ خدا ہی ملا، نہ وصالِ صنم

خلاصۂ بیان

بہرحال اس اُصولی بحث سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہوئی کہ:-

۱- سائنس کا موضوع عناصرِ اَربعہ یا بالفاظِ دیگر ''مادّہ اور اس کے عوارضِ ذاتیہ ہیں۔''

۲- عناصرِ اَربعہ میں سے جس میں جس قدر لطافت ہے اسی قدر اس میں طاقت ہے، اور وہی لطافت اس کی طاقت کا سرچشمہ ہے۔

۳- حضرتِ انسان موالیدِ ثلاثہ کی بے انتہاء شاخوں میں ایک ایسا ہے جس نے اپنی بے انتہا قوتوں سے عناصرِ اَربعہ کو فرداً فرداً نہیں بلکہ باہمی ٹکرا کر ایجادات و اکتشافات کا لامتناہی سلسلہ جاری کر رکھا ہے، اور اس طرح اپنے غلبہ وتسلط کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔

۴- حضرتِ انسان کا یہ کمال اس کی جسمانی قوت کا مرہونِ منّت نہیں بلکہ رُوح کا مرہونِ منّت ہے۔

۵- رُوح کو حضرتِ حق سے کئی ایک مماثلتیں ہیں کہ رُوح اَمرِ رَبی ہے۔

۶- قوت و طاقت کا سرچشمہ حضرتِ حق کی ذات ہے، کیونکہ وہ منبعِ لطافت ہے، اور طاقت دراصل لطافت کے سبب ہے۔

۷- اس اعتبار سے منبعِ لطافت کے اُمر یعنی رُوح سے جس کا جس قدر حصہ ہوگا اس کی قوت و ایجادات و اکتشافات اسی قدر بلند و بالا ہوگی۔

۸- لیکن اسلام اور سائنس کو مقصود و وسیلہ کی نسبت ثابت ہوگی۔

اس لئے ایک سچے مسلمان کی ہمت وفکر کا اصل میدان اسلام ہوگا اور وسیلے کا میدان اسی تناسب سے ہوگا، جب اسلام و سائنس میں مقصود و وسیلہ کی نسبت ثابت ہوگئی تو:-

الف- ایک مفکر کا یہ قول غلط فہمی پر مبنی ہوگا کہ سائنس اور مذہب کی حقیقت تک پہنچنے کے دو راستے ہیں۔

ب- سائنس کو اِلحاد کے مترادف قرار دینے والا گروہ سراسر غلطی کا شکار سمجھا جائے گا۔

ج- اور نہ ہی سائنس و مذہب ایک دُوسرے کی ضد ہوں گے، بلکہ ان میں معقول نسبت ہے اور اپنے اپنے مقام پر اس سلسلے میں قوتِ فکر کی پرواز دُرست اور صحیح ہوگی، اس لئے یہ کہنا بالکل بجا ہوگا کہ ''ارتقاء پسند انسانی عقل اور ربانی ہدایات کا سنگم اسلام ہے''۔

آخر میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کر دینا مناسب ہے، جس میں سائنس و مذہب کی اصلیت و حقیقت اور باہمی فرقِ مراتب کو نہایت اَحسن پیرایہ میں بیان فرمایا گیا، یہ ارشادِ رسول بھی اس چیز کی غمازی کرتا ہے کہ سائنس و مذہب ایک دُوسرے کی ضد نہیں، بلکہ جن چیزوں پر آج طبع آزمائی ہو رہی ہے ان کو اپنے اصلی مقام پر رکھ کر ایک نبیٔ اُمی نے آج سے چودہ سو سال پہلے واضح کر دیا تھا ؎

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

فاعتبروا یا اُولی الابصار! نبیٔ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: جب اللہ میاں نے زمین کو پیدا کیا تو وہ کانپنے اور ڈَرنے لگی، تب اللہ نے پہاڑوں کو پیدا کیا اور ان سے زمین پر جم جانے کے لئے فرمایا، ملائکہ نے پہاڑوں کی شدّتِ صلابت پر تعجب کیا اور کہا کہ: اے پروردگار! تیری مخلوق میں پہاڑوں سے بھی زیادہ سخت ہے؟ فرمایا: ہاں! لوہا ہے، اس پر پھر ملائکہ نے عرض کیا کہ: اے پروردگار! تیری اس مخلوق میں

لوہے سے بھی بڑھ کر کوئی سخت چیز ہے؟ فرمایا: ہاں! آگ ہے، پھر عرض کیا: اور آگ سے سخت؟ ارشاد فرمایا: پانی! عرض کیا: اور پانی سے سخت کوئی چیز ہے؟ فرمایا: ہاں! ہوا، پھر ملائکہ نے پوچھا: اور ہوا سے بڑھ کر بھی سخت چیز کوئی ہے؟ تو فرمایا: اولادِ آدم جو دائیں ہاتھ سے اس طرح چھپا کر صدقہ کرے کہ بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ (ترمذی)

اندازہ لگائیں کہ سائنس کے موضوع یعنی مادّیات کو کس طرح ترتیب سے بیان فرما کر اور پھر انسان کی طاقت وقوت کو واضح فرمایا، لیکن اس طاقت کا سبب کوئی مادّی چیز نہیں، بلکہ وہی رُوحانی عظمت و برتری ہے جس کو پہلے ہم تفصیل سے عرض کر چکے ہیں۔

(ماہنامہ ''الحق'' اکوڑہ خٹک اکتوبر ۱۹۸۳ء)

قاری محمد طیب صاحب
افکار وسوانح
حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا
مقامِ دعوت وتجدید

حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب قاسمی رحمہ اللہ سے دارالعلوم حقانیہ کی آمد ۱۳-۱۴/اکتوبر ۱۹۶۸ء مطابق ۲۰-۲۱/رجب ۱۳۸۸ھ کی درمیانی شب کے موقع پر ''الحق'' کے مدیرِ شہیر نے بانیٔ دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی شخصیت، ان کے مقام دعوت و تجدید، علمی، سیاسی، معاشرتی اور تجدیدی کارناموں پر ایک مفصل معرکۃ الآراء تاریخی انٹرویو لیا تھا، حضرت قاری صاحب رحمہ اللہ کے تذکرہ کے ساتھ مناسب تھا کہ اس انٹرویو کو بھی شامل کیا جائے۔

پچھلے دنوں جب حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب قاسمی مہتمم دارالعلوم دیوبند نے اپنے سفرِ پاکستان کے دوران اپنی خاص محبت اور تعلق کی بناء پر دارالعلوم حقانیہ کو بھی اپنی تشریف آوری سے نوازا اور دارالعلوم حقانیہ کی فضائیں حضرت کی آمد کی وجہ سے پُرنور مجالس اور محافل سے سراپا نور بن گئیں، تو اچانک دِل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ماہنامہ ''الحق'' کے لئے مرکزِ اسلام کے مدیرِ شہیر اور حضرت حکیم الاسلام مولانا نانوتویؒ کے علوم و اسرار کے امین سے ایک انٹرویو ریکارڈ کرایا جائے، اِدھر یہ خواہش

اُدھر حضرت کی مصروفیات، اِردگرد پروانوں کا ہجوم اور پھر حضرت کی علالت اور تھکاوٹِ سفر کے ساتھ ساتھ تازہ زکام اور نزلہ اس پر مستزاد، مگر خدا کی خاص دستگیری تھی کہ رات گیارہ بجے کے بعد اس مقصد کے لئے کچھ یکسوئی کا وقت نکل ہی آیا۔

حضرت سے پہلا سوال دارالعلوم دیوبند کے مستقبل کے بارے میں تھا، بھارت سے مسلمانوں کی ثقافت، پرسنل لاء اور ثقافتی مراکز کے متعلق جو خبریں آتی ہیں وہ اگرچہ مبالغہ آمیز سہی لیکن پریشان کن ضرور ہوتی ہیں، پھر مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند کا تو خیال آتے ہی دِل کی دھڑکنیں تیز ہوجاتی ہیں کہ ؎

عشق ست و ہزار بدگمانی

جس شجرۂ طیبہ کے لئے حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، شاہ عبدالعزیز اور حاجی امداداللہ مہاجرِ مکیؒ اور شہدائے بالاکوٹ نے زمین ہموار کی، جس کی داغ بیل حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور فقیہ الاسلام مولانا رشید احمد گنگوہیؒ جیسے سراپا اِخلاص وعمل بزرگوں نے رکھی، پھر جس کی آبیاری میں شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ، مولانا انور شاہ کشمیریؒ اور شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ جیسے اساطینِ اُمت نے اپنی زندگی تج دی، آج انوار و معارفِ قاسمیہ کے امین اور بانیٔ دارالعلوم کے حفیدِ رشید مولانا محمد طیب قاسمی سے پہلا سوال اسی دارالعلوم دیوبند کے بارے میں تھا جس کی تعمیر و تشکیل سے خود حضرت قاری صاحب مدظلہٗ کی پوری زندگی کی داستان وابستہ ہے

حضرت نے پورے اعتماد، مضبوط ایمان اور توکل سے بھرپور انداز میں جواب دیا:-

جی ہاں اللہ بہتر کرے، بنیاد تو اس کی ایسی ہی ہے کہ مستقبل روشن ہے، اِن شاء اللہ اور یہ اس لئے کہ بڑی بڑی گھاٹیاں آئیں، اللہ تعالیٰ نے اسے محفوظ رکھا، بڑے بڑے مخالف پیدا ہوئے مگر اللہ کا فضل ہے وہ بڑھتا ہے رہا۔

اطمینان اور تسلی کے لئے یہی کچھ کافی تھا، مگر یکا یک دھیان مولانا محمد یعقوب صاحبؒ صدرِ اوّل دارالعلوم دیوبند کے ایک مکاشفہ یا پیشین گوئی کی طرف گیا

جسے کہیں پڑھا یا سنا تھا، اور پھر جب یہ خیال آیا کہ دارالعلوم اپنی زندگی کے سو سال تو پورے کر چکا ہے تو گویا دِل و دماغ پر ایک بجلی سی کوند پڑی اور سائل نے حکیم الاسلام قاری محمد طیب سے اس بارے میں پوچھا کہ حضرت! کسی بزرگ غالبًا مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا ایک مقولہ سننے میں آیا ہے کہ سو سال تک تو اس دارالعلوم کا خدا محافظ ہے، اس کے بعد حق تعالیٰ کی شانِ بے نیازی کا جو فیصلہ ہو۔ حضرت نے اس کا جواب دیا اور یکا یک فکر و اضطراب کی گھٹائیں اطمینان اور اُمید کی قندیلوں سے روشن ہوگئیں، حضرت نے فرمایا:-

نہیں! اتنا میں نے سنا ہے کہ یہ مدرسہ چلتا رہے گا، چلتا رہے گا یہاں تک کہ ہندوستان میں انقلاب ہو اور یہ مدرسہ پھر اسلامی حکومت کے ہاتھ میں چلا جائے، اس پیشین گوئی سے ہم تو بڑی اُمیدیں باندھے ہوئے ہیں۔ پھر حضرت نے خود فرمایا: یہ ایک عجیب بات ہے اور اب تک تو پوری ہوتی آرہی ہے۔

حضرت قاری صاحب وضاحت فرما رہے تھے اور چشمِ تصوّر نے دہلی کے لال قلعہ پر ہلالی پرچم لہراتا دیکھا، کانوں نے اس کی سرسراہٹ محسوس کی اور مسلمانوں کی عظمتوں کی امین سرزمین پر شوکتِ اسلام کے تصوّر ہی سے دِل خوشی سے جھوم اُٹھا، مگر کیا خبر کہ یہ سنہرا خواب بھی زندگی کی اور حسرتوں کی طرح شرمندۂ تعبیر ہوتا ہے یا نہیں؟ اس اُمید وبیم میں راقم الحروف نے اپنی بات دُوسرے پیرایہ میں دُہرائی۔

حضرت! تجدید دِین کا زمانہ تو اَشخاص و اَفراد کے لحاظ سے سو سال کا ہوتا ہے، تو یہ تو دِین اور علومِ دِین کا ایک مجدّد ادارہ ہے، تو اس کی عمر تو ہزاروں سال ہونی چاہئے۔ ابھی میں نے اپنی بات پوری نہیں کی کہ حضرت نے ایسا اُمید افزاء اور ایمان پَرْوَر جواب دیا کہ دِل و دِماغ میں فکر و اضطراب کی بجائے خدا کی رحمت اور وعدۂ حفاظتِ دِین کے یقین کی شمع فروزاں ہوئی، حضرت نے فرمایا:-

میں نے اپنے بزرگوں مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ اور دیگر حضرات سے کئی

بار سنا ہے کہ مجدّد کے لئے شخصِ واحد کا ہونا ضروری نہیں بلکہ جماعت بھی ہوسکتی ہے، اور ان حضرات نے فرمایا کہ یہ جو حضرت گنگوہیؒ، حضرت نانوتویؒ اور ان اکابر کی جماعت ہے یہ سب مجدّد ہیں جنھوں نے سنت اور بدعت میں، معروف اور منکر میں تمیز پیدا کی۔ اور اس کے بعد فرمایا کہ ان حضرات کی تجدید کا مظہرِ اَتم یہ دارالعلوم ہے اسی کو مجدّد کہا جائے۔ اور مولانا عزیزالرحمٰنؒ نے دُوسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا تھا کہ یہ جو عمل ہے تجدید دِین کا اس کی نسبت اور قیام کا مرکز ہے دارالعلوم، اور ہندوستان میں یہ دارالعلوم قطب الرّحیٰ کی حیثیت رکھتا ہے، جیسے چکی کے پاٹوں کے بیچ میں کِلّی ہوتی ہے تو اس کے اِردگرد چکی کے پاٹ گھومتے ہیں، اسی طرح یہاں کے نہ صرف دِینی معاملات بلکہ ملکی معاملات بھی اس کے اِردگرد گھوم رہے ہیں، اس کے اندر کچھ قوت اور مقناطیسی طاقت خدا نے رکھی ہے۔ اور تیسری بات جس سے ڈھارس بندھتی ہے وہی مولانا یعقوب صاحب کا مقولہ کہ: ”یہ دارالعلوم چلتا رہے گا، یہاں تک کہ ہندوستان میں انقلاب آجائے اور یہ پھر اسلامی حکومت کے ہاتھ میں چلا جائے“۔

حضرت اپنی بات ابھی سمیٹ رہے تھے کہ حضرت شیخ الحدیث صاحب مدظلہ مجلس میں تشریف لائے اور حضرت کے پہلو میں بیٹھ گئے، حضرت نے ان کی طرف متوجہ ہوکر انٹرویو کی ستم کاری کا شکوہ اس ظرافت آمیز انداز میں فرمایا کہ: ان لوگوں کا منشاء یہ ہے کہ تم رات کو بھی جاگے ہو، دن کو بھی نہیں سونا چاہئے، اور کل کو آٹھ گھنٹے کا سفر ہے جاگ کر چلے جانا تاکہ مجاہدہ مکمل ہوجائے۔

بزرگوں کی شفقت سے طبیعت میں جو گستاخی اور شوخی آگئی ہے اس کی بناء پر عرض کیا گیا کہ: حضرت! پورے سفر میں ہماری ”قدر شناس میزبان حکومت“ نے آپ کی تقریروں پر پابندی لگا کر آپ کو بڑی راحت پہنچائی ہے، اب ہم کل سے اس کی کسر یہاں دارالعلوم حقانیہ میں نکالنا چاہتے ہیں۔ حضرت نے جن کی طبیعت کو خدا نے شکوہ و شکایت کی بجائے صبر و تمکنت اور تحمل کی نعمت سے بڑی فراوانی سے نوازا ہے، ہماری

اسلامی حکومت کے اس سراسر نامناسب اقدام پر احتجاج یا افسوس کی بجائے احسان مندی کے لہجے میں فرمانے لگے کہ: جی ہاں! یہ تو واقعی یہاں کی حکومت کا میرے ساتھ نادانستہ احسان ہے، یا پھر میرے ضعف، بڑھاپے اور علالت پر خداوند کریم کا غیبی کرم، ورنہ تقریر پر پابندی نہ ہوتی اور ہر جگہ دوستوں کے تقاضے پر مجھے بولنا پڑتا تو شاید میری طبیعت اس کی متحمل نہ ہوسکتی، گو میں تو وہاں سے یہ ارادہ کرکے آرہا تھا کہ تقریر و بیان سے حتی الوسع علالت کی وجہ سے پہلو تہی کروں گا۔ عالمِ اسلام کے ایک جلیل القدر عالمِ دِین اور مسلمانوں کے قابلِ فخر بزرگ کی اپنے ملک میں اس ''پذیرائی'' کا ذکر چھیڑ کر مجھے خود ندامت اور خفت محسوس ہونے لگی، مگر حضرت کی زبان سے ایسا تبصرہ سن کر اپنے اکابر کی شرافتِ نفس اور علوِّ اخلاق کا ایک پہلو تو سامنے آہی گیا۔

اس کے بعد گویا اصل انٹرویو شروع ہوا اور ایک پرزہ جس پر عجلت میں چند سوالات لکھے گئے، حضرت کی طرف بڑھایا گیا، حضرت نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور پھر گویا ہماری طفلانہ خواہش اور تنگیٔ داماں دیکھ کر مسکرانے لگے: ''ارے بھئی یہ تو بڑے لمبے سوال ہیں، ان میں سے کسی ایک سوال کے ایک گوشے پر گفتگو کے لئے بھی یہ پوری رات ناکافی ہے۔'' مگر ایک سدابہار گلشن سے گزرنے والے کسی سراپا شوق کی نظر تو اپنی تنگ دامنی سے زیادہ انواع واقسام کی زیبائش اور رعنائی پر ہوتی ہے، اس کے دامانِ نگاہ میں تو پورا چمن سمیٹ لینے کی چیز ہے کہ پھول ہے تو یہی، اور سرسبز و شاداب گوشہ ہے تو بس یہی۔

سب سے پہلا سوال حجۃ اسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے بارے میں تھا جن کے سر پر خدا نے ظلمت کدۂ ہند میں حفاظتِ دِین کا سہرا باندھا اور جن کی مؤمنانہ بصیرت، مجاہدانہ جدوجہد، حکیمانہ علوم اور جدید علمِ کلام کی وجہ سے خداوندِ کریم نے دورِ غلامی میں اسلام اور اسلامیانِ ہند کے علوم وتہذیب کو محفوظ رکھا۔ بلاشبہ اس امامِ کبیر کی نظیر قرونِ اُولیٰ ہی میں مل سکتی ہے، علم میں، عمل میں، جہاد اور ریاضت میں،

تدبر اور سیاست میں، تصوف اور سلوک میں حضرت حجۃ الاسلامؒ یکتائے روزگار تھے، ایک نقاد عالم نے بالکل صحیح کہا کہ حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کی ذات ستودہ صفات اُنیسویں صدی کے نصفِ آخر میں بے شبہ آیت من آیات اللہ تھی۔ آپ کے علمی، اخلاقی اور رُوحانی کارنامے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ قدرت نے رازیؒ کا فلسفہ، شعرانیؒ کا علم الکلام، غزالیؒ کا سوز وگداز، ابنِ تیمیہؒ کا صولتِ بیان، شاہ ولی اللہؒ کی حکمت و دانش، شیخ احمد سرہندیؒ کی غیرت وحمیتِ اسلامی اور ٹیپوؒ کی شجاعت، یہ سب چیزیں کس فیاضی سے ایک شخص میں جمع کردی تھیں۔ اور بقول حضرت حکیم الاُمۃ مولانا تھانویؒ ہمارے اکابر تو وہ ہیں کہ اگر ان کی کتابوں کا عربی ترجمہ کرادیا جائے اور بتلایا نہ جاوے تو دیکھنے والے رازیؒ اور غزالیؒ ہی کی سمجھیں گے۔ اور آج حضرت قاری صاحب سے اُسی اِمامِ دعوت وعزیمت، سرخیل اربابِ صدق وصفا، علم بردار جہادِ حریت اور نابغۂ روزگار شخصیت کے مقامِ دعوت وعزیمت پر کچھ روشنی ڈالنے کے لئے کہا گیا تھا، اور حجۃ الاسلامؒ کے پوتے فرمارہے تھے کہ: حضرت نانوتویؒ نے زندگی میں جو کام انجام دیئے وہ تو بہت زیادہ ہیں، لیکن بنیادی طور پر تین بڑے بڑے کام انجام دیئے۔ سب سے پہلا کام دارالعلوم دیوبند کا قیام ہے، یہ اتنا عظیم کام ہے کہ پوری دُنیا پر اس نے اثر ڈالا ہے۔ دُوسرا کام یہ ہے کہ حضرت نانوتویؒ خلافتِ اسلامیہ کی تائید میں ہمہ وقت منہمک رہے، سلطان عبدالحمید خان خلیفہ تھے، گو وہ خلافت نام کی رہ گئی تھی مگر حضرتؒ چاہتے تھے کہ وہ نام ہی قائم رہے، اس سے تمام ممالکِ اسلامیہ میں ایک مرکزیت قائم رہے گی۔ اس لئے حضرتؒ نے خود بھی سلطان کی حمایت میں قصیدے لکھے، مولانا محمد یعقوبؒ اور مولانا ذوالفقار علیؒ سارے بزرگ رطب اللسان رہے اور جب بھی ترکوں سے کسی کی جنگ ہوئی یہ حضرات ترکوں کی حمایت میں کھڑے ہوئے، کہیں چندہ جمع کر رہے ہیں، کہیں رائے عامہ پیدا کر رہے ہیں، غرض ہمہ وقت مصروف رہتے، تو مقصد یہی تھا کہ خلاف کا نام قائم رہے تاکہ تمام

ممالکِ اسلامیہ میں کچھ نہ کچھ اِرتباط تو قائم رہے۔ اور تیسری چیز یہ انجام دی کہ دیوبند اور نواحِ دیوبند میں نکاحِ بیوگان کو انتہا درجے کا عیب سمجھا جاتا تھا، اور یہ چیز ہندوؤں سے آئی تھی، اگر کسی نے نام بھی لیا تو تلواریں نکل آتی تھیں، حضرتؒ نے نہایت لطیف پیرایہ میں اس کی تحریک شروع کی، جب اندرونی طور پر خواص کو اپنا ہم خیال بنایا تو اس کے بعد جلسۂ عام کیا، ہمارے یہاں دیوان کا دروازہ جو ہے وہ نواب لطف اللہ خان مرحوم کا محل ہے جو اورنگ زیبؒ کے وزیرِ خارجہ تھے، اور دیوبند میں عثمانیوں کے مورثِ اعلیٰ تھے، اُس میں حضرتؒ نے وعظ فرمایا، بہت بڑا مجمع تھا، درمیان میں ایک شخص اُٹھا اور کہا کہ: حضرت! مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ فراست سے سمجھ گئے کہ کیا کہنا ہے؟ جواب میں فرمایا کہ ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں، ایک ضرورت پیش آئی، لوگوں نے سمجھا کہ استنجاء وغیرہ کی ضرورت پیش آئی ہوگی، حضرتؒ گھر میں گئے، حضرتؒ کی بڑی بہن بیوہ تھیں، ۹۵ برس کی عمر میں نہ نکاح کے قابل نہ کچھ، مگر اعتراض کرنے والے کو اس کی کیا ضرورت ہے، وہ تو یہ کہتا ہے کہ آپ دُنیا کو نصیحت کرتے ہیں مگر آپ کی بہن تو گھر بیٹھی ہے، گھر میں گئے تو بڑی بہن کے پیروں پر ہاتھ رکھا، انہوں نے گھبرا کر کہا کہ: بھئی تم عالم ہو یہ کیا کر رہے ہو؟ فرمایا: میں بہرحال آپ کا چھوٹا بھائی ہوں، آج ایک سنتِ رسولؐ زندہ ہوتی ہے، اگر آپ ہمت کریں تو آپ پر موقوف ہے۔ فرمایا کہ: میں ناکارہ اور سنتِ رسولؐ کی احیاء میری وجہ سے؟ حضرتؒ نے فرمایا کہ: آپ نکاح کرلیجئے۔ فرمایا کہ: بھئی تم میری حالت دیکھ رہے ہو، منہ میں دانت نہیں، کمر جھک گئی، ۹۵ برس میری ہے۔ کہا: یہ سب میں جانتا ہوں مگر اعتراض کرنے والے اس چیز کو نہیں دیکھتے۔ تو فرمایا کہ: اگر سنتِ رسولؐ میری وجہ سے زندہ ہو سکے تو میں جان قربان کرنے کو بھی تیار ہوں۔ تو اُن کے دیور کی بیوی کا انتقال ہوا تھا اور ان کے خاوند کا وہاں پر جو چودہ پندرہ آدمی تھے خاندان کے انہی افراد کے سامنے نکاح پڑھایا گیا، گواہ بنادیئے گئے، اس میں کچھ دیر لگ گئی، پھر حضرت نانوتویؒ

باہر آئے اور مجمع میں دوبارہ تقریر شروع کی، وہی سائل پھر کھڑا ہوا کہ کچھ عرض کرنا ہے، فرمایا: کہئے! اس نے کہا: آپ دُنیا کو نصیحت کر رہے ہیں اور آپ کی بہن بیوہ بیٹھی ہے تو ہم پر کیا اثر ہوگا؟ فرمایا: کون کہتا ہے؟ ان کے نکاح کے تو شاید گواہ بھی یہاں موجود ہوں گے، دو تین آدمی درمیان میں کھڑے ہوئے اور کہا کہ ہمارے سامنے نکاح ہوا ہے۔ اصلاحِ معاشرت اور رُسومات کے مٹانے کے لئے حضرتؒ نے خود اپنے گھر سے قربانی پیش کی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسی مجلس میں ستر، اَسّی نکاح پڑھے گئے اور پھر یہ سنت ایسی کھلی کہ ہزاروں بیواؤں کا نکاح ہوگیا۔

تو پہلی چیز تو دارالعلوم کے قیام پر زور دیا، اس کی رُوح فی الحقیقت یہ تھی کہ علومِ نبوّت اگر عام ہوئے اور ایمان سنبھل گئے تو پھر مسلمان سب کچھ کر سکتے ہیں، اور اگر ایمان ہی نہ رہا تو پھر کچھ نہیں کر سکتے، اس لئے کہ جب شوکت اور حکومت جا چکی تو کم از کم دِین تو محفوظ رہ جائے، وہ رہ گیا تو آگے سب کچھ ہو جائے گا۔

اس لئے سفر میں جہاں بھی گئے تو مدارس قائم کرتے چلے گئے، مرادآباد میں مدرسہ شاہی، امروہہ میں مدرسہ چلہ، بریلی میں مدرسہ اشاعتِ علوم، انبیٹھہ اور تھانہ بھوَن میں دِینی مدرسے اور گلاؤٹی میں مدرسہ قاسمیہ قائم کیا، اور جتنے متوسل تھے خطوط لکھتے رہے کہ جہاں ہو مدرسہ قائم کرو، اور یہ حضرتؒ کی ایک بڑی سیاست تھی اور اس کا حاصل یہ تھا کہ قوم کو علوم کے راستے سے تیار رکھنا کہ وہ مضبوطی سے قائم رہے اور جب دِین ہوگا تو آئندہ ممکن ہے کہ ان میں شوکت اور قوّت بھی آجائے۔ ادھر معاشرت کو دُرست کیا، معاشرے کی سب سے بڑی خرابی نکاحِ بیوگان کی طرف توجہ دی۔ تیسری چیز یہ تھی کہ خلافتِ اسلامیہ کی طرف لوگوں کو مائل کیا، ہر وقت اس کا دھیان جس سے میں نے یہی سمجھا کہ حضرتؒ چاہتے تھے کہ اسلامی نظام کی کوئی نہ کوئی نشانی/علامت باقی رہے، اگر ہندوستان میں اسلامی حکومت نہیں ہے تو کم از کم اسلامی حکومت سے تو مربوط رہے، یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کی اُمیدوں کا مرکز بہت دنوں

تک افغانستان رہا، اور برطانیہ کو یہ شکایت رہتی کہ یہ جماعت شورش کر رہی ہے اور افغانستان سے مل کر برطانوی حکومت کا تختہ اُلٹنا چاہتی ہے، مگر ان حضرات کو اس کی کیا پروا تھی؟ افغانستان سے برابر اپنا ایک رابطہ قائم رکھا، اور یہی وجہ ہوئی کہ جب اَمیر نادر خان کا انتقال ہوا اور ظاہر شاہ تختِ سلطان پر بیٹھ گئے تو دارالعلوم دیوبند کی مجلسِ شوریٰ نے مجھے نمائندہ بنا کر بھیجا کہ اَمیرِ مرحوم کی تعزیت اور اَمیرِ موجودہ کی تہنیت کروں، میں افغانستان حاضر ہوا اور میں نے یہ تحریر لکھ کر پیش کی کہ ہمارا مقصد کوئی مالیہ یا چندہ لینا نہیں بلکہ اُن روابط کو زندہ رکھنا ہے جو ہمارے اکابرؒ کے تھے، جس پر صدرِ اعظم نے مجھے بلایا، اَمیر بڑی عنایت و شفقت سے پیش آئے، جب میں قصرِ صدارت میں پہنچا تو ہم لوگ بیٹھ گئے، میرا یہ خیال تھا کہ شاید ملاقات کے کمرے میں بلایا جائے گا، لیکن یکا یک دیکھا کہ خود صدرِ اعظم وہیں آرہے ہیں، ہم سب لوگ کھڑے ہوئے آگے بڑھے تو وہی افغانی طریقے پر معانقہ دایاں بایاں مونڈھا ملا کر پوری محبت کا اظہار انہوں نے کیا، اس کے بعد فرمایا: ''بفرمائید'' آپ آگے چلیں، میں نے کہا: ''نے خلافِ ادب است''، فرمایا: نہیں، نہیں آپ کو آگے چلنا ہوگا اور میں اس کی وجہ بتاؤں گا، اب ہم اس شان سے چلے کہ میں آگے آگے، میرے پیچھے صدرِ اعظم صاحب، ان کے پیچھے سردار نعیم خان اور ان کے پیچھے مولانا محمد میاں صاحب (منصور انصاریؒ) اور ان کے پیچھے غازی صاحب، ترتیب سے ہم آگے بڑھے تو وہ جو رسمی کرسی تھی اُس پر مجھے بٹھلایا اور خود دُوسری کرسی کھینچ کر سامنے بیٹھ گئے، اور فرمایا کہ: اب میں وجہ بیان کرتا ہوں، اور وجہ مختصر یہ ہے کہ حکومتِ کابل کی خدمت ہمیں آپ بزرگوں کی دُعاؤں سے ملی ہے۔ اور یہ اشارہ تھا اس طرف کہ امیر نادر خان صاحب کے چچا، تایا سردار محمد یوسف خان اور سردار محمد آصف خان، یہ دونوں بیعت تھے حضرت گنگوہیؒ سے، اور برطانیہ نے اُنہیں ڈیرہ دون میں نظر بند رکھا تھا، تو یہ حضرات شکار کے حیلے سے گنگوہ آ کر حضرتؒ کی خدمت میں حاضری دیتے تھے اور حضرتؒ کوئی

نصیحت فرمادیتے، آخری دفعہ جب ملاقات ہوئی تو حضرتؒ نے فرمایا کہ: ''جاؤ کابل کی حکومت تمہارے خاندان میں آئے گی اور عدل سے کام کرنا۔'' انہیں حیرت ہوئی کہ کابل کی حکومت سے ہمارا کیا تعلق، امان اللہ کی حکومت تھی، یہ لوگ بنی اعمام میں سے تھے، تو انہیں عہدے، وزارتیں تو ملتی تھیں مگر حکومت کا کوئی سوال نہ تھا۔ وہ سمجھے کہ حضرت نے حوصلہ افزائی کے طور پر ایک کلمہ کہہ دیا ہے، اس کے بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ بچہ سقہ کی حکومت آئی، امان اللہ خان معزول ہوئے، کیونکہ اسی نے مظالم ڈھائے تو قوم متوجہ ہوئی کہ امیر نادر خان کو فرانس سے بلایا جائے، وہ آئے اور حکومت کی باگ ڈور سنبھالی اور پھر شہید ہوگئے۔ تو صدرِ اعظم کا اشارہ اسی طرف تھا۔ پھر صدرِ اعظم نے فرمایا کہ: ہمارے پاس کچھ تبرکات آپ کے بزرگوں کے محفوظ تھے، مولانا نانوتویؒ کی ایک ٹوپی تھی جو میری والدہ کے پاس تھی، اور ہمیں جب کوئی بیماری ہوتی تو والدہ ہمیں وہ ٹوپی اُڑاتی تھیں اور ہمیں شفا ہو جاتی تھی، آج ڈاکٹر رفقی بے (جو ترک ہے) کو ہم چھ ہزار روپے ماہانہ دیتے ہیں مگر اس کے نسخوں سے وہ شفا نہیں جو ان تبرکات کی وجہ سے ہوتی۔ اور فرمانے لگے کہ: بچہ سقہ کے زمانے میں ہمارا گھر لوٹا گیا، لاکھوں روپیہ کا سامان چوری ہوگیا، لیکن ہمیں صدمہ ہوا تو تبرکات کا، جس کا آج تک ہمارے اُوپر اثر ہے۔ پھر صدرِ افغانستان نے فرمایا کہ: یہی وجہ ہے کہ میں آپ کو آگے بڑھا رہا ہوں۔

یہ تو افغانستان سے روابط تھے، اور سلطان عبدالحمید کا ترکوں سے تعلق کا حال معلوم ہوا، جس سے ان حضرات کے ذہن کا اندازہ ہوتا ہے کہ یوں چاہتے تھے کہ کسی طرح اسلامی حکومت بازیافت ہوجائے، مسلمانوں کا اقتدار قائم ہو، شیخ الہندؒ کی بھی یہی تحریک تھی، وہ چاہتے تھے کہ عالَمِ اسلام متحد ہو کر ترک اور افغانستان سب مل ملا کر ہندوستان پر حملہ آور ہوں، حضرتؒ کی یہ تحریک تھی اور وہ ہوئے بھی حملہ آور مگر کچھ تو یہ ملک تیار نہ تھا، کچھ مجاہدین ناتربیت یافتہ تھے، نتیجہ شکست کی صورت میں نکلا، اور یہ

خواہش انہیں ورثے میں اپنے اُستاذ حضرت نانوتویؒ سے ملی تھی، ۱۸۵۷ء میں تو گویا حضرت جوشِ جہاد میں غرق تھے اور بس یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح جان دے دُوں، شاملی میں تلواروں سے مقابلہ بھی کیا۔

الغرض حضرتؒ کی زندگی کے کارناموں میں ایک علمی کارنامہ تو دارالعلوم ہے جس کا فیض اطرافِ عالَم میں پہنچا، دُوسرا معاشرتی کارنامہ ہے، اور تیسرا سیاسی اور اجتماعی کارنامہ کہ تہذیب وتعلیم ہی کے سلسلے میں سہی مگر ممالکِ اسلامیہ میں کوئی نہ کوئی ربط قائم رہے، اس سلسلے میں حضرتؒ نے دارالعلوم دیوبند میں محکمۂ قضاء قائم کیا اور مولانا یعقوبؒ کو قاضی بنایا تو ہزاروں مقدمات جو برسہا برس سے اُلجھے ہوئے تھے منٹوں میں طے ہوئے، لوگوں کا وقت اور مالیہ بچا، یہ سلسلہ جاری رہا، مگر انگریز نے آخر میں آکر توڑ دیا، دیوبند میں ایک تھانیدار کو بھیجا جو بڑا سخت قسم کا آدمی تھا، چنانچہ وہ آیا، رمضان شریف کا آخری عشرہ تھا، اُس نے آکر حضرت نانوتویؒ سے مصافحہ کیا اور بہت جرأت کے ساتھ کہا کہ کیا آپ ہندوستان میں شرعِ محمدی کا جھنڈا گاڑنا چاہتے ہیں؟ یہ کیا آپ نے محکمۂ قضاء قائم کیا ہے؟ حضرتؒ نے بڑی نرمی سے کہا کہ: یہ تو ہم لوگ گورنمنٹ کی مدد کر رہے ہیں جو لاکھوں روپے خرچ کرکے مقدمات فیصل کرتی ہے، ہم نے منٹوں میں فیصل کردیا۔ مگر اس نے کہا کہ: نہیں، آپ پورا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں، میں رپورٹ کروں گا۔ اس پر حضرتؒ کو غصہ آیا اور کہا کہ: کان سے پکڑ کر اسے نکال دو، طالب علموں نے دھکے دے کر اسے نکالا، اور حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ جا ہم تیری رپورٹ کریں گے، نکال دو اس شیطان کو یہاں سے۔ بہرحال عید کا دن آیا، تھانیدار کے ہاں دُودھ کے بالٹے بھرے تھے، کپڑے تیار، خوشیاں منائی جارہی تھیں کہ اچانک گورنمنٹ کا حکم پہنچا کہ اس کی رشوتوں کی انتہاء ہوگئی ہے، اس کو فوری برخاست کیا جائے اور بازار میں دُکان دُکان پر جہاں اس نے رشوت لی ہے پیروں میں رسّی ڈال کر اسے پھرایا جائے، تو اس حالت میں اسے گھمایا گیا کہ یہ

روتے ہوئے کہتا جارہا تھا کہ افسوس میں نے تو رپورٹ نہیں کی مگر مولوی جی نے میری رپورٹ کردی۔ تو اس کا خمیازہ جلد اُس نے بھگت لیا، اس کی جگہ دُوسرا آیا، اس کے بعد ان بزرگوں کی وفات ہوگئی اور وہ محکمہ نہیں چلا۔

تو حضرتؒ کا چوتھا منصوبہ یہ تھا کہ اسلامی پرسنل لاء اور مخصوص قانون شریعت کے مطابق طے ہو، اسی کے تحت دارالعلوم دیوبند کے اکابرؒ نے جب لنڈن سے مسٹر مانڈلے وزیرِ ہند آیا اور جارج کا زمانہ تھا، تو میرے والد صاحب (حافظ محمد احمدؒ) علماء کا ایک وفد لے کر ان سے ملنے کے لئے گئے اور درخواست یہ کی کہ ہندوستان میں محکمۂ قضاء قائم کردیا جائے جس میں شریعتِ اسلام سے مخصوص چیزیں نکاح، طلاق، عدّت، میراث، اوقاف وغیرہ طے ہوں۔ اس نے ظاہر میں تو کہا کہ اسے بادشاہ کی خدمت میں پیش کروں گا اور پارلیمنٹ میں بھی، لیکن یہ ایک وقتی بات تھی، نہ اس نے یہ پیش کیا، نہ ایسا ہوا۔

مگر ان بزرگوں کا جذبہ برابر یہی تھا کہ اسلامی اقتدار مسائل کے درجے میں سہی قائم ہوجائے، تحفظِ خلافت اور روابطِ اسلامیہ کے سلسلے میں حضرت نانوتویؒ نے ایک کام یہ کیا کہ لوگوں کو بہت زیادہ حج کے لئے مائل کرتے تھے اور فرمایا کہ: اوّل تو عبادت ہے، اور عبادت بھی اجتماعی، وہاں جاکر مکہ والوں سے بھی واسطہ پڑے گا، وہاں اسلامی حکومت دیکھیں گے تو ان کے قلوب پر اثر پڑے گا تو شوکتِ اسلامی کے جذبات لے کر آئیں گے۔ تو علم و معاشرت، سیاست اور خلافت یہ چند چیزیں ایسی ہیں جو حضرتؒ کی تمام خدمات کی محوَر ہیں۔

رات آدھی گزر چکی تھی مگر شرکاءِ مجلس ذکرِ قاسمیؒ میں ایسے محو کہ گویا ایک حسین خواب دیکھ رہے ہوں اور زمانہ پیچھے کی طرف پلٹ گیا ہو کہ یکا یک حضرت قاری صاحب نے بساط لپیٹنی چاہی، سننے والے چونک پڑے اور حضرت کے ضعف و نقاہت کے باوجود ان کی توجہ حضرت نانوتویؒ کی ایک مخصوص شان، علمی کمالات کی طرف

مبذول کرنا چاہی کہ ابھی ذکرِ محبوب کچھ دیر اور چلتا رہے کہ اصحابِ غرض کو تو اپنی مطلب براری سے ہی کام ہوتا ہے، ورنہ عقل اور ادب دونوں حضرت کو مزید تکلیف دینے سے روک رہے تھے، مگر دِل چاہتا تھا کہ ؎

اچھا ہے دِل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہاء بھی چھوڑ دے

حضرت نانوتویؒ کی علمی شانِ تجدید کا ذکر آیا تو حضرت قاری صاحب گویا یکدم تازہ دَم ہوئے اور فرطِ نشاط میں محو ہوکر فرمانے لگے کہ علوم و معارف میں بھی حضرتؒ کا بالکل مجدّدانہ انداز ہے، حضرتؒ کی جو تصانیف ہیں مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی نگاہ بہت تھی تصانیف پر، اور یہ جملہ فرمایا کرتے تھے کہ سو برس تک فلسفہ کتنے رُوپ بدل کر آئے لیکن حضرتؒ کی حکمت اس کی قلعی کھولنے کے لئے کافی ہوگی، سو برس تک کوئی اسلام کا مقابلہ اور اسلام پر حملہ حجت سے نہیں کرسکتا، اتنی حجتیں جمع فرمادیں، تو گویا ایک نئے علمِ کلام کی بنیاد ڈال دی جس سے اسلامی حقائق اور دقائق پورے واضح ہوتے۔ اور مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نظر کے لحاظ سے کہتا ہوں کہ سلف میں بھی بہت کم لوگ ملیں گے جنھوں نے اس قسم کی حکمت جمع کی ہو، یہ حضرت ہی کا حصہ ہے۔ اور یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ حضرتؒ کی ہر چیز بیچ کی نہ بھی تھی بلکہ آخری کنارے پر لگی ہوئی۔

علم کے بارے میں ایک بات مجھے اور یاد آئی کہ مولانا یعقوبؒ صاحبِ کشف و کرامات بزرگوں میں سے تھے، اور ان کے ہاں اخفاء تھا نہیں، جو واردات ہوتی صبح طالب علموں کے سامنے پیش کردیتے کہ یہ رات کو کشف ہوا، یہ اِلہام ہوا، یہ عادت تھی۔ تو ایک دن فرمایا: بھئی آج صبح کی نماز پڑھنے کھڑا ہوا تو بال بال بچ گیا، میرے مرنے میں کسر نہیں تھی۔ طلبہ نے عرض کیا کہ کیا پیش آئی؟ فرمایا کہ قرآنِ کریم کے علم کا ایک اتنا بڑا دریا میرے قلب کے اُوپر سے گزرا اور غنیمت یہ کہ وہ گزرتے ہی

نکل گیا، ورنہ میں تحمل نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے بعد خود فرمایا کہ میں پریشان ہوا کہ یہ کیا چیز تھی؟ تو منکشف یہ ہوا کہ میرے بھائی حضرت نانوتوی میرٹھ میں میری طرف متوجہ ہوئے، اُن کی توجہ کا یہ اثر ہوا کہ علم کا ایک عظیم دریا میرے قلب پر گزرا۔ اور اس کے بعد خود فرمایا: جس شخص کی توجہ کا اتنا اثر ہے کہ اتنا بڑا علم گزر جائے کہ برداشت نہ ہوسکے تو وہ شخص خود اتنا بڑا علم کس طرح اُٹھائے پھر رہا ہے۔ اس میں ایک واقعہ یہ بھی پیش آیا کہ مولانا یعقوبؒ اور تمام اساتذۂ دارالعلوم جن میں اساتذہ بھی ائمۂ فنون تھے، مولانا سعید احمد صاحب اِمامِ معقولات سمجھے جاتے تھے، ان سب نے مل کر حضرت نانوتویؒ سے درخواست کی کہ تفسیر کی کوئی کتاب پڑھادیں تاکہ قرآنی علوم ہم بھی سیکھیں، حالانکہ یہ سب ائمۂ علوم تھے، مولانا یعقوبؒ تو صدر مدرّس تھے، تو حضرتؒ نے منظور فرمایا، چھتہ کی مسجد میں حضرتؒ نے درس شروع کردیا۔ الٓمّٓ سے شروع فرمایا تو حروفِ مقطعات پر کوئی دو اڑھائی گھنٹے تقریر فرمائی اور عجیب وغریب علوم و معارف ارشاد فرمائے اور یہ عجیب بے نفسی کا دور تھا کہ یہ سارے اساتذہ سبق پڑھ کر باہم کہنے لگے کہ بغیر تکرار کے یہ علوم محفوظ نہ ہوں گے لہٰذا تکرار کیا جاوے۔ نودرّہ میں بیٹھ کر تکرار شروع ہوگیا، مولانا یعقوبؒ نے تقریر شروع کی، بیچ میں ایک جگہ رُکے، بات یاد نہیں رہی کسی اور کو بھی یاد نہ آئی، تو کہا: میں مولانا سے پوچھ کر یہ تقریر کروں گا، تو صبح کی نماز پڑھ کر حضرتؒ جب اپنے حجرے میں آرہے تھے تو مولانا یعقوبؒ نے عرض کیا کہ حضرت! تقریر کا فلاں حصہ یاد نہیں رہا، تو کھڑے کھڑے حضرتؒ نے تقریر شروع کی، مولانا فرماتے ہیں کہ نہ لفظ اس عالَم کے تھے، نہ معنی اس عالَم کے، ایک حرف بھی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا فرمارہے ہیں، تو عرض کیا کہ حضرت! ذرا نازل ہوکر فرمایئے کہ کچھ سمجھ جاؤں۔ اب دوبارہ تقریر شروع کی تو الفاظ سب سمجھ میں آئے مگر معانی نہیں، تو پھر عرض کیا کہ حضرت! کچھ اور نازل فرمایئے ہم وہاں تک نہیں پہنچے، تو فرمایا: مولانا! دُوسرے وقت آیئے گا تو اُس وقت کہوں گا۔ تو علوم میں اس وقت کتنا عروج

ہوگا کہ اِدھر کہہ رہے ہیں اور اُدھر سمجھ میں نہیں آرہا، تو علم کا یہ حال تھا اور عمل تو ظاہر ہے کہ......!

راقم نے عرض کیا کہ حضرت! ایسے علوم و معارف کی تسہیل اگر ہوجائے تو اس میں بہت سے فتنوں کا علاج ہے۔ فرمایا: ہاں! ہم نے مجلس معارف القرآن سے اسے شروع کیا اور ایک آدھ رسالہ چھاپا بھی، تسہیل بھی کی، لیکن یہ سلسلہ چلا نہیں، اس لئے کہ علماء کی توجہ نہیں، وہ کہتے ہیں کہ یہ مغلق مضامین ہیں، میں نے کہا کہ بھئی حمد اللّٰہ اور مُلّا حسن اور قاضی سمجھ لو تو ان علوم میں کیا دِقت ہے؟ تو ارادہ نہیں سمجھنے کا۔ عرض کیا گیا کہ کاش! مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے سوانح قاسمی میں علومِ قاسمی کا جو منصوبہ پیش کیا اُس کے مطابق کام کرنے کی کوئی صورت نکل آئے۔ حضرت قاری صاحب فرمانے لگے کہ وہ منصوبہ میں نے ہی مولانا گیلانی مرحوم کے سامنے رکھا تھا کہ آپ نے تین جلدوں میں سوانح لکھی مگر اصل سوانح تو حضرتؒ کے علوم ہیں، آپ اس پر تبصرہ کریں، مگر افسوس کہ اس کام سے پہلے مولانا گیلانیؒ کی وفات ہوگئی، پانچ ہی صفحات مقدمہ کی شکل میں لکھ پائے تھے، الغرض بڑے عجیب وغریب علوم وحقائق ہیں۔

حضرت قاسم العلوم کی سراپا زندگی کے اہم گوشوں پر روشنی ڈالنے کے بعد اب کا سوال خود حضرت حکیم الاسلام کی زندگی کے بارے میں تھا، اور ڈرتے ڈرتے حضرت سے کچھ اپنی زندگی کے بارے میں ارشاد فرمانے کی جرأت کی گئی۔

حضرت مسکرا کر فرمانے لگے: میری زندگی کیا جو میں بیان کروں، ہاں ایک تو پیدائش کا قصہ ہے جو مجھے یاد آیا اور جسے اپنے بڑوں سے میں نے سنا، وہ یہ کہ میرے والد صاحب (مولانا حافظ محمد احمد مرحوم) کی پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہ تھی، جو شادی خود حضرت نانوتویؒ نے کرائی تھی، تو سارے بزرگوں بالخصوص حضرت شیخ الہندؒ کی یہ تمنا تھی کہ حضرت نانوتویؒ کی نسل چلے، تو دُوسری شادی دیوبند میں کرائی اس سے میرے تین بھائی مجھ سے پہلے پیدا ہوئے لیکن وہ کمسنی میں پیدا ہوتے ہی مرگئے، تو حضرت

شیخ الہندؒ کو بڑی تڑپ تھی کہ کوئی زندگی کی اولاد ہو، تو فتح پور ہسوہ میں ایک بزرگ تھے جو اولاد کے بارے میں مستجاب الدعوات تھے، تو حضرت مولانا عبدالسمیع صاحبؒ کو حضرت شیخ الہندؒ نے بھیجا کہ وہاں جا کر دُعا کراؤ کہ مولانا حافظ احمد صاحب صاحبِ اولاد ہوں، وہ سفر کر کے گئے، جا کر عرض کیا کہ حضرت شیخ الہند کا بھیجا ہوا ہوں اور یہ درخواست ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ رات بیچ میں ہے کل صبح اس کا جواب دُوں گا۔ مولانا ان کے مکان میں ٹھہر گئے، صبح کو آئے اور خوش ہوئے، فرمایا کہ میں نے دُعا کی اور جب تک منظور نہ کرائی سجدے سے سر نہیں اُٹھایا، اور مجھے وعدہ دیا گیا کہ حافظ صاحب کا لڑکا ہوگا جو حافظ اور قاری بھی ہوگا، مولوی بھی ہوگا اور حاجی بھی ہوگا۔ مجھے یہ واقعہ اُس وقت معلوم ہوا جب پہلا حج ہوا، میں جا رہا تھا تو طلبہ، اساتذہ سب اسٹیشن تک گئے، اُس ٹانگے میں مولانا عبدالسمیع صاحبؒ تھے اور میں تھا، مولاناؒ نے کہا کہ بھئی میں تجھے ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں، اور یہ واقعہ سناتے ہوئے فرمایا کہ جب تو حافظِ قرآن ہوگیا تو میں نے کہا ایک جز تو الحمدللہ قبول ہوگیا، پھر تو نے قراءت کی تکمیل کی تو میں نے کہا دُوسرا جز پورا ہوا، پھر تو نے فراغتِ تحصیل کی تکمیل کی تو میں نے کہا الحمدللہ اس بزرگ کے کشف کا تیسرا جز بھی مکمل ہوا، آج تو حج کو جا رہا ہے تو فرمایا کہ خدا کا شکر ہے چوتھا جز بھی پورا ہو رہا ہے۔

آگے چل کر حضرت قاری صاحب نے فرمایا: میری پیدائش کے بعد کان میں اذان دینے کے لئے حضرت حاجی محمد عابد صاحب کو بلایا گیا جو اکابرِ دیوبند اور مشائخ میں سے تھے، اُس وقت حیات تھے اور میری عمر کے آٹھ نو برس تک حیات رہے، ان کی صورت مجھے یاد ہے اور میں خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا، اُنہوں نے کان میں اذان دی، حضرت حافظ محمد ضامن شہیدؒ کے صاحبزادے حافظ محمد یوسف صاحبؒ بھی اکابر بزرگوں میں سے تھے، وہ دیوبند تشریف لائے، اُس وقت میری عمر مہینہ ڈیڑھ مہینہ تھی، تو میری دادی صاحبہ مرحومہ نے مجھے ان کے پاس بھیجا کہ اس کے

لئے دُعا کریں، انہوں نے ہاتھ میں لے کر کہا کہ اسے میں لے چکا ہوں، دُعا کیا کروں؟ قبول کر چکا ہوں۔ اب اللہ جانے اس کا کیا مطلب تھا، ظاہری صورت تو یہ پیش آئی کہ میری شادی رام پور میں ان کے خاندان میں ہوئی، اُن کی عزیزہ میرے گھر میں آئی، ممکن ہے یہ مطلب ہو یا کوئی اور۔ اس کے بعد جب مجھے الف، با، تا پڑھنے کے لئے بٹھلایا گیا تو بہت بڑا جلسہ دارالعلوم میں منعقد کیا گیا، دُور دُور سے مہمان آئے، تو مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ، حضرت شیخ الہندؒ کے والد نے بسم اللہ کرائی اور مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کے والد مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ نے ایک قصیدہ پڑھا جو بہت بڑے شاعر تھے، اس قصیدے کا مجھے ایک مطلع یاد رہا اور ایک مقطع، مطلع تو یہ تھا ؎

حبذا مکتب طیب کی مبارک تقریب
کچھ عجب طرح کا جلسہ کچھ عجب طرح کی سیر

اور مقطع یہ تھا جو تاریخ کو بھی سمیٹے تھا ؎

رَبِّ یسر جو کہا اس نے تو بے روئے اباء
فضلؔ تاریخ میں بول اُٹھا کہ ''تمّم بالخیر''

تو بہرحال ان اکابر کے توجہات تھے، میں نے اپنی زندگی ایسی گزاری جیسے شہزادے ہوتے ہیں، ہر طرف حضرت نانوتویؒ کے نام لیوا، بڑے بڑے اکابر، حضرت شیخ الہندؒ وغیرہ حضرات بس اس طرح ناز برداری کرتے تھے جیسے کوئی بادشاہ زادہ ہو، اب بھی جو یہ حضرات کچھ لحاظ پاس کرتے ہیں، غلط فہمی میں نہیں کہ میرے اندر کوئی قابلیت ہے، اصل میں نسبت ہے ان بزرگوں کی جس کی وجہ سے یہ سارا اِکرام ہے۔

یہاں تک حضرت کہہ گئے تھے کہ رفیقِ مجلس قاری سعیدالرحمٰن صاحب (راولپنڈی) نے ایک تلخ موضوع چھیڑ دیا۔ ''مسلمانوں کے تنزل کے اسباب'' ایک ایسا موضوع جس پر بحث وفکر تو مدتوں سے ہو رہی ہے مگر مرض کا علاج صرف نایاب اور بیش قیمت نسخوں کے معلوم کرنے سب کب ہو سکا ہے؟ جب تک مرض کے ازالے

کے لئے عملی قدم نہ اُٹھایا جائے۔ آج مسلمانوں کے تنزل کے اسباب و محرکات پر بلا مبالغہ ضخیم سے ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں، مسلمانوں کی کوئی اہم دِینی یا سماجی تقریب ان اسباب پر زورِ بیان صَرف کرنے سے خالی نہیں جاتی، منبر و محراب کو لیجئے یا میدانِ صحافت و انشاء، کون سا انداز ہے جو مسلمانوں کے جگانے اور مرض کی تلافی کرنے کے لئے اختیار نہیں کیا گیا، مگر جمود اور تعطل کی تہیں جمتی ہی جا رہی ہیں، اور اب جب سقوطِ بیت المقدس کے واقعۂ ہائلہ اور قیامتِ صغریٰ نے ہماری خوابِ غفلت کو نہ جھنجوڑا تو شاید صورِ اِسرافیل ہی ہم غفلت شعاروں کو بیدار کرسکے، مگر ہائے وہ بیداری جو سوائے افسوس اور کفِ ندامت ملنے کے کسی کام کی ثابت نہ ہوسکے۔

یہی تصویر حضرت قاری صاحب مدظلہٗ کے سامنے آچکی ہوگی کہ جب انہوں نے سوال سنا تو ایک دِل گداز سانس بھر کر خود ہی سوال دُہرایا: ''مسلمانوں کے تنزل کے اسباب...؟'' اور پھر اہلِ سیاست پر ایک بھرپور نشتر چبھوتے ہوئے فرمایا کہ: اس میں تو سیاسی لوگوں کی رائے معتبر ہے، ایک مُلّانے کی رائے کیا معتبر ہوگی۔ وہ سیاست جو مسلمانوں کے عروج و زوال کے خدائی قانون سے بے خبر ہوکر بھی صرف مادّیت کے گھمنڈ میں تاریخ کے ہر واقعہ پر رائے زنی اپنا ہی حق سمجھتی ہے۔ حضرت قاری صاحب کے اس مختصر سے جملے میں واقعی اس سیاست پر یہ ایک بھرپور وار تھا۔ تنزل کے اسباب کا ذکر شروع کرتے ہوئے قاری صاحب نے اُصول اور کلیات پر گفتگو کی بجائے اپنے معاشرے کے چند جزئیات سے اس پر روشنی ڈالنا چاہی، ایک صاحبِ بصیرت شخصیت اور صاحبِ نظر کا یہی کام ہے کہ علمی اور نظری چیزوں کی بجائے وہ جزئیات اور عملی مثالیں سامنے رکھ دے جن سے نظریات اور کلیات تشکیل پذیر ہوتے ہیں، مگر انسانی فہم ہمیشہ عملی مثال اور نمونوں ہی سے زیادہ اثر پذیر ہوتا ہے، تنزل کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے حضرت نے نہ تو فلسفیانہ موشگافیوں کی آڑ میں پناہ لینا چاہی اور نہ پیچیدہ عقلی اور نظری طول و طویل محرکات کی فہرست مرتب فرمائی

بلکہ موجودہ معاشرے کی ایک ایسی دُھندلی سی تصویر نگاہوں میں رکھ دی جس کے ساتھ ہم سب یہ موازنہ کرسکیں اور پھر خود ہی سوچیں کہ اس سارے تنزل اور بربادی کے ذمہ دار اگر ہم خود نہیں تو وہ کون ہے؟ افسوس ان لوگوں کی بے بصیرتی پر جن کی نظر اسبابِ تنزل سے بحث کرت ہوئے موجودہ مسلم معاشرے کی بے اعتدالیوں پر تو نہیں جاتی، مگر رہ سہہ کر ان کی ساری غور وفکر یورپی تہذیب اور مغرب کے سسکتے ہوئے فلسفۂ حیات کے گرد گھومنے لگتی ہے۔

حضرت حکیم الاسلام نے تنزل کے اسباب بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ: دو تین برس کا واقعہ ہے، میرٹھ کے ہندو کمشنر تھے، سانوال دارالعلوم آئے اور بہت متأثر ہوئے، یہ جنگ ستمبر (۱۹۶۵ء) شروع ہونے سے ایک مہینہ پہلے کی بات ہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ: مولانا! ملک کے حالات بہت نازک اور خراب ہیں۔ میں نے کہا: جی ہاں! اخبارات سے تو ہم بھی یہی محسوس کرتے ہیں۔ کہا: کوئی سبب بھی ہے اس پستی اور پریشانی کا؟ میں نے کہا: ہاں! سبب ہے۔ کہا: کیا سبب ہے؟ میں نے کہا: بالکل غیر ضروری ہے اس کا بتلانا، اس واسطے کہ میں ایک مذہبی آدمی ہوں، تو ہر حادثے کو مذہب کے نقطۂ نگاہ سے سوچتا ہوں، آپ ہی سیاسی اور برسرِ اقتدار انسان، آپ ہر چیز کو سیاسی نقطۂ نظر سے سوچتے ہیں، تو میرا نقطۂ نظر آپ پر اثر انداز نہیں ہوگا، اس لئے بتانا غیر ضروری ہے۔ اس نے اصرار کای کہ کچھ تو کہئے گا! اور میرا منشاء بھی یہی تھا کہ یہ زور دے تو بتاؤں۔ تو میں نے کہا: سن لیجئے! میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ دُنیا کی کوئی قوم کبھی بھی ترقی نہیں کرسکتی نہ دولت سے چاہے ارب پتی بن جائے، اور نہ کوئی قوم عددی اکثریت سے ترقی کرسکتی ہے کہ افراد اس کے پاس زیادہ ہوں، اور نہ کوئی قوم محض سیاسی جوڑ توڑ سے ترقی کرسکتی ہے، دُنیا کی اقوام کردار اور اخلاق سے ترقی کرتی ہیں، تو اس وقت ہمارے ملک کی اخلاقی گراوٹ انتہا کو پہنچ چکی ہے، اس لئے حالات نازک نہ ہوں گے تو کیا ہوگا؟ کہنے لگے: بالکل صحیح بات ہے، لیکن یہ تو ایک

اُصول بیان کیا آپ نے، اس کی مثال بھی ہے؟ میں نے کہا: مثال کے طور پر پہلی بات یہ کہ آج سے چالیس پچاس برس پہلے جب ایک ہندوعورت باہر پھرتی تھی تو گز بھر کا گھونگھٹ اس کے منہ پر ہوتا اور حیاء کی وجہ سے بچتی ہوئی چلتی تھی، اِس وقت عورت نہ صرف گھونگھٹ سے باہر ہے بلکہ لباس سے بھی، اور اس سے بھی ایک قدم بڑھ کر آپے سے باہر ہوگئی ہے، سوچتا ہوں کہ ایسی عورتوں کی کوکھ سے جو اولاد پیدا ہوگی کیا اُس میں کوئی حیاء اور شرم و غیرت ہوگی؟

دُوسری بات یہ ہے کہ ریلوں میں ہمیں سفر کرنے کی نوبت آتی ہے، تو اسکولوں اور کالجوں کے نوجوان لڑکے کسے ڈَبے میں اگر آجاتے ہیں تو ہمیں یہ فرق کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ یہ آدمی ہے یا جانور؟ اس قدر بیہودہ اور رکیک حرکتیں کرتے ہیں کہ کوئی بھلا آدمی نہ کرسکے، اگر ان لوگوں کے کندھوں پر ملک کا بار آگیا تو سوائے بداَخلاقی کے یہ اور کیا پھیلائیں گے؟

تیسری چیز یہ ہے کہ ریلوں میں سفر کرتے دیکھا کہ جہاں کہیں شوگر ملز آیا، گاڑیاں گنوں سے بھری کھڑی ہیں، سو پچاس مسافر اُترے کسی نے سو گنے، کسی نے دو سو گنے، کسی نے پچاس، کسی نے گٹھڑی باندھ لی اور قطعاً انہیں احساس نہیں کہ یہ چیز ہماری ہے یا غیر کی؟ تو اگر ملک کا بار ان کندھوں پر آیا تو سوائے لوٹ کھسوٹ کے یہ کیا کریں گے؟

چوتھی بات یہ ہے کہ تاجروں کا طبقہ ہے اور تجارت پر ملک کا دار و مدار ہے، اس طبقے میں بلیک الگ ہے، نفع خوری الگ ہے، ذخیرہ اندوزی الگ، تو جب تاجروں میں خیانت آجائے تو ملک کی برقراری کیسے ہوسکتی ہے؟

پانچویں بات یہ ہے کہ جب حکام کو دیکھا جائے تو رشوت ستانی، جانبداری، اقرباء پروری، یہ ایک عام چیز بن گئی ہے، اور رشوت تو ایسا ہے جیسے حق ہوگیا، تو جب حکام میں خیانت آجائے تو بھلا وہ ملک کیسے برقرار رہے گا؟

میں نے کہا: یہ حالات ہیں، کہنے لگا: بالکل بجا ہے۔ تو میں نے کہا کہ پھر گورنمنٹ کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ اپنے ملک کی اَخلاقی حالت دُرست کرے، آپ دولت اور بیرونی کرنسی جمع کرنے کی فکر میں رہتے ہیں، لیکن اس کی فکر کسی کو نہیں۔ کہنے لگا کہ یہ ناممکن ہے کہ اخلاقی حالت دُرست ہوسکے، میں نے کہا: کیوں؟ کہا: حکومت یہ نہیں چاہے گی، کیونکہ اخلاق دُرست ہوتے ہیں مذہبی تعلیم سے، اور حکومت سیکولر یعنی لامذہب ہے، وہ آنہیں سکتی بیچ میں۔ تو میں نے کہا کہ میرے اور آپ کے نقطۂ نظر میں یہاں سے فرق ہوگیا، آپ کے نزدیک سیکولر کا معنی لامذہبیت ہے اور میرے نزدیک سیکولر کا معنی ہمہ مذہبی حکومت ہے کہ ہر مذہب حکمران ہو، اور گورنمنٹ کا فرض ہے کہ ہر طبقے کو مجبور کرے کہ وہ اپنی مذہبی تعلیم پائے تاکہ اس کا اخلاق صحیح ہو۔ کہنے لگا: یہ ہونہیں سکتا۔ میں نے کہا: آپ خود چاہتے ہیں کہ اس ملک میں چور اور ڈاکو پیدا ہوں۔ کہنے لگا: آپ جو چاہیں مطلب نکال دیں، باقی یہ ہوگا نہیں۔ میں نے کہا: ایک تدبیر میں بتلادُوں؟ کہا: کیا؟ میں نے کہا: ملک ہمارے سپرد کردیجئے، سب حالات دُرست کردیں گے۔ اس پر وہ بہت ہنسا۔ تو بہرحال ملک اور قوم کی ترقی ہوتی ہے اخلاق و کردار سے، جب یہ ختم ہوجائے تو سب سے بڑا تنزل کا سبب یہی ہے۔

راقم السطور نے کہا: حضرت! ہمارے تنزل میں مغربیت کا بھی حصہ ہے؟ فرمایا: اس سے بھی وہی بات نکلتی ہے کہ مغربی اخلاق اختیار کئے جائیں، اسلامی اخلاق چھوڑ دیں، تعلیم مغربی غالب ہو اور دِینی تعلیم مغلوب، دِینی افراد مغلوب ہوں اور بے دِین افراد غالب ہوں، بنیاد سب کی ایک ہی ہے کہ مذہب سے رشتہ توڑ دو۔ اب اس کے بعد اصلاح کی کیا صورت ہو؟ تو حضرت نے اپنے تجربے اور بصیرت کی بناء پر فرمایا کہ آپ حضرات بحمداللہ مذہب کی خدمت کر رہے ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ لاکھوں کروڑوں آدمی جو اس لپیٹ میں آگئے اُن کا دِین دُرست ہو رہا ہے، لیکن

برسرِ اقتدار طبقہ بالکل دُوسرے رنگ میں ہے، مگر اس میں بھی میری ایک رائے ہے کہ کسی سے تقابل کی ٹھان کر کسی کی اصلاح نہیں ہوسکتی، آپ چاہیں تو ایجی ٹیشن کریں یا مقابل بن کر اصلاح کرنا چاہیں، یہ ہونہیں سکتا، اس کی صورت تو یہ ہے کہ مستغنیانہ طریق سے اُن لوگوں کے دِلوں میں کچھ چیزیں ڈالی جائیں اور اپنا غرض، مطلب کچھ نہ رکھا جائے، نہ عہدہ نہ دولت، بلکہ انہیں آپ یقین دِلادیں کہ اقتدار تمہارا رہے گا اور ہم بھی اس کے ساتھ تعاون کریں گے، ہم اقتدار نہیں چاہتے، مگر اتنی بات کرو اور ایسا کرنا ملک اور قوم دونوں کے لئے نافع، ورنہ اس سے ملک اور قوم اور تمہارے اقتدار سب کو خطرہ ہے، اس انداز سے کام کرنا چاہیے، سیاسی رنگ کے لوگ سیاسی انداز سے اور دِینی رنگ کے لوگ دِینی انداز سے جب تک خواص کو متوجہ نہیں کریں گے کام نہیں چلے گا۔ اب عوام کی طرف توجہ کی جاتی ہے اور ایجی ٹیشن کی صورت اختیار ہو، جس کا مطلب یہ ہے کہ اشتعال میں آجائے حکومت، تو وہ بھی پھر چڑ پر آتی ہے تو نہ صرف یہ کہ وہ آپ کی نہیں مانے گی بلکہ گرانے کی کوشش کرے گی۔ تو اصلاحی رنگ میں چند افراد اپنی زندگی اس مقصد کے لئے وقف کردیں اور جو اُوپر کا طبقہ ہے ان میں رُسوخ حاصل کرکے اس کے کانوں میں یہ باتیں ڈالی جائیں اور اس انداز سے کہ فلاں بات تیرے مفاد کے خلاف ہے۔

حضرت! پاکستان کے علماء کے لئے کوئی مخصوص پیغام؟

پیغام کا مجھے حق بھی نہیں، غیر ملک کا آدمی کیا پیغام دے، مگر یہ میں نے صبح کی مجلس میں بھی تفصیل سے عرض کیا تھا کہ جو مفکر قسم کے چند علماء ہیں اور بااثر بھی ہیں وہ ایک یادداشت کے طور پر کچھ بنیادی چیزیں حکومت کو پیش کریں اور اس پر یہ ظاہر کردیں کہ ہم آپ کی حکومت کو اپنی حکومت سمجھتے ہیں، ہمارا پورا تعاون رہے گا، تقویت اور نصرت کریں گے، مگر اتنی چیز ہے کہ دِین کے لئے اور ملک کی بقاء کی خاطر فلاں فلاں کام کرو، اگر یہ نہیں ہوگا تو ملک و قوم میں خرابی ہوگی اور آپ کی بنیاد بھی

اسی سے قائم ہے۔ اس یادداشت اور ملاقاتوں میں جزئیات کو پہلے نہ چھیڑا جائے بلکہ اُصولی اور کُلّی رنگ میں، یہ لوگ کچھ مانوس ہوجائیں تو پھر آہستہ آہستہ جزئیات سود وغیرہ جیسے مسائل کان میں ڈال دیئے جائیں، مگر پہلے اربابِ اقتدار کے ذہن کو اُصول میں لے آیا جائے۔ میں تو واقعی اگر یہاں کا باشندہ ہوتا اور باریابی کا موقع مل جاتا تو صدر ایوب سے کہتا کہ مجھے آپ اپنا خادم اور خیرخواہ سمجھیں، مگر دو باتیں ہیں، ایک تو یہ کہ تعلیمِ قرآن اور دِینی علوم کو عام قرار دیں، اور یہ کام مستند علماء سے کرائیے، ہر اس عالم کو عالم نہ سمجھیں جو علم کا لبادہ پہن کر آئے اور علم اس کا محض مطالعے یا اخبار بینی کا ہو، نہ اس کے پاس سند ہو نہ استناد، نہ بزرگوں کے پاس رہ کر اُس نے علم حاصل کیا ہو، ایسے علماء کو اختیار کرکے ان سے ہر کام میں مشورہ نہ کریں، ہر مدعیٔ علم کو عالم نہ سمجھیں بلکہ اس کی تلاش کرکے کام کریں۔

کوئی طبیب بھی اگر ہوتا ہے تو یہی نہیں کہ مریض ہر کس و ناکس کے ہاتھ میں جاکر ہاتھ دیدے گا اور نبض دِکھلاوے گا، بلکہ وہ پہلے ڈھونڈتا ہے کہ طبیب طبیہ کالج کا فارغ ہے یا کہاں کا؟ اس کا بورڈ یا سند دیکھتے ہیں، اُس کے پاس آنے والے مریضوں کی اکثریت کو دیکھتے ہیں کہ شفایاب ہوکر جاتے ہیں یا نہیں؟ تو جان بچانے کے لئے تو آپ انتخاب کریں، تو ایمان بچانے کے لئے کیا ضروری نہیں ہے کہ صالحین، رُوحانی اطباء، صحیح علماء کا انتخاب کیا جائے۔

اور دُوسری بات اُن سے یہ عرض کرتا کہ آپ معروفات کو یکدم جاری نہیں کرتے تو نہ سہی، مگر کم از کم منکرات کا راستہ تو بند کردیں، اس سے اخلاق میں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، مقدّم چیز ہے دفعِ مضرّت اور جلبِ منفعت مؤخر ہے، اور دفعِ مضرّت میں یہ ہے کہ کم از کم پہلے وہ منکرات تو ختم کردیں جو عقلی منکرات ہیں، اور دُنیا کی ہر قوم اسے بُرا سمجھتی ہے، اس کے بعد منکراتِ شرعیہ کو لیں، جب اس سے فارغ ہوں تو معروفاتِ شرعیہ کو لیں، مگر کم از کم منکرات تو ختم کردیں، اور یہ بھی تدریجاً سہی، رفتہ

رفتہ، اس لئے کہ آپ کی مجبوریاں ہیں، آپ کے روابط اور مراسمِ سیاسی اُن اقوام سے ہیں کہ جن کے ہاں یہ منکرات جزوِتمدن ہیں، تو اگر یکدم آپ کامیاب نہ ہوں تو راستہ تو منکرات مٹانے کا ڈال دیں۔ دُوسری چیز یہ عرض کرتا کہ خلفائے راشدینؓ یا سلاطینِ عادل جو گنے چنے ہیں، اُن کے علاوہ عامۃً وہی سلاطین ہیں جنھیں اپنے اقتدار کی فکر ہے، لیکن تاریخ یہ بتلاتی ہے کہ جس بادشاہ کے ساتھ کوئی عالمِ ربانی لگ گیا اُس کی حکومت نہایت اعلیٰ گزری، حالانکہ وہ عالم عہدہ دار نہیں تھا۔ ہارون الرشیدؒ کے ساتھ امام ابویوسفؒ لگے ہوئے تھے، اورنگزیب عالمگیرؒ علماء سے مشورہ لیتا رہا، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے بارے میں مرحوم نواب زادہ لیاقت علی خان نے مجھ سے کہا کہ جب ہم کسی مسئلے میں اُلجھ جاتے ہیں تو مولانا عثمانی سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔

تو جب آپ اسلام کے نام پر حکومت کر رہے ہیں اور ملک اسلام کا ہے، تو اسلام کے حاملین سے کب صَرفِ نظر کیا جاسکتا ہے، تو جو قدم اُٹھائیں تو کم ازکم دو چار علماء کی بات تو سن لیا کریں، آپ انہیں نہ جاگیر دیں، نہ عہدہ، نہ وہ طلب کریں گے۔

حضرت حکیم الاسلام اصلاحِ اَحوال کی تجویز پر اپنی بصیرت اور فراستِ ایمانی کی روشنی میں گفتگو فرما رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر عصرِ حاضر کی اسلامی قیادت مصطفیٰ کمال کے نقشِ قدم پر اسلام کو فرسودہ اور زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ ہونے کا عقیدہ دِل و دِماغ میں راسخ کرچکی ہو، دِین کی ترجمانی کے لئے کسی صلاحیت اور استحقاق کو اجارہ داری سمجھا جارہا ہو، اور جب رعایا کی اکثریت بھی اعجاب رائی (اپنی رائے اور گھمنڈ پر غرور) میں مبتلا ہوچکی ہو، پھر جب خوشامدی، خودغرض اور لالچی قسم کے علماء نے حکام کے ساتھ روابط کو رعیت کی نگاہ میں دِین فروشی کے ہم معنی سمجھ لیا ہو اور خالص مصلحانہ کوششوں پر بھی سیاست کا رنگ چڑھ گیا ہو تو حکام اور اہلِ دِین کے درمیان خلیج دُور ہونے کے لئے اور دِینی اقدار کی خاطر اس خلاء کو پاٹنے میں حضرت قاری صاحب مدظلہٗ کی یہ خیرخواہانہ تجویز کس حد تک مفید ثابت ہوسکتی ہے؟

اس راہ کی مشکلات کو ایک خاص رُخ سے پیش کرتے ہوئے میں نے عرض کیا: حضرت! جب حکام یہ سمجھ بیٹھے ہوں کہ اسلام عصرِ حاضر کے ساتھ چل ہی نہیں سکتا تو انہیں حاملینِ اسلام کی اہمیت اور ضرورت کا احساس ہو جانا کب ممکن ہے؟

حضرت نے فرمایا: ان کی یہ غلط فہمی دُور کر دینی چاہئے کہ اسلام موجودہ دور کی ترقیات میں حارج ہے، بلکہ ان کے دِل میں یہ ڈال دینا چاہئے کہ زمانے کی کوئی چیز بھی جو کسی درجے میں واقعی صحیح اور کارآمد ہو، اسلام اُس کا مخالف نہیں، مگر وہ منکرات جو دُنیا کی ہر قوم میں منکراتِ عقلی ہیں (مثلاً) زنا کاری، جوا، سود، شراب نوشی قسم کی چیزیں جن کی قباحت مُسلّمات عقلیہ میں سے ہے، ان چیزوں کو ترقی کا معیار بنا کر اسے اسلام کے ساتھ نہیں جوڑا جا سکتا، البتہ جو چیزیں منکر نہیں ہیں اور اخلاق و معاشرت پر اثر انداز نہیں ہوتیں، اسلام کبھی بھی اس کی مخالفت نہیں کرتا۔ سیاسی اور ملکی تدابیر میں ہمیشہ توسع سے کام لیا گیا ہے، اور جو اجتہادی اُمور ہیں اس کی اسلام میں گنجائش ہے اور اُن کی اچھائی بُرائی کو جانچنے کے لئے ایسے لوگوں کو مشیر بنائیں جنھیں فقہ اور شریعت پر عبور ہو۔ پھر قاری صاحب نے فرمایا: مقصد اصلاحِ حال ہے اور یہ کہ حالات سدھر جائیں، اِخلاص اور جذبۂ خیر خواہی کے ساتھ ایسا راستہ اختیار کیا جائے جو ایک دُوسرے کو دُور کرنے کی بجائے نزدیک کر دے۔

رات ڈھل رہی تھی، وقت تیزی کے ساتھ دِل و دِماغ پر اپنے حسین نقوش ثبت کرتے ہوئے گزر رہا تھا، ایسے نقوش جو مجلس میں چلنے والے ٹیپ ریکارڈر کے فیتے پر ثبت ہونے والے ارتعاشی اور صوتی اثرات سے کہیں زیادہ پائیدار اور دیرپا تھے، وقت بجائے خود ایک ایسی ریکارڈنگ مشین ہے جو ایک ایسے نامۂ اعمال کے اوراق میں سب کچھ محفوظ کر رہی ہے جس کی پنہائیوں اور گہرائیوں پر ''الساعۃ'' اور ''زلزلۃ الساعۃ'' کی ہلاکت انگیزیاں بھی اثر انداز نہ ہو سکیں گی، اور جب کرتا دھرتا سب کچھ مجسم بن کر سامنے آجائے تو پکارنے والا پکار اُٹھے گا: ''مَا لِهٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ

صَغِیْرَۃً وَّلَا کَبِیْرَۃً اِلَّا اَحْصٰھَا''۔

ایسی صحبتیں کب بار بار نصیب ہوتی ہیں، حضرت کو مزید تکلیف دینا دِل و دِماغ پر کتنا ہی گراں گزر رہا تھا مگر بے اختیار جی چاہا کہ اس مجلسِ سعید میں کچھ ذکر ''الحق'' اور دارالعلوم حقانیہ کا بھی آجائے، اور پوچھ بیٹھا کہ ''الحق'' کے لئے کون سا طریقۂ کار پسندیدہ ہے؟ فرمایا: وہی پالیسی جو میں نے عرض کردی، توافق سے کام چلے گا تقابل سے نہیں، تعمیری انداز میں اصلاح کی سعی، تقابل کے انداز سے آپ کی باتیں کسی مخالف پر اثر انداز نہیں ہوسکیں گی۔

حضرت! جب اِلحاد اور بے دِینی بالکل غالب ہوچکی ہے، پھر کیسی موافقت؟ برجستہ فرمایا: اسی کی اصلاح کے لئے تو توافق کی ضرورت ہے، اور یہ توافق اِلحاد اور بے دِینی سے نہیں ہوگا، اُن افراد سے توافق ہوگا تاکہ ان لوگوں کو اِلحاد سے ہٹادیا جائے۔

حضرت! کچھ لوگوں پر تو مایوسی کی فضا چھاگئی ہے، اصلاح کے مساعی بارآور معلوم نہیں ہو رہے؟ حضرت قاری صاحب مدظلہٗ نے فرمایا: کام کے لئے اوّلین شرط یہ ہے کہ مایوس نہ ہوجایئے، آپ تو ورثۂ انبیاء ہیں، انبیاء کبھی مایوس نہیں ہوئے، جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مجھے اس قوم کو عذاب دینا ہے، جب حضرت نوح علیہ السلام نے بدُعا کی کہ کسی کافر کو بھی زندہ نہ چھوڑنا، ورنہ ..... ساڑھے نو سو برس تک نصیحت فرماتے رہے تو مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔

دیگر بلادِ اسلامیہ تو دہریت، مغربیت اور بے دِینی کی لپیٹ میں آہی گئے اور مغلوب ہوگئے تو ایسے حالات میں اہلِ دِین کب تک شکستہ خاطر نہ ہوں گے؟

حضرت نے جواب دیا کہ ایسی چیزوں کو تو ملک کے سامنے بطورِ نظیر پیش کیا جانا چاہئے کہ آج بلادِ اسلامیہ باوجود قوت کے تباہ ہو رہے ہیں، اس لئے کہ انہوں نے اسلامی اُخوّت اور مسلمانوں کے عام اتحاد کو خیرباد کہہ دیا، وطنیت کو آگے رکھا، اسلامیّت کو پیچھے رکھا، تو اتنی نظیروں کے ہوتے ہوئے بھی تمہاری آنکھ نہ کھلے تو تباہی

سے کیسے بچ سکو گے؟

حضرت! قوم اور ملک کی اصلاح تو اَربابِ عزیمت اور اُولوالعزم لوگوں کا کام ہے، ہم جیسے عامیوں کے لئے بھی کچھ ارشاد ہو۔ فرمایا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ورثہ چھوڑا ہے کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کا، فرمایا: تم جب تک انہیں پکڑے رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہو سکو گے، "ترکت فیکم الثقلین لن تضلّوا بعدی أبدًا ان تمسّکتم بھا"۔

حضرت! اس مدرسہ دارالعلوم حقانیہ کے بارے میں کوئی نصیحت؟

فرمایا: آپ لوگ اختیار کئے ہوئے ہیں، بحمد اللہ مدرسہ چل رہا ہے، غالب ہو رہا ہے، مولانا موجود ہیں، ہر وقت قال اللہ اور قال الرسولؐ ہے، اس سے زیادہ کیا رُوحانیت اور معنویت ہوگی، خدا نے مدرسہ کو ایسے بزرگ اور اساتذہ دیئے ہیں جو بحمد اللہ دِینِ مجسم ہیں۔

حضرت! مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند کی رفتارِ ترقی کیا ہے اور بجٹ؟

فرمایا: اِنقلاب کے وقت سوا لاکھ تھا، اور اب ساڑھے دس لاکھ ہے، اِنقلاب کے بعد کچھ فکر بھی تھا کہ کیسے چلے گا، مگر اللہ نے بڑھایا اور تمام شعبے بڑھتے ہی گئے، پہلے آٹھ شعبے تھے، اب چوبیس شعبے ہیں، اسی طرح پہلے اساتذہ ۳۸ تھے، اب ۷۰ کے قریب ہیں، اسی طرح عمارات دُگنی تگنی ہوگئی ہیں، اللہ تعالیٰ کام کر رہا ہے، طلبہ ڈیڑھ ہزار کے قریب ہیں۔

آخری سوال تھا کہ حضرت! نئی پود سے مستقبل میں دارالعلوم دیوبند کے لئے کیسی توقعات ہیں؟

فرمایا: اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہیں، مگر اس میں شک نہیں کہ اس دور کی سب سے بڑی مشکل قحط الرجال کی ہے، مگر ہمیں توقع ہے کہ اسلاف کے نقشِ قدم پر چلنے والے نئی پود میں بھی ہیں، چاہے گنے چنے ہی ہوں، مگر اب بھی

ایسے لوگ پائے جاتے ہیں۔

دورانِ گفتگو ایک دفعہ حضرت نے موجودہ زمانے کی سیاست پر بھی اپنی رائے ظاہر کی اور کہا کہ: میرا تجربہ یہ ہے کہ اس زمانے کی سیاست اور دِین میں بیر ہے، اس سیاست اور ڈپلومیسی کا بنیادی پتھر ہے نفاق، گندم نما جوفروشی، اس میں دِین باقی نہیں رہ سکتا، وہ تو صرف اسلامی سیاست ہے جو دِین کے ساتھ چلتی ہے، اور وہ تو جوہر ہے اسلام کا۔ اور ایک ہے عصری سیاست، یہ بالکل تقابل پر ہے دِین کے، جو چیزیں دِین میں حرام ہیں اس کے ہاں واجب ہیں، جو یہاں محمود ہیں وہ وہاں مذموم، اور یہ صرف میرا مقولہ نہیں بلکہ مولانا اصغر حسین صاحب مرحوم نے بھی یہی الفاظ ارشاد فرمائے کہ ''مولوی صاحب! آج کی سیاست اور دیانت میں بیر ہے۔''

اب رات کا ایک بج چکا تھا اور بادِلِ نخواستہ اس پُرلطف محفل کی بساط لپیٹنی ہی پڑی۔

(ماہنامہ ''الحق'' شوال-ذیقعدہ ۱۳۸۸ھ)

شیخ الہندؒ مولانا محمود حسن قدس سرہ العزیز

صدارتِ تدریس دارالعلوم کا اہم ترین اور ذمہ دارانہ عہدہ شمار کیا گیا ہے، جس پر وہ ہستی فائز تھی جو حضرت شیخنا شیخ الہند مولانا محمود الحسن قدس سرہٗ کے نامِ نامی و اسمِ گرامی سے معروف ہے ؎

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

آفتاب کو ممکن ہے کہ کچھ لوگ نہ پہچانتے ہوں، لیکن علمی دائرے کا کوئی فرد ہوگا جو اس یگانہ روزگار ہستی اور اس کے فیوض و برکات سے واقف نہ ہو۔ علمی میدان میں عارف باللہ، عملی میدان میں مجاہدِ اعظم، اخلاقی میدان میں فنا فی اللہ، سیاسی میدان میں زعیمِ مخلص، عقلی میدان میں فرزانہ فرید، شعر و ادب کے میدان میں ادیبِ بے مثال، شخصیت کے میدان میں شیخِ کامل، دارالعلوم کو اگر آسمان فرض کرلیا جائے تو اس آسمان کا سورج اپنے وقت میں شیخ الہندؒ کی ذاتِ بابرکات تھی، جس سے شیخ الہندؒ کے انفاسِ طیبہ عیاں ہیں۔

''اَسیرِ مالٹا'' نامی کتاب الگ چھپ چکی ہے جس سے شیخ الہندؒ کے صبر و جہاد اور بغض فی اللہ اور حب فی اللہ کی داستانِ حیات نمایاں ہے، تلامذوں کی تعداد ہزاروں کی الگ ہے جو ان کے علم وفضل کا اشتہار ہے، متوسلین ہزاروں کی تعداد میں الگ ہیں جو ان کی شانِ تربیت کا اعلان ہے، خود ان کی تصانیف الگ ہیں جو ان کے مدرک فکر کو نمایاں کر رہی ہیں، ملک و سیاست کی کھلی بساط پر ان کے مجاہدانہ کارنامے

اور قید و بند اور تحملِ شدائد و مصائب کی داستانیں الگ ہیں جو ان کے جوشِ عمل کا کھلا تعارف ہیں، اس لئے وہ کون سا دائرۂ علم و عمل رہ جاتا ہے جسے اچھوتا سمجھ کر سپردِ قلم کیا جائے بجز اس کے کہ ان کا نام نامی لے دیا جانا ہی سارے کمالات کا تذکرہ ہو جانا ہے۔ سورج کا نام لے دینا ہی روشنی و گرمی کا تذکرہ ہے، نام لے کر اس کی روشنی و گرمی کا تعارف کرانا اس پر اور اس کے کاموں پر گویا خفاء و تستّر کا عیب لگانا ہے، جس سے وہ بَری ہے، آفتاب کے کاموں کی دلیل میں محض اس کا نام لے دیا جاتا ہے۔

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

حضرتِ ممدوح کی ہمتِ ظاہری و باطنی سے علم و اخلاق کے کتنے پیکر تیار ہوئے اور عالمِ اسلامی میں ان کے آثارِ صالح کس حد تک پھیلے، نیز آپ کی ذات سے دارالعلوم اور جماعتِ دارالعلوم کے علمی و اخلاقی مسلک کا کس حد تک شیوع و فروغ ہوا، نہ اس کے لئے یہ سطریں کفایت کر سکتی ہیں اور نہ یہ اس تحریر کا موضوع ہی ہے، مقصد صرف تذکار و یادگار اور اس حیلے سے نامِ نامی اور اسمِ گرامی کا زبانِ قلم پر لے آنا ہے۔

آپؒ نے دارالعلوم میں ۱۲۹۰ھ میں تعلیم سے فراغت حاصل کی اور اپنے اُستاذ حضرت نانوتویؒ کی حیات ہی میں ۱۲۹۱ء میں دارالعلوم کے مدرّس چہارم مقرّر ہوئے، ۱۲۹۷ھ میں جبکہ حضرت نانوتویؒ کی وفات ہوئی، فرطِ غم سے درس و تدریس کا سلسلہ ترک کر دیا اور فرمایا کہ اب پڑھنے پڑھانے کا لطف نہیں، گھاس کھود کر زندگی بسر کرلیں گے اور یادِ اُستاذ میں عمر گزار دیں گے۔ لیکن حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ اور دُوسرے اکابر کے کہنے اور سمجھانے پر راضی ہوئے اور پھر سلسلۂ تعلیم جاری فرمایا۔ ۱۳۰۸ھ میں آپؒ عہدۂ صدارتِ تدریس پر لئے گئے، اور آپؒ کو حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مقدس عہدے کے لئے چنا اور آپؒ کے فیض سے علمی حلقے مستفید ہونے شروع ہوئے، آپؒ کی ظاہری و باطنی برکات سے دارالعلوم دیوبند کا احاطہ چالیس برس تک جگمگاتا رہا اور اس عرصے میں ہزارہا فرد فرید علماء اس شیخِ کامل

کے حلقۂ درس سے آفتاب و ماہتاب بن کر نکلے۔

اگر یہ مثل صحیح ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اور بلاشبہ صحیح ہے تو یگانۂ دہر علامہ انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ صدر المدرّسین دارالعلوم، علامہ مفتی محمد کفایت اللہؒ صدر جمعیت علمائے ہند، حضرتِ اقدس مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہٗ صدر المدرّسین دارالعلوم دیوبند، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی شیخ التفسیر، علامہ مولانا عبیداللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا محمد میاں منصور انصاری رحمۃ اللہ علیہ مہاجر کابل، حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم صاحب زید فضلہٗ صدر المدرّسین دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا سیّد فخر الدین صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند زید مجدہٗ جیسے سینکڑوں فضلاء و اتقیاء کو سامنے لے آنا شیخ الہند کو سامنے کر لینا ہے، یعنی ان بزرگوں کے علمی و عملی کارنامے شیخ الہندؒ کے تعارف کی حدِ تام ہیں، جس کے ایک ایک مقدمے کے آئینے میں شیخ الہندؒ کی تصویر نظر آتی ہے، شیخ کے ان تلامذہ میں حقیقت یہ ہے کہ ایک ایک فرد ایک ایک اُمت کے برابر اور اُمتِ قانتہ ثابت ہوا ہے، بلاشبہ ان علمی ستاروں کی چمک دمک میں شیخ الہندؒ کا علمی و عملی نور روشن نظر آتا ہے، اس لئے ان علمی، عملی، اخلاقی، حسّی اور اعیانی شہادتوں کے ہوتے ہوئے کون سا واقعہ رہ جاتا ہے کہ ان چند سطور میں کچھ لکھ کر ان مشاہد چیزوں کی اہمیت گھٹائی جائے یا ان معیاری داستانوں کو ان میں کھپا دیا جائے۔

مالٹا سے تشریف آوری کے بعد میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرتؒ سے فرمایا کہ: حضرت! ان دونوں بچوں (محمد طیب اور محمد طاہر) کو بیعت فرما لیجئے، فرمایا: بھائی حافظ جی! میں تو ان سے بیعتِ جہاد لوں گا، والدؒ نے فرمایا کہ آپ میری طرف سے ان کے سر کٹوا دیجئے اس میں مجھ سے کیا پوچھنا ہے؟ آپ جانیں اور آپ کی اولاد جانے۔ ہنسے اور پھر فرمایا کہ لوگ مجھے کہتے ہیں کہ یہ بڑا ہوشیار ہے، دو بزرگوں (حضرت گنگوہیؒ اور حضرت نانوتویؒ) کے دو ہی صاحبزادے

ہیں (مولانا مسعود احمد گنگوہی اور حافظ احمد صاحب) اس نے دونوں پر پہلے ہی سے قبضہ جما رکھا ہے، اب اگر ان بچوں کو بھی بیعت کرلیا تو کہیں گے کہ ہوشیاری دیکھو کہ اس نے آگے کو بھی قبضہ بحال رکھنے کی داغ بیل ڈال دی ہے۔ بہرحال اس قسم کی مزاحی باتیں جانبین سے ہوتی رہیں، یہ مجلس ختم ہوگئی، دو دن کے بعد اچانک خود ہی دارالعلوم میں تشریف لاکر مجھے اور طاہر مرحوم کو بلایا، ہمارے ذہن میں بھی نہیں رہا تھا کہ ہمیں بیعت بھی ہونا ہے، میں نے عرض کیا کہ: حضرت! کیوں یادفرمایا ہے؟ فرمایا: مرید بھی کرنا ہے۔ اس وقت ندامت سی ہوئی کہ اس کے لئے ہمیں خود حاضر ہونا چاہئے تھا، لیکن یہاں قصہ برعکس ہو رہا ہے بہرحال یہ اپنے چھوٹوں پر شفقت اور مربیانہ تربیت کا بے مثال نمونہ تھا جو اس ذاتِ ستودہ صفات میں حق تعالیٰ نے ودیعت فرمایا تھا اور نیک نصیب افراد کو ان سے برسہا برس استفادے کا موقع ملتا رہا، رحمة اللہ علیہ رحمةً واسعةً۔

اس سے اندازہ کیجئے کہ جس مقدس ادارے کے ذمہ دار ایسے مقدس اور برگزیدہ افراد ہوں، ان کے علمی اور عملی نظام کی خوبیوں کا کیا پوچھنا، اور جس دائرے کے مربی و معلم اس انداز کے ہوں، اس کے فیض یافتہ اور مستفیدوں کے درجات کا کیا کہنا ؂

أولئک ابائی فجئنی بمثلھم

اذا جمعتنا یا جریر المجامع

ترجمہ:- یہ ہمارے اسلاف ہیں، تو بھی ان کی مثل لا، اے جریر!

جب تو کسی مجمع میں ہمارے مقابلے میں آئے۔

اِس رفعتِ شان پر بے نفسی کا عالم یہ تھا کہ گویا نفس یا کوئی تقاضا باقی ہی نہیں رہا تھا، یا اس کے پورا ہونے کی کوئی صورت ہی نہیں رہ گئی تھی، یا اسے پامال کرنے کی فکر ہر وقت دامن گیر رہتی تھی، اس زمانے میں اکثر مساجد میں کسیر بچھادی

جاتی تھی جو نرم بھی ہوتی تھی اور گرم بھی، یہ گھاس تالابوں میں پیدا ہوتی ہے، جب سوکھ جاتی ہے تو لوگ اسے بچھانے کے لئے لے آتے تھے، اسے دیہات کا قالین یا نرم گدّہ سمجھنا چاہئے، حضرتِ شیخ کی مسجد میں بھی سردیوں میں برابر اِس کا فرش ہوتا تھا، موسمِ سرما آنے پر ایک دن خود ہی طلبہ سے فرمایا کہ: آؤ بھئی مسجد کے لئے کسیر لے آویں۔ چار طلبہ ساتھ ہولئے، انہیں حضرتؒ اپنے باغ میں لے گئے، وسطِ باغ میں بڑا تالاب بھی تھا، اور اس پر کسیر بکثرت پیدا ہوتی تھی، چنانچہ کسیر کاٹی گئی، خود حضرتؒ بھی درانتی سے کاٹنے میں شریک رہے، کاٹ کر جمع شدہ ذخیرے کے پانچ گٹھڑ بنائے، طلبہ نے عرض کیا کہ حضرت! پانچ گٹھڑیاں کیوں بنائی گئی ہیں؟ ہم تو چار ہیں۔ فرمایا: اور میرا حصہ آخر کہاں گیا؟ یہ کہہ کر چار بڑی بڑی گٹھڑیاں تو طلبہ کے سروں پر رکھوائیں اور ایک اپنے سر پر رکھی، ہر چند طلباء بضد ہوئے کہ حضرت! اس ذخیرے کی چار گٹھڑیاں کردی جائیں ہم کافی ہیں، یہ کچھ زیادہ بوجھ نہیں، مگر حضرتؒ نے نہ مانا، چاروں گٹھڑیاں گھاس کی طلبہ کے سروں پر اور ایک گٹھڑی اپنے سر پر رکھ کر یہ قافلہ چلا، شہر میں آیا اور بازار کے ایک حصے میں سے گزرا، ان طلبہ کو تو ممکن ہے کہ سر پر گھاس رکھ کر بازار سے گزرنے پر کچھ عار آرہا ہو، لیکن حضرتؒ کی بے نفسی کا یہ عالم تھا کہ گویا اپنے کو اس بوجھ اُٹھانے کا اہل اور مستحق سمجھ کر شہر سے گزر رہے تھے، دیہات والے بھی اب جسے پسند نہیں کرتے موصوف کے یہاں وہ بوجہ بے نفسی ایک معمولی بات تھی۔ میرے خسر مولوی محمود صاحب رام پوری فرماتے تھے کہ وہ دیوبند میں طالب علمی کے زمانے میں چھوٹی مسجد میں رہا کرتے تھے جس میں حضرت مفتیٔ اعظم مولانا عزیزالرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قیام تھا، اس زمانے میں طلبہ میں چارپائی کا دستور نہ تھا، سادگی اور تواضع سے عموماً طلبہ زمین پر لیٹتے تھے، مولوی صاحب باوجود رئیس گھرانے کا ایک فرد ہونے کے عام طلبہ کی طرح فرش زمین ہی پر اپنے حجرے میں لیٹا کرتے تھے، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا موصوف سے اور رام پور کے اس

گھرانے سے بہت گہرا اور مخلصانہ تعلق تھا، اور مولوی محمود صاحب مرحوم سے یوں بھی خصوصیت زیادہ تھی، ایک دن حضرت شیخ چھوٹی مسجد میں تشریف لائے اور مولوی محمود صاحب کے حجرے پر گزر ہوا، یہ زمین پر فرش بچھائے لیٹے ہوئے تھے، فرمایا: محمود! تیرے پاس چارپائی نہیں؟ انہوں نے عرض کیا کہ: حضرت! چارپائی تو نہیں ہے، مجھے زمین پر لیٹنے کی عادت ہوگئی ہے۔ اس سے بہت متأثر ہوئے مگر فرمایا کچھ نہیں، اگلے دن دوپہر کا وقت تھا، گرمی شدید تھی لُو چل رہی تھی، کہ مولوی صاحب نے کھڑکی سے دیکھا حضرتؒ اپنے کندھے پر ایک چارپائی لئے خود تشریف لارہے ہیں، وزنی چارپائی ہے، مگر اسے سر پر اُٹھا رکھا ہے، مولوی صاحب صورتِ حال دیکھتے ہی حجرے سے نکل کر ننگے سر اور ننگے پیر حضرتؒ کی طرف دوڑے، حضرتؒ انہیں بھاگتا ہوا آتا دیکھ کر وہیں سڑک پر کھڑے ہوگئے اور چارپائی زمین پر رکھ دی، جب یہ قریب پہنچے تو ایک خاص انداز سے فرمایا کہ: جناب! یہ لے جاؤ اپنی چارپائی، مجھ سے نہیں اُٹھتی، میں بھی شیخ زادہ ہوں، مجھ سے یہ چارپائیاں نہیں گھسیٹی جاتیں۔ یہ فرماکر پیٹھ پھیرلی اور گھر روانہ ہوگئے۔ مولوی صاحب کچھ کہنے ہی نہ پائے اور چارپائی اُٹھاکر حجرے میں لے آئے، گویا انہیں کوئی کلمہ معذرت کا بھی کہنے نہیں دیا کہ وہ معناً ثناء حسن ہوجاتی۔ اللہ اکبر! کیا ٹھکانا ہے اس بے نفسی کا اور کیا ٹھکانا ہے اس شفقت کا اپنے چھوٹوں پر، اور کیا ہے مدحِ خلق سے اس استغناء کا اور کیا ٹھکانا ہے اس ذکاء و دانش اور معاملات میں حسنِ اُسلوبی کا۔ حضرت نانوتویؒ کی وفات کے بعد حضرتِ شیخ کی عادت تھی کہ ہر جمعرات کو حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس حاضری کے لئے گنگوہ کا سفر پیدل کیا کرتے تھے، جمعرات کو چھٹی کا گھنٹہ بجتا، اسی وقت سبق سے اُٹھ کر گنگوہ کا راستہ لیتے، گنگوہ دیوبند سے ۲۲ کوس یعنی ۳۰ میل ہے، حضرت اذانِ عصر پر چلتے اور عشاء گنگوہ پڑھ لیتے تھے، جمعہ کا پورا دن حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں گزار کر اَذانِ عصر کے قریب گنگوہ سے واپس ہوتے اور عشاء دیوبند پڑھ لیتے تھے، برسہا برس یہ معمول رہا،

سردی ہو یا گرمی یہ معمول قضا نہ ہوتا تھا۔ مولوی محمود صاحب کا بیان ہے کہ ایک دن ہم دو تین طلباء نے اصرار کیا کہ حضرت! ہم بھی ساتھ چلیں گے، فرمایا: اچھا! مگر اس دن حضرتؒ نے ان طلباء کی رعایت سے پیدل سفر کرنے کے بجائے ارادہ کیا کہ سفر سواری پر ہو، تو کمہار کا ایک ٹٹو کرایہ پر لے لیا اور ارادہ یہ کیا کہ دو تین طلباء ہیں اُترتے چڑھتے چلے جائیں گے، چنانچہ کمہار ٹٹو لے کر دارالعلوم کے دروازے پر آ گیا، حضرتؒ حسبِ معمول اذانِ عصر کے قریب درس سے اُٹھے، یہ طلباء بھی حاضر تھے، تو حضرتؒ نے فرمایا کہ بھائی میاں محمود! پہلے تم سوار ہو پھر باری باری ہم بھی سوار ہوتے رہیں گے، انہوں نے حضرتؒ کے سوار ہونے پر اصرار کیا، مگر حضرتؒ نے نہ مانا، زبردستی مولوی محمود صاحبؒ کو ٹٹو پر سوار کر دیا، دو طلبہ اور خود حضرتؒ پیچھے پیچھے پیدل روانہ ہوئے، بلکہ ایک قمچی ہاتھ میں لے کر ٹٹو کو ہنکانے کا فریضہ بھی اپنے ذمہ لیا۔ مولوی محمود صاحبؒ فرماتے تھے کہ میں سخت ضیق میں تھا کہ حضرت تو پیچھے پیچھے پیدل ہیں اور میں سوار ہوں، مگر مجبور تھے حکم یہی تھا، دو چار میل چل کر یہ ٹٹو سے اُتر گئے تو حضرتؒ نے زبردستی دُوسرے طالبِ علم کو بٹھایا اور خود ٹٹو ہانکتے جا رہے ہیں، چار پانچ میل پر تیسرے طالبِ علم کو چڑھا دیا، تیس میل کا سفر پورا طے ہو گیا مگر خود نہیں چڑھے، باری باری ان طلباء ہی کو بٹھاتے رہے، اس وقت اندازہ ہوا کہ یہ ٹٹو اپنے لئے کرایہ پر نہیں لیا تھا بلکہ شفقتہً ان طلباء کے لئے کیا گیا تھا، جمعہ کو واپسی ہوئی تو یہ طلبہ بہت گھبرائے کہ اب پھر وہی معاملہ ہوگا کہ ہم ٹٹو پر سوار ہوں گے اور حضرت پیدل چلیں گے، باہم مشورہ ہوا کہ آخر کیا صورت اختیار کی جائے کہ ہم پیدل چلیں اور حضرت کو ٹٹو پر سوار کر دیں، مولوی محمود صاحبؒ فرماتے تھے کہ میں نے کہا: ترکیب تو میں کر دُوں گا کہ حضرت پورے راستے ٹٹو سے نہ اُتر سکیں گے مگر ایک دفعہ سوار کر دینا ہے۔ چنانچہ جب گنگوہ سے روانگی ہوئی تو حضرتؒ نے حسبِ معمول طلبہ پر زور دیا کہ سوار ہو مگر یہ لوگ ایکا کر چکے تھے، عرض کیا کہ حضرت! آتے ہوئے ہم سوار رہے اب واپسی میں

یہ نہیں ہوگا، حضرت سوار ہوں خواہ پھر اُتر لیں، مگر ابتداء حضرت ہی کے سوار ہونے سے ہوگی۔ جب یہ سب اکٹھے ہوکر بضد ہوئے تو حضرتؒ نے آخر قبول فرمالیا اور ٹٹو پر سوار ہوگئے، طلبہ نے چپکے سے مولوی محمود صاحب سے کہا کہ اب تم وہ موعودہ ترکیب کرو کہ حضرت دیوبند تک ٹٹو سے اُترنے نہ پائیں۔ چنانچہ مولوی صاحبؒ نے وہ مؤثر نسخہ استعمال کیا، جب حضرتؒ سوار ہوگئے تو انہوں نے ٹٹو کے برابر میں آکر حضرت نانوتویؒ، حضرت حاجی امداداللہؒ، حضرت حافظ صاحب شہیدؒ وغیرہ اکابر کا تذکرہ چھیڑ دیا، حضرتؒ کی عادت تھی کہ ان بزرگوں کا تذکرہ چھڑتے ہی اس میں محو ہوجاتے تھے اور پھر اِدھر اُدھر کی کچھ خبر نہیں رہتی تھی، ان حضرات کا تذکرہ چھڑتے ہی جو حضرتؒ نے ان بزرگوں کے واقعات بیان کرنے شروع کئے تو نہ حضرتؒ کو راستے کی خبر رہی نہ ان طلبہ کی، پورے چھبیس میل کا سفر طے گیا کہ ندی آگئی جو دیوبند سے تین چار میل کے فاصلے پر ہے، ندی دیکھتے ہی حضرتؒ نے گھبرا کر فرمایا کہ اوہو ندی آگئی، اور یہ کہہ کر ٹٹو سے کود کر اُترے، فرمایا: بھائی! میں نے تم سب کا حق مارلیا، لو جلدی سے تم سوار ہو، طلبہ نے ہر چند حضرت کے بیٹھنے پر اصرار کیا، مگر اب حضرت تہیہ فرما چکے تھے، کسی کی نہیں سنی، باری باری ان لوگوں کو بٹھلایا، شہر میں داخل ہوئے تو پھر اسی شان سے کہ طلبہ سوار ہیں اور حضرت پیدل ہیں، قمچی ہاتھ میں ہے اور ٹٹو ہانک رہے ہیں، جس سے طلبہ بچنا چاہتے تھے بالآخر وہی چیز پھر سامنے آکر رہی، سبحان اللہ بے نفسی اور شفقت کی انتہاء ہے۔

حضرتِ اقدسؒ کو اس بے نفسی کے عالم میں کسی بھی ایسے کام سے عار نہ تھا جو بظاہر علماء کی شان کے خلاف سمجھا جاتا ہے، عار تو جب آئے کہ خلافِ شان کیا جائے، اور جو شان ہی مٹا چکا ہو اس کے شان اور خلافِ شان کا سوال ہی کیا پیدا ہوسکتا تھا۔ میرے رشتہ اور خِطبہ کا جب سوال آیا تو حضرتؒ ہی کی رائے تھی کہ یہ رشتہ رام پور میں مولوی محمود صاحب مرحوم کی لڑکی سے بھیجا جائے، حضرتؒ کا اس گھرانے سے گہرا

تعلق تھا، اور چونکہ حضرت مولانا حکیم ضیاء الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ (مولوی محمود احمد صاحب مرحوم کے تایا تھے، حضرت حافظ ضامن صاحب شہیدؒ کے خلیفہ مجاز اور بڑے قویّ النّسبۃ اکابر میں سے تھے) اس تعلق سے رام پور کے گھرانے سے رُوحانی رشتہ بھی تھا، دُوسرے یہ کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی رام پور کا گھرانہ بہت عزیز تھا، گھر کے سے تعلقات تھے، بہرحال چند در چند روابط تھے، جس سے اس خاندان اور گھرانے سے گنگوہ، دیوبند اور تھانہ بھون کے نسبی اور رُوحانی کئی طرح کے رشتے اور خصوصی تعلقات تھے، اس لئے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا اصرار تھا کہ طیب کا رشتہ رام پور کے اس خاندان میں مولوی محمود صاحب کی لڑکی سے بھیجا جائے، جب والد صاحب، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اور یہ سب بزرگ اس رائے پر متفق ہوگئے تو حضرتؒ ہی نے بڑی اُمنگ اور جوشِ مسرّت سے فرمایا کہ بھائی! یہ رشتہ میں لے کر جاؤں گا، چنانچہ یہ پیغام خود ہی لے کر رام پور تشریف لے گئے اور وہاں فرمایا کہ بھائی! میں اس وقت حضرت نانوتویؒ کے گھرانے کے ایک ڈوم اور حجام کی حیثیت سے رشتے کا پیامی بن کر آیا ہوں۔ اللہ اکبر! کیا ٹھکانا ہے اس بے نفسی اور نسبت کی عظمت و احترام اور تعلقات کے نباہنے اور انہیں مستحکم کرنے کے جذبات کا، یہی چیز تھی جس نے شیخ کو شیخ الہند بنایا اور عالمگیر مقتدائی کا منصب عطا فرمایا افسوس یہ ہے کہ جب نکاح کا وقت آیا تو حضرتؒ مالٹا کے اَسیر ہوچکے تھے، رام پور میں بسلسلۂ بارات سارے اکابر حضرت تھانویؒ، حضرت رائے پوریؒ اور دیوبند اور سہارنپور کے تمام اکابر و مشائخ جمع تھے، مگر حضرت نہ تھے، میرا نکاح حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے پڑھایا اور حضرت شیخ کی عدم موجودگی سب محسوس کرتے رہے۔

حضرت نانوتویؒ کے والد ماجد شیخ اسد علی صاحب مرحوم جب مرضِ وفات میں مبتلا ہوئے تو علاج کے لئے دیوبند لائے گئے تھے، قیام حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے مکان پر تھا، دستوں کا مرض تھا، بعض اوقات دستوں کی کثرت سے کپڑے بھی

آلودہ ہوجاتے اور انہیں دھونا پڑتا تھا، حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے خدام نے کپڑوں کا دھونا اپنے ذمہ لینا چاہا مگر حضرت اجازت نہیں دیتے تھے اور فرماتے کہ یہ میرا حق ہے اسے تلف مت کرو۔ چنانچہ خود کپڑے دھوتے تھے، اسی دوران میں ایک دفعہ دست چارپائی پر خطا ہوگیا، اس وقت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ یہاں موجود نہ تھے، حضرت شیخ الہندؒ موجود تھے، اور صورت ایسی ہوگئی کہ نجاست اُٹھانے کے لئے کوئی ظرف بھی نہ تھا، اور حضرتِ شیخ نے بے تکلف ساری نجاست اپنے ہاتھوں اور ہتھیلیوں میں لے لی اور سمیٹنی شروع کردی، تمام ہاتھ گندگی میں آلودہ ہی نہ تھے بلکہ ہاتھوں میں نجاست لبریزی کے ساتھ بھری ہوئی تھی، حضرت نانوتویؒ پہنچ گئے اور دیکھا کہ حضرت شیخ الہندؒ کے دونوں ہاتھ نجاست اور مواد سے بھرپور ہیں اور وہ اسے سمیٹ سمیٹ کر بار بار باہر جاتے ہیں اور پھینک پھینک کر آتے ہیں، اس پر حضرت نانوتویؒ بہت متأثر ہوئے اور وہیں کھڑے کھڑے ہاتھ دُعا کے لئے اُٹھائے اور عرض کیا: خداوند! محمود حسن کے ہاتھوں کی لاج رکھ لے۔ اور اس خاص وقت میں جو جو بھی اپنے اس محبوب تلمیذ کے لئے مانگ سکتے تھے ہاتھ اُٹھائے ہوئے مانگتے رہے۔ اس قبولیت اور دِل سے نکلی ہوئی دُعاؤں نے کیا کچھ اثر نہ دِکھلایا ہوگا، دِکھلایا اور وہی مولوی محمود حسن تھے کہ ہند کے شیخ اور عالمگیر زعیم بنے جن کی فراست و جواں مردی اور جوشِ جہاد کے چرچے ہند اور بیرونِ ہند میں تھے، امیر امان اللہ نے افغانستان کی پارلیمنٹ میں کہا تھا کہ محمود حسن ایک نور ہے جس کی روشنی میں ہم بہت کچھ دیکھ سکتے ہیں۔ جمال پاشا گورنر حجاز نے حضرتؒ کے مختصر سے جثّہ کو دیکھ کر کہا تھا کہ ان مختصری ہڈیوں میں کس قدر دِین اور سیاست بھری ہوئی ہے۔ برطانیہ کے ایک ذمہ دار (سر جیمس مسٹن گورنر یوپی) نے کہا تھا کہ اگر محمود حسن کو جلاکر راکھ بھی کردیا جائے تو اس کی راکھ بھی انگریزوں سے کترا کر اُڑے گی۔ یہ تو حکمرانوں اور سلاطین کے مقولے ہیں جن سے حضرتِ اقدس کی سیاسی بصیرت، جوشِ عمل اور بغض فی اللہ ظاہر ہوتا ہے، اور ادھر

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے جو حضرتِ شیخ کے مربی تھے فرمایا کہ: ''محمود حسن علم کا کٹھلا ہے۔'' اس سے جوشِ جہاد اور غیر معمولی بغض فی اللہ پر احتیاط و تدین کا یہ عالم تھا کہ تحریکِ خلافت کے دوران جب ترکِ موالات کے بارے میں حضرتؒ سے استفسار کیا گیا تو اپنے تین محبوب ترین شاگردوں (حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی صاحبؒ اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت علامہ مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دہلویؒ) کو بلا کر فرمایا کہ بھائی! یہ استفتاء آیا ہے، میں چاہتا ہوں کہ اس کا جواب آپ لکھ دیں کیونکہ حکمِ خداوندی یہ ہے کہ:-

وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا، اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی. (المائدۃ:۸)

ترجمہ:- اور تمہیں کسی قوم کی عدوات اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل و انصاف کے خلاف کچھ کہو، عدل کرو کہ وہی تقویٰ کے قریب تر ہے۔

اور مجھے انگریزوں سے جس درجہ عداوت و بغض ہے اس کے ہوتے ہوئے مجھے اپنے نفس پر اطمینان نہیں ہے، کہیں میں ان کے بارے میں خلافِ انصاف کوئی بات نہ لکھ جاؤں۔ جو حضرات دُشمنوں کے بارے میں بھی یہ احتیاط و تدین اور رعایتِ حدود فرمائیں، ان کا تقویٰ و تقدس دوستوں اور حق کے بارے میں کیا کچھ نہ ہوگا؟

بہرحال یہ تھے شیخ الہند اور یہ تھا ان کا ایمان و تقویٰ اور علم و فضل اور وَرع و احتیاط، یہ چند باتیں سامنے کی گزری ہوئی ہیں، اس لئے زبانِ قلم پر آگئیں، اور وہ بھی بطور تذکرہ عقیدت و محبت، ورنہ کہاں شیخ کی سوانح حیات اور رفیع حالات اور کہاں ہم جیسے ناکارہ۔

(ماہنامہ ''الرشید'' لاہور جولائی ۱۹۷۴ء)

پُرسکون زندگی

سوال یہ ہے کہ اس پریشان و اَبتر دُنیا میں انسان کس طرح ایک خوش و خرم اور پُرسکون زندگی بسر کرسکتا ہے؟ اور یہ سوال اہم اور دِکھی دِلوں کی ایک عمومی پکار ہے۔

اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے دُنیا میں دو ہی راستے اختیار کئے گئے ہیں، ایک اہلِ عقل و فلسفہ نے اختیار کیا، کہ اسبابِ راحت ہی اصل راحت ہے، جیسے مال، جائیداد وغیرہ، اور اسبابِ مصیبت ہی اصل مصیبت ہے، جیسے دُکھ، درد، بیماری، وباء وغیرہ۔ اس غلط تشخیص کی وجہ سے ان کی تدبیر بھی ناکام رہی، یعنی زیادہ سے زیادہ اسبابِ راحت کو سمیٹا جائے اور اسبابِ مصیبت کو رفع کیا جائے، حالانکہ یہ انسانی قدرت سے باہر ہیں اور یہ اسباب راحت وسکون بھی نہیں کیونکہ راحت و مصیبت کا تعلق دِل کے تأثر سے ہے، یعنی مصیبت خود ہمارے دِل کی کیفیت ہے، دُنیا کے واقعات نہیں۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ بندۂ عقل کو کبھی قلبی راحت نہیں مل سکتی۔

دُوسرا راستہ انبیاء وصلحاء نے اختیار کیا، یعنی اسبابِ مصیبت اور حوادث کو اپنے حال پر چھوڑ کر دِل کی کیفیت بدلنے کی طرف توجہ دی اور عالمِ انسانیت کو یہ پیغام دیا کہ اس دُنیا کا ایک خالق ہے اور وہ مالک بھی ہے، حکیم بھی ہے، جس نے اس دُنیا کو ایک خاص مقصد کے لئے نمود بخشی ہے، اور یہ کہ بندے ہر حال میں اس کی قربت و رضا حاصل کریں، کائنات کی ہر چیز حتیٰ کہ اپنی جان و مال سے بھی اس کو عزیز رکھیں اور اس راہ میں جو حالت ان پر طاری ہو اور جو اسبابِ راحت و مصیبت پیش آئیں ان کو قرب کا ذریعہ بنائیں اور خود کو ہمہ تن حق تعالیٰ کے حوالے کردے۔

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی خدائے تو
دل شدہ مبتلائے تو ہرچہ کنی رضائے تو

ترجمہ:- اگر تو زندہ رکھے تو تیری عطا ہے، اور اگر تو قتل کرے تو تیری رضا ہے، دِل تیرا عاشق ہے، جو تو کرے تیری رضا میں خوش ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ بندۂ خدا کو کبھی قلبی پریشانی نہیں ہوتی:-

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ.

ترجمہ:- آگاہ رہو اللہ کی یاد ہی سے دِل چین پاتے ہیں۔

لبِ لباب یہ ہے کہ اصل راحت و مصیبت اسباب و حوادث نہیں بلکہ دِل کی کیفیت و تائید ہے، پس اگر اس کیفیت کو تبدیل کرلیا جائے تو پُرسکون زندگی کا مسئلہ حل ہوجائے گا، اس تأثر کی تبدیلی کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ انسان زندگی کے کسی ایسے عالی مقصد کو اپنی زندگی کا محوَر بنالے جو تمام اسبابِ راحت و مصیبت سے بالاتر ہو بلکہ جس کی راہ میں مصیبت بھی باعثِ لذّت ہو، انبیاء علیہم السلام نے اللہ تعالیٰ کے قرب و رضاء کو اور اس کے اَحکام کی تعمیل کو مقصدِ عالی قرار دیا ہے، اس مقصد کی راہ میں انسان کی یہ کیفیت ہوتی ہے ؎

بجرِ قتلم چو کشد، تیغ نہم سر بسجود
او بناز عجبے، من بنیاز عجبے

ترجمہ:- جب اس نے مجھے قتل کرنے کے لئے تلوار نیام سے کھینچی تو میں نے سر سجدے میں رکھ دیا، وہ عجیب ناز والا ہے اور میں عجیب نیاز والا ہوں۔

(ماہنامہ ''الرشید'' لاہور ستمبر ۱۹۷۷ء)

زندگی کا مقصد کیا ہے اور کیا ہونا چاہئے؟

وہ انسان، انسان نہیں جو اپنے انجام کو بھلا دے

حضرت محترم المکرّم زید مجدکم السامی، سلامِ مسنون نیازِ مقرون، مزاجِ گرامی!

آپ حضرات سے رُخصت ہوکر دہلی سے ۲۸رمئی ۱۹۷۸ء کو علی الصباح ۶ بجے ایئر انڈیا سے امریکہ کے لئے روانہ ہوگئے، جہاز بڑا تھا اور تیز رفتار، اوّلاً پاکستان کے اُوپر سے گزرے، پھر ایران کے اُوپر سے پرواز کی، پھر ترکی اور انقرہ کو پار کیا، پھر آسٹریلیا، ہنگری سے گزرے، پھر رُوم اور اٹلی کو پار کیا، پھر جرمنی میں داخل ہوئے اور پورے آٹھ گھنٹے کی مسلسل پرواز کے بعد جہاز جرمنی کے ہوائی اڈّہ ''فرنگ فرڈ'' پر اُترا تو میری گھڑی میں ہندوستان کے وقت کے مطابق ۳ بج رہے تھے کیونکہ جہاز ساڑھے چھ بجے دہلی سے اُڑا تھا اور ساڑھے آٹھ گھنٹے کی مسلسل پرواز کے بعد یہاں رُکا تو میں نے اسلم سے کہا کہ اب نماز کی تیاری کرنی چاہئے، اس نے کہا: کون سے وقت کی؟ میں نے کہا: ظہر کے وقت کی، کہا: ظہر ابھی کہاں، یہاں تو ابھی دس بجے ہیں، ابھی زوال میں دو گھنٹے باقی ہیں۔ جہاز دو گھنٹے کے بعد لندن پہنچا، میں نے کہا: اب تو نمازِ ظہر قضا ہی پڑھنی پڑے گی، اسلم نے کہا: یہاں تو ابھی ساڑھے نو بجے ہیں، زوال میں ابھی ڈھائی گھنٹے پڑے ہیں۔ غرض جوں جوں آگے بڑھتے گئے دن پیچھے سرکتا گیا، گھنٹوں کا انتظار کیا مگر ظہر کا وقت آ کر نہ آیا، پورے بیس گھنٹے گزر گئے جبکہ آپ لوگ آدھی رات میں پڑے سو رہے ہوں گے اور یہاں ظہر نے آ کر نہ آیا۔ خلاصہ یہ کہ صبح ۶ بجے سے پورے بیس گھنٹے چل کر نیویارک کے ہوائی اڈّے پر ظہر کا

وقت آیا اور یہاں ۲ بج رہے تھے، غرض صبح ۶ بجے سے ۲۰ گھنٹے پرواز کر کے بمشکل تمام ظہر کے وقت کو پایا اور امریکہ میں ظہر کی نماز پڑھی، ہوائی اَڈّے پر سامان وغیرہ تلاش کرنے اور کسٹم وغیرہ کے مرحلوں میں تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے صَرف ہوگئے۔

جو حضرات ہوائی اَڈّے پر آئے ہوئے تھے ان کے ساتھ میاں احتشام سلّمہ کے گھر پہنچے اور نمازِ عصر ادا کی، دن تھا کہ پورا ہی نہ ہونے پاتا تھا، یعنی ۲۶ گھنٹے دن ہی دن رہا، نیویارک پہنچ کر، بلکہ گھر پہنچ کر بھی مغرب میں ایک گھنٹہ باقی تھا، جوں جوں آگے بڑھتے رہے دن پیچھے سرکتا چلا گیا، بیس گھنٹے جہاز میں ایک نشست پر بیٹھے بیٹھے میں تو چور ہوگیا، رات کی نیند سے کہیں طبیعت دُرست ہوئی۔ اگلی صبح کی دعوت سیف اللہ صاحب کے یہاں تھی جو اپنی کار لے کر ہوائی اَڈّے آئے تھے، کھانا کھا کر ان کے بنگلے پر ظہر پڑھی اور وہیں سے شہر کو دِکھلانے کے لئے ہم سب کو مع بچی سلّمہا کے ٹاؤن پہنچے، شہر کیا ہے قدرت کے عجائبات کا ایک نمونہ ہے، آٹھ دس منزلہ مکان تو یہاں ''جھونپڑی'' سمجھا جاتا ہے، جبکہ بلڈنگیں بیس بیس، تیس تیس، چالیس چالیس اور پچاس پچاس منزلوں کی عام ہیں، سارا شہر میناروں کا ایک طلسماتی عجائب گھر ہے، سب سے اُونچی بلڈنگ ۱۰۲ منزلہ ہے جس کے فوٹو دیکھے تھے، وہ جب سامنے آئی تو اس کی اُونچائی کو آنکھ کسی طرح نہ دیکھ سکی، گردن دُکھنے لگتی تھی، اور پھر اس کے اُوپر کی منزل نظر نہ آتی تھی، تو سب کا مشورہ ہوا کہ اس بلڈنگ پر چڑھ کر اُوپر سے نیچے دیکھا جائے، اس طرح گردن نہ دُکھے گی۔ چنانچہ اس میں داخل ہوئے اور لفٹیں اس طرح بدلتی رہیں جیسے مختلف جنکشنوں پر ریلیں تبدیل ہوتی ہیں، سب سے اُوپر کی منزل میں پہنچ کر پورا شہر سامنے تھا، باہر سے وہ مینار نظر آتی تھی لیکن اندر پہنچ کر منزلوں کو دیکھا تو اس میں بڑے بڑے ہال ہیں، بازار الگ ہیں، دفاتر الگ ہیں اور ساز و سامان اور آرائش کی تو کوئی حد نہ تھی، غرض عقل دنگ تھی کہ کس دُنیا میں پہنچ گئے، ساتھیوں نے کہا کہ آپ اس ایک بلڈنگ کو دیکھ کر جبکہ ایسی ایسی بلڈنگوں سے سارا شہر چھپا پڑا ہے کس نتیجے پر پہنچے؟

میں نے کہا: اس حیرت وتعجب پر پہنچا ہوں کہ اتنی لمبی چوڑی عقلوں کے بعد ان معماروں اور مالکوں کی نظر انجام پر کیوں نہیں پہنچی؟

کیا ان سے پہلے بھی دُنیا میں بڑی بڑی قومیں جاہ و جلال کے ساتھ نہیں آئیں اور انہوں نے تمدنی عجائبات کیا کچھ پیدا نہیں کئے؟ لیکن آج ان کے قدموں کی چاپ تک سننے والا کوئی نہیں ہے، وہ صرف گارے پانی میں ہی اُلجھ کر رہ گئیں اور آخرت ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوکر رہ گئی۔

سڑکوں پر عجیب وغریب ڈیزائنوں کی نہایت لمبی لمبی کاریں اس طرح یکے بعد دیگرے آجارہی ہیں جیسے کیڑی کا نال چلتا ہے کہ اتنی زمین ان سے چھپ جاتی ہے۔

میں نے کہا کہ مجھے تو حیرت ہے اوران سر بکف قسم کی بلڈنگوں کو دیکھ کر وحشت ہو رہی ہے، بہرحال شہر میں گھومنے اور حیرت و وحشت کے ساتھ وقت پورا کر کے قبل مغرب گھر پہنچے، پروگرام یہ طے کرلیا گیا تھا کہ مجھے یہاں سے ۲۹/جون کو روانہ ہوجانا ہے، جبکہ ۲۹/مئی کو یہاں آنا ہوا، اس لئے ایک مہینے سے زائد میرے پاس وقت نہیں ہے، مگر عزیز عابد میاں نے کہا کہ نیویارک میں رابطہ عالمِ اسلامی کا ایک بین الاقوامی جلسہ ہو رہا ہے جو ۳۰/جون یومِ جمعہ کو ہوگا اس میں آپ کی شرکت ضروری ہے، میرا ارادہ تھا کہ ۲۹/جون کو چل کر لندن اُتروں تا کہ یہ بیس گھنٹے کی نشست یا قیدِ بامشقت مع جرمانہ دوقسطوں میں بٹ جائے گی اور ضعف غیر معمولی نہ ہو، مگر ان کے کہنے پر لندن کا ارادہ ملتوی کر کے وہی بیس گھنٹے کی نشست قبول کرنی پڑی، اس لئے اب واپسی کا پروگرام یہ ہے کہ ہم اِن شاء اللہ ۳۰/جون ۱۹۷۸ء یومِ جمعہ نیویارک میں گزار کر شب کونو بجے ایئر اِنڈیا پر سوار ہوں گے، اگلا دن اور رات جہاز میں گزار کر (جو جانے کے وقت کا رَدِّعمل ہے کہ آتے وقت رات آکر ہی نہیں دیتی تھی) یہاں پورے ایک دن کے ساتھ دو راتیں بھی جہاز میں گزارنی پڑیں گی، اس طرح اِن شاء اللہ یکم جولائی کو علی الصبح دہلی کے ہوائی اڈّے پر اُتریں گے۔

(ماہنامہ ''الرشید'' ساہیوال اگست ۱۹۷۸ء)

تعلیمِ نسواں

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ، اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا. (الاحزاب:۳۴)

ترجمہ:- یاد کرو جو پڑھی جاتی ہیں تمہارے گھروں میں اللہ کی باتیں اور عقل مندی کی، بے شک اللہ ہے بھید جاننے والا خبردار۔

میرے عزیز بھائیو اور بہنو! اس وقت بڑا مقصد یہ ہے کہ عورتوں کے بارے میں کچھ بیان کیا جائے، مرد تو جگہ جگہ سنتے ہیں مگر عورتوں کو موقع نہیں ملتا، ضرورت ہے کہ عورتوں کے اجتماعات کر کے انہیں احکامات بتلائے جائیں۔

میری بہنوں کے دِل میں عام طور پر یہ خیال جم گیا ہے کہ ہمارا کام صرف یہ ہے کہ گھربار کا کام کرلیا، نماز پڑھ لی، بچوں کی پرورِش کی، ذمہ داری ختم ہوگئی، کمالات حاصل کرنا عورتوں کا کام نہیں۔

بُرا نہ مانیں تو میں کہوں گا کہ یہ کام چوری کی بات ہے، حقیقت یہ ہے کہ جتنے درجات مردوں کے لئے رکھ دیئے اتنے ہی درجات عورتوں کے لئے بھی رکھ دیئے گئے ہیں، عورتیں بڑی سے بڑی عالمہ، ادیبہ بن سکتی ہیں، چند عہدے تو ایسے ہیں جو عورتوں کو نہیں دیئے گئے، ان کو نبوّت نہیں دی گئی، امام داوٗد ظاہری قائل ہیں کہ عورت نبی ہوسکتی ہے، ان کے نزدیک والدہ عیسٰیؑ، والدہ موسٰیؑ، آسیہ نبی تھیں، البتہ عورت صاحبِ شریعت نہیں بن سکتی، کہ وہ اُمت کو تلقین کرے۔ عورت مربی بنے گی تو ان کے سامنے مرد بھی آئیں گے، تب حجاب نہیں رہے گا، تو یہ بخل نہیں ہے، دراصل یہ

ان کے مناسبِ شان نہیں ہے، اسی طرح عورت کو قضا کا عہدہ نہیں دیا گیا، قاضی بنایا جاتا تو حجاب توڑنا پڑتا، مدعی و مدعا علیہ کو دیکھتی اور ان کی باتیں سنتی، ان کے چہرے مہرے دیکھتی تو حجاب اُٹھ جاتا۔

عورتوں میں بڑی بڑی شاعرہ، ادیبہ، محدثہ گزریں، ازواجِ مطہراتؓ میں عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ وحی کا آدھا علم عائشہؓ سے حاصل کرو، اور آدھا باقی صحابہ کرامؓ سے۔ بڑے بڑے صحابہؓ ان سے مسائل پوچھتے، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا احسان ہے اُمت پر کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرکے بہت سے علوم کا دروازہ کھول دیا۔

حدیث میں ہے کہ کسی کے دُودھ پیتے تین بچے مرجائیں تو وہ ماں باپ کے لئے شفاعت کریں گے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا: یا رسول اللہ! اگر دو بچے مرجائیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کا بھی یہی حکم ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے پھر پوچھا کہ اگر ایک مرجائے؟ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا کہ اس کا بھی یہی حکم ہے، بچے اللہ تعالیٰ سے جھگڑیں گے، ضد کریں گے ماں باپ کے لئے، یہ بچے جہنم کا راستہ روکیں گے، فرشتے کہیں گے: وہ گنہگار ہیں انہیں کس طرح جنت میں لے جائیں؟ مگر بچے بضد ہوں گے کہ ہم جانے نہیں دیں گے۔ فرشتے حق تعالیٰ کے سامنے معاملہ پیش کریں گے، بچے حق تعالیٰ سے کہیں گے کہ: اگر انہیں جہنم میں بھیجنا ہے تو ہمیں بھی بھیج دیں، حق تعالیٰ فرمائیں گے: "أیھا الطفل المراغم لربہ" اے جھگڑالو بچے! جاؤ لے جاؤ اپنے ماں باپ کو بھی۔

کہا جاتا ہے کہ تین ہٹیں ہیں، بالک ہٹ، تریا ہٹ، راج ہٹ، ایک مرتبہ اکبر بادشاہ کے دربار میں بچوں کا ذکر آیا، کون سی ضد ایسی ہے جسے پورا کرنا ہر ایک کا کام نہیں؟ اس پر بحث چلی تو مُلاّ دوپیازہ نے کہا: بچوں کی ضد، اسے پورا کرنا ہر ایک کا کام نہیں۔ اکبر نے کہا: ہم بادشاہ ہیں، ہم پورا کرسکتے ہیں، مُلاّ نے کہا: اچھا ہم بچہ

بنتے ہیں میری ضد پوری کیجئے۔ مُلاّ دوپیازہ بچوں کی طرح رونے لگے، کہا گیا: کیوں روتے ہو؟ کہو کیا مانگتے ہو؟ مُلاّ نے کہا: ہاتھی مانگتے ہیں، اکبر نے ہاتھی دیا، اس نے پھر رونا شروع کیا، پوچھا گیا: کیوں روتے ہو؟ مُلاّ نے کہا: ہاتھی کو قلیا میں بند کرو، قلیا میں ہاتھی بھرنا ناممکن ہے، آخرکار اکبر عاجز آ گیا، بہرحال بچوں کی ضد وہاں بھی قائم رہے گی۔

یہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا احسان ہے کہ انہوں نے سوال کرکے آسانی کرادی، حتیٰ کی ناقص بچہ بھی پیدا ہو تو وہ بھی شفاعت کرے گا، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی عورت ہیں مگر آدھا دِین ان کا مرہون ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تو زوجۂ پاک ہیں، ان کا رُتبہ تو بہت بڑا ہے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی بیوی کا واقعہ سنیے:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بچہ بیمار تھا، علاج ہو رہا تھا کہ حضرت جابرؓ کو سفر پیش آیا، حضرت جابرؓ نے بیوی سے فرمایا کہ بچے کا خیال رکھنا، وہ جب سفر سے لوٹے تو بچے کا انتقال ہوچکا تھا، ماں نے بچے کو کپڑے سے ڈھانپ دیا اور شوہر کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا، انہون نے پوچھا کہ بچہ کیسا ہے؟ بیوی نے جواب دیا: الحمدللہ بعافیت وخیر وہ اچھا ہے۔ کھانا پیش کیا، کھانا کھا رہے تھے کہ بیوی نے شوہر سے کہا کہ بتلایئے کہ اگر کوئی کسی کے پاس امانت رکھ دے اور مقرّرہ وقت پر امانت مانگے تو واپس کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ شوہر نے جواب دیا کہ ضرور واپس کرنا چاہئے، بیوی نے کہا: کیا واپس کرکے رنجیدہ ہونا چاہئے؟ فرمایا: ہرگز نہیں، بلکہ شکر ادا کرنا چاہئے، بیوی نے کہا: بچہ اللہ کی امانت تھا، اللہ کا قاصد آیا اور اسے لے گیا تو ہمیں اس پر خوش ہونا چاہئے کہ رنجیدہ؟ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بیوی کے ہاتھ چومے اور فرمایا: تو نے غم ہلکا کردیا۔

تو علم، عقل اور سلیقہ نہ ہو تو شوہر کا دِل بھی خوش نہیں کرسکتی، اس سلیقہ مند

بیوی نے خاوند کا دِل تھاما، غم غلط کیا بلکہ ان کے دِل میں خوشی پیدا کر دی۔

حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا نکاح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پیغمبری سے پہلے ہوا، غارِ حرا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھبرا گئے گھر میں لوٹ کر حضرت خدیجہؓ سے فرمایا: "زَمِّلُوْنِیْ، زَمِّلُوْنِیْ" حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: "کلا واللہ ما یحزنک اللہ الا انک لتصل الرحم وتحمل الکل وتکسب المعدوم وتقری الضیف وتعین علی نوائب الحق"۔ اس کے بعد ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے احوال پوچھے، آپ نے واقعہ بیان فرمایا تو اس نے کہا: یہ وہ ناموس ہے جو حضرت موسیٰؑ کے پاس آتے تھے، جس وقت آپ کی قوم آپ کو نکال دے گی، کاش میں اس وقت جوان رہوں کاش میں زندہ رہوں، اگر میں اس وقت زندہ رہا تو آپ کی بھرپور مدد کروں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ: کیا میری قوم مجھے نکال دے گی؟ ورقہ نے کہا: ہاں، نبیوں کے ساتھ ایسا معاملہ پیش آتا ہے۔

تو ایک عورت نے نبی کی دِل داری کی، یہ تو ہیں طبقۂ اُولیٰ کی عورتیں، بعد کے دور میں بھی بڑی بڑی باکمال عورتیں اُمت میں گزریں، حضرت امام جعفرؒ کی بیٹی حدیث لکھتی تھیں۔

صاحبِ بدائع الصنائع کے زمانے میں ایک عالم کی بیٹی تھی جو حسن و جمال میں بھی مشہور تھی اور علم و کمال میں بھی، نکاح کے لئے پیغامات بہت آئے، بیٹی نے یہ شرط کی کہ میں اس سے نکاح کروں گی جو علم و کمال میں مجھ سے مقابلہ کر کے غالب آئے گا، چنانچہ بہت آئے مگر ناقص نکلے، صاحبزادی نے باپ سے کہا: آپ اعلان کر دیں کہ علمائے کرام فقہ میں کتاب لکھیں جس کی کتاب مجھے پسند ہوگی میں اس سے نکاح کروں گی۔

علماء نے کتابیں لکھیں، ان میں سے "بدائع الصنائع" کو انہوں نے پسند کیا،

اس کے مصنف تھے مفلس و قلاش، لڑکی نکاح کرنے پر راضی ہوگئی، نکاح ہوگیا، خسر نے بیٹی کو داماد کے سپرد کیا تو انہوں نے کہا: میں مسجد کے حجرے میں رہتا ہوں، میں انہیں کہاں لے جاؤں گا؟

بعد میں اللہ تعالیٰ نے دونوں کو کشائش دی اور اس قدر شہرت علم و فتاویٰ میں ہوئی کہ جس فتوے میں میاں بیوی دونوں کے دستخط ہوں وہی فتویٰ معتبر شمار کیا جاتا۔

ہماری نانی صاحبہ مرحومہ حدیث پڑھی ہوئی تھیں، شادی کی تقریب ہو تو وہ مشکوٰۃ شریف لے کے جاتیں، نکاح کے بعد مشکوٰۃ کھول کر جو حدیث نکلتی اس پر وعظ کرتیں، اس سے ہزاروں عورتوں کی اصلاح ہوئی، مطلب یہ ہے کہ عورت باکمال فاضل بننا چاہے تو بن سکتی ہے۔

عورت دِین کی طرف بڑھی تو اُونچا مقام حاصل کیا، دُنیا کی طرف بڑھی تو اُونچا مقام حاصل کیا، بہت سی عورتوں نے ایم اے کیا، بہت سی عورتیں حکمران بنیں، عورتیں علم و عمل میں اگر کمال حاصل کرنا چاہیں تو کرسکتی ہیں، بارہ گھنٹے میں ایک دو گھنٹے قرآن پڑھنے سے یا حدیث پڑھنے سے کیا عورت حافظ یا محدّث نہیں بن سکتی؟ کم سے کم ضروریاتِ دِین کا علم تو حاصل کرنا چاہئے، کم سے کم خاوند کا حق، اولاد کا حق، گھر کے دُوسرے افراد کا حق تو پہچانیں، اسلام نام ہے حقوق کی ادائیگی کا، روزانہ ایک مسئلہ یاد کرنے سے بھی سال بھر میں بہت سے مسائل یاد ہوجائیں گے۔

حدیث میں ارشاد ہے: ''من صلت خمسها ..... الخ''۔

نماز پڑھنے میں کون سی دُشواری ہے، خاوند کی خدمت کرنا ہی بڑا کام نہیں، اسی طرح سال بھر میں ایک مہینے کے روزے رکھنے میں کیا دُشواری ہے، آخرت کی زندگی کو غنیمت سمجھیں جو غیرمحدود ہے، ہزاروں لاکھوں اس دارِ فانی سے گزر گئے، کل کو ہمارے لئے بھی وقت آنے والا ہے، ہم بھی گزر جائیں گے۔

عورتوں کو چاہئے کہ نماز کی پابندی کے بعد قرآن شریف روزانہ تلاوت

کریں، ایک بڑی بی تھیں جو وضو کر کے قرآن پر ہاتھ پھیر پھیر کر کہا کرتی تھیں کہ یہ بھی اللہ نے سچ کہا، یہ بھی اللہ نے سچ کہا، اس طرح روزانہ وہ قرآن کھول کر عظمت کے ساتھ ہاتھ پھیر پھیر کر کہا کرتی تھیں۔

بچوں کا پہلا مدرسہ ماں کی گود ہے، ماں علم سے خالی ہوگی تو بچے بھی علم سے عاری ہوں گے۔

میرے والد بزرگوار نے کہا کہ بسم اللہ کر کے گھر کا دروازہ کھولو، اللہ تعالیٰ کی حفاظت شامل ہوگی، ہم نے پانی پیا برتن ڈھانکنا بھول گئے، والد صاحبؒ نے فرمایا: رات کو بہت سی بیماریاں آسمان سے اُترتی ہیں تو جو برتن کھلا رہتا ہے اس میں بیماری اُترتی ہے۔

مختلف دُعائیں مختلف اوقات کی جو حدیث میں ہیں، ان پر پابندی کی جائے، اگر بچوں کو دُعائیں سکھا دی جائیں تو اس سے اسلامی زندگی بنے گی۔

جو کام کریں نیک نیتی سے کریں تا کہ ہر کام اَجر کا ذریعہ بنے، کھانا پکانے میں، کپڑے سینے میں، خاوند کی اطاعت کی نیت کریں، ہر کام نیت سے کرو تو پوری زندگی عبادت اور اطاعتِ خداوندی بن جائے گی۔

اپنے بچوں کو شروع ہی سے خدمت گزاری اور عبادتِ خداوندی پر آمادہ کریں، اس طرح سے قوموں کی عزت اور سربلندی ہوتی ہے، محض عیش اُڑانے یا گھر میں بیکار بیٹھے رہنے سے انہیں بچایا جائے، اللہ تعالیٰ دِین پر چلنے کی توفیق بخشے، آمین!

(ماہنامہ ''الرشید'' لاہور اکتوبر ۱۹۸۳ء)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

قرآنِ کریم کی عملی تفسیر

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

سرکارِ دو عالم فخرِ بنی آدم رسول الثقلین حضرت محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مقدسہ اپنی ظاہری و باطنی وسعتوں اور پنہائیوں کے لحاظ سے کوئی شخصی سیرت نہیں، وہ کسی شخصِ واحد کا دستورِ زندگی نہیں بلکہ جہانوں کے لئے ایک مکمل دستورِ حیات ہے جوں جوں زمانہ ترقی کرتا چلا جائے گا اسی حد تک انسانی زندگی کی استواری و ہمواری کے لئے اس سیرت کی ضرورت شدید سے شدید تر ہوتی چلی جائے گی۔

زمانہ اور اس کا تمدن اپنی ارتقائی حرکت سے کہاں تک پہنچ گیا اور کل کو نہ جانے کہاں تک جا پہنچے، اور اس کی تمدنی زندگی کے گوشے کتنے بھی پھیلتے جائیں پھیل کر زمین و آسمان اور فضاء و خلاء سب ہی کو ڈھانپ لیں پھر بھی یہ ارتقائی سیرت اور اس کے تدین کے گوشے اسی حد تک تمدنی گوشوں کی تقویم و اصلاح کے لئے شاخ در شاخ ہو کر نمایاں ہوتے رہیں گے، جیسا کہ وہ اب تک زمانے کی مدنی ترقی کے ساتھ ساتھ نمایاں ہوتے رہے اور ان میں سکون و اطمینان کی رُوح پھونکتے رہے ہیں۔

اس کی شرعی وجہ یہ ہے کہ آیت: ''وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ'' کے بارے میں جب صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس خلق کی سیرت و اخلاق کے سلسلے میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ: ''وکان خلقہ القراٰن'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلق سیرت یہ قرآن ہی تو ہے، اور قرآن کے بارے میں خود صاحبِ سیرت

افضل الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ: ’’ولا ینقضی عجائبہ ولا یخلق عن کثرۃ الرد‘‘ اس قرآن کے عجائبات (علوم و معارف) کبھی ختم ہونے والے نہیں اور یہ بار بار کے تکرار سے کبھی بھی پُرانا نہیں ہوگا کہ اس سے دِل اُکتا جائیں۔ اس سے یہ صاف نتیجہ نکلتا ہے اور نکل بھی سکتا ہے کہ سیرت کے عجائبات بھی کبھی منتہی ہونے والے نہیں، فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ قرآن میں لامحدود عجائباتِ علمی ہیں اور ذاتِ بابرکاتِ نبوی کی سیرت میں بھی یہی عجائبات عملی صورت میں ہیں، گویا ایک علمی قرآن ہے جو اَوراق میں محفوظ ہے، اور ایک عملی قرآن یعنی سیرت ہے جو ذاتِ نبوی میں محفوظ ہے، اور دونوں آپس میں ایک دُوسرے پر من وعن منطبق ہیں۔ پس قرآن کا کہا ہوا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا ہوا ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا ہوا قرآن کا کہا ہوا ہے۔ اس لئے قرآنِ حکیم کی یہ ہزاروں آیتیں درحقیقت سیرتِ مقدسہ کے علمی اور تعارفی ابواب ہیں اور ادھر سیرت کے یہ ہزاروں گوشے قرآن کے عملی پہلو ہیں، پس قرآن میں جو چیز ’’قال‘‘ ہے وہی ذاتِ نبوی میں ’’حال‘‘ ہے، اور جو قرآن میں نقوش دوراں وہی ذاتِ اقدس میں سیرت و اعمال ہیں، اس لئے سیرت سے تو قرآن کی عملی صورتیں مشخص ہوتی ہیں اور قرآن سے سیرت کی علمی ہیئتیں کھلتی ہیں۔

اس قرآنِ حکیم کے مختلف مضامین اپنی اپنی نوعیت اور مناسبت کے مطابق سیرت کے مختلف الانواع پہلو ثابت ہوتے ہیں، قرآن کی ذات و صفات کی آیتیں آپؐ کے عقائد ہیں اور اَحکام کی آیتیں آپؐ کے اعمال، تکوین کی آیتیں آپؐ کا اِستدلال ہیں اور تشریع کی آیتیں آپؐ کا حال، قصص واَمثال کی آیتیں آپؐ کی عبدیت ہیں اور کبریا حق کی آیتیں آپؐ کی نیابت، اخلاق کی آیتیں آپؐ کا حسنِ معیشت ہیں اور معاملات کی آیتیں آپؐ کا حسنِ معاشرت، توجہ الی اللہ کی آیتیں آپؐ کی خلوت ہیں اور تربیت خلق اللہ کی آیتیں آپؐ کی جلوت، قہر اور غلبہ کی آیتیں آپؐ کا جلال ہیں اور مہر و رحمت کی آیتیں آپؐ کا جمال، تجلیاتِ حق کی آیتیں آپؐ کا مشاہدہ ہیں اور ابتغاء

وجہ اللہ کی آیتیں آپؐ کا مراقبہ، ترکِ دُنیا کی آیتیں آپؐ کا مشاہدہ ہیں اور احوالِ محشر کی آیتیں آپؐ کا محاسبہ، نفیٔ غیر کی آیتیں آپؐ کی فنائیت ہیں اور اِثباتِ حق کی آیتیں آپؐ کی بقائیت، نعیمِ جنت کی آیتیں آپؐ کا شوق ہیں اور جحیمِ نار کی آیتیں آپؐ کا ہم وغم، رحمت کی آیتیں آپؐ کی رجاء ہیں اور عذاب کی آیتیں آپؐ کا خوف، اِنعام کی آیتیں آپؐ کا سکون و اُنس ہیں اور اِنتقام کی آیتیں آپؐ کا حزن، حدود و جہاد کی آیتیں آپؐ کا عروج ہیں اور تبلیغ وتعلیم کی آیتیں آپؐ کا نزول، تنفیذِ اَوامر کی آیتیں آپؐ کی خلافت ہیں اور خطاب کی آیتیں آپؐ کی عبادت وغیرہ وغیرہ، کسی بھی نوع کی آیت ہو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی نہ کسی پیغمبرانہ سیرت اور کسی نہ کسی مقامِ نبوّت کی تعبیر ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اس کی تفسیر، جس سے صدیقہ رضی اللہ عنہا کے اس زرّیں مقولہ: ''وکان خلقه القران'' سے قرآن اور ذاتِ اقدس نبوی کی کامل تطبیق اور صدیقہ پاک کی علمی گہرائیوں اور ذاتی ذکاوتوں کا نشان ملتا ہے، اس لئے یہ دعویٰ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ثابت ہوتا ہے کہ اگر قرآن کے علمی عجائبات بھی کبھی ختم نہیں ہوسکتے تو سیرتِ نبوی کے عملی عجائبات بھی کبھی ختم ہونے والے نہیں، اگر قرآن علمی طور پر تاقیامت اپنے شاخ در شاخ علوم سے بنی نوعِ انسان کی تکمیل کا ضامن ہے تو یہ سیرتِ جامعہ بھی تایومِ محشر اپنے شاخ در شاخ عملی اُسووں سے اقوامِ عالم کی تکمیل وتسکین کی کفیل رہے گی۔

اس توجیہ واستدلال کے سلسلے میں ذرا اور آگے بڑھو تو قرآن کی شرعی تفسیر حدیثِ پاک ہے، قرآن اگر متن ہے تو حدیث اس کا بیان اور شرح ہے، جس سے قرآن کے مخفی گوشے مرادی طور کھلتے ہیں اور مطالبِ خداوندی نمایاں ہوجاتے ہیں، اس لئے قرآن اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے تو حدیث اس سیرت کی تفصیل ہے، اور اس لئے کتبِ حدیث کے ہزاروں ابواب وفصول درحقیقت سیرتِ مقدسہ ہی کے ابواب وفصول ہیں جن سے گزر کر ہی آدمی اقلیمِ سیرت میں داخل ہوسکتا ہے۔

اندریں صورت کہ قرآن و حدیث سیرتِ مقدسہ کی تعبیر ہے، اس نکتے پر غور کرنا چاہئے کہ قرآن و حدیث کے مضامین کی ترتیب میں اوّلیت ایمان و عقائد کو پھر عبادات کو دی گئی ہے، فاتحہ قرآن کو بھی اوّلاً ذاتِ حق ، پھر اس کی رُبوبیتِ عامہ، پھر رحمتِ عامہ اور پھر مالکیتِ عامہ اور پھر عبادت استعانت سے شروع کیا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ کو لو تو اس کی ابتداء بھی ایمان بالغیب اور نماز و اِنفاق فی سبیل اللہ سے کی گئی ہے، بہرحال قرآن میں اوّلیت عقائد اور عبادات کو دی گئی ہے۔

اس کے بعد دُوسرے ابواب میں دِین کی تفصیل ہے، اس طرح عموماً کتبِ حدیث میں اسی اُسوۂ قرآنی کے مطابق ابواب وفصول کی ابتداء کتاب الایمان، پھر کتاب الصلوٰۃ، کتاب الصوم، کتاب الحج وغیرہ سے کی گئی ہے، اس کے بعد اخلاق، معاملات، نکاح، طلاق، میراث، ہبہ، اوقاف، پھر وسائل معاشی، زراعت، تجارت، صنعت و حرفت، ملازمت اور پھر ان معاملات نفاذ کے لئے قضاء، تعزیرات و کفارات وغیرہ اور پھر ان تمام ابواب کی حفاظت کے لئے آخر میں خلافت و امارت اور جہاد و سیاست کے ابواب لائے گئے ہیں، یہ سب کے سب مرتب شعبے بلاشبہ سیرتِ مقدسہ ہی کے ابواب ہیں لیکن اس ترتیبِ نبوی اور اس کی متابعت میں ان ترتیبات نائبانِ نبوی سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ سیرت کی اَساس و بنیاد درحقیقت عقائد وعبادات ہی قرار دی گئی ہے، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسلام کی اَساس و بنیاد عقائد وعبادات ہی کو قرار دیا جو دُوسرے لفظوں میں سیرت کی بنیاد ہے، فرمایا:-

بنی الاسلام علٰی خمس، شهادة أن لا اله الا الله وأن محمد رسول الله واقام الصلٰوة وايتاء الزكٰوة وصوم رمضان وحج البيت ان استطاع اليه سبيلا. (مشکوٰۃ)

ترجمہ:- اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے، لا الٰہ الا اللہ محمد رسول

اللہ کی شہادت دینا، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، رمضان کے روزے اور بیت اللہ کا حج اگر استطاعت ہو۔

جس سے نمایاں ہوتا ہے کہ سیرتِ نبوی میں عبادت اور دیانت اصل سیرت ہیں، اور انتظامی اور سیاسی ابواب اس کے محافظ ہیں جو بعدیت کا درجہ رکھتے ہیں کہ یہ بر وتقویٰ اور دیارِ خداوندی کا کارخانہ خلل اور زلل سے محفوظ رہے اور دُنیا میں کسی فتنہ پرور کو اس نظامِ سیرتِ نبوی میں رخنے کی جرأت نہ ہو۔

قرآنِ کریم نے اس سے زیادہ کھلے لفظوں میں اقامتِ عبادت و دیانت کو اصل مقصود ٹھہراتے ہوئے تمکین و سیاست اور فتوحِ ممالک کو اس کا وسیلہ قرار دیا ہے، فرمایا:-

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ. (الحج:۴۱)

ترجمہ:- اگر ہم ان مسلمانوں کو زمین کی سلطنت دے دیں تو یہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور پاکیزہ اُمور کا اَمر کریں گے اور منکرات سے باز رکھیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ دِین و دیانت تو تمام انبیاء علیہم السلام کو دیا گیا ہے لیکن قہر و سیاست اور جہاد و جنگ سب کو نہیں دی گئی جہاں ضرورت سمجھی گئی ورنہ نہیں دی گئی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اعلانِ نبوّت کے ساتھ سب سے پہلے جو چیز دُنیا کے سامنے پیش کی اور جس پر اپنے صحابہؓ کو تربیت دی وہ یہی ایمان باللہ، مبداء و معاد، توحید و رسالت اور سزا و جزا کے عقیدے تھے، اور پھر خدا سے رشتہ جوڑنے کے لئے عبادت و ریاضت اور زُہد و تقویٰ کی تعلیم فرمائی گئی جس سے مکی آیتیں بھری ہوئی ہیں۔

اس سے واضح طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سیرتِ مقدسہ کا اَساسی اور غالب رنگ عبادت اور تقدس ہے، اور یہ دُنیا کے سارے معاملات کو اس عبادتی رنگ میں دیکھنا چاہتی ہے، یعنی اس کا طبعی رُخ یہ ہے کہ اللہ کے بندے اپنی ساری دُنیا اور دُنیا

کے ایک ایک کام کو مقدس بن کر برنگِ عبادت انجام دیں جن میں رضائے الٰہی و یادِ خداوندی کی رُوح کارفرما ہو، وہ کچھ بھی کریں اللہ کے لئے کریں، نفسیاتی انداز اختیار کرنے کے بجائے ربانی راہ اختیار کریں، اور ان کا ہر عمل مجاہدہ و جہاد یعنی عبادت ہو عادت نہ ہو، جس کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہو، اعلائے نفس نہ ہو، حق تعالیٰ نے یہی حقیقت جس کا نام تفویض ہے اپنے خلیلِ پاک حضرت ابراہیم علیہ السلام سے طلب فرمائی جسے ''اسلام'' کا نام دیا، فرمایا:-

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ. لَا شَرِیْکَ لَہٗ، وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ. (الانعام:۱۶۲،۱۶۳)

ترجمہ:- کہہ دو ابراہیم کہ میری نماز اور عبادت اور میرا جینا اور مرنا سب اللہ رَبّ العالمین کے لئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اس کا اَمر کیا گیا اور میں ہی (اس اُمت میں) پہلا مسلم ہوں۔

یہی تفویضِ مطلق اور عبدیتِ کاملہ کی بلند پایہ کیفیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت تھی جسے آپ نے اپنی دُعا میں کھولا ہے، فرمایا:-

اَللّٰھُمَّ لَکَ اَسْلَمْتُ وَبِکَ اٰمَنْتُ وَعَلَیْکَ تَوَکَّلْتُ وَبِکَ حَاکَمْتُ وَاِلَیْکَ خَاصَمْتُ وَاِلَیْکَ اَنَبْتُ وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ.

ترجمہ:- اے اللہ! میں تیرے ہی لئے اسلام لایا اور تیرے ہی اُوپر ایمان لایا اور تجھ ہی پر میں نے توکل کیا اور تجھے ہی میں نے حَکَم مانا اور تیری ہی طرف میں جھگڑا لے گیا اور تیری طرف میں نے رُجوع کیا اور تیری ہی طرف جانا ہے۔

یہی حال جب اہل اللہ پر طاری ہوتا تھا تو تفویض کے عجیب و غریب

عنوانات ان کی زبانوں پر جاری ہوتے تھے، حضرت بابا فرید گنج شکر قدس سرہٗ پر یہ کیفیت غلبے کے ساتھ وارد ہوئی تو وہ بار بار ذیل کی رُباعی پڑھتے تھے اور سجدے میں گر جاتے تھے اور پھر وہی رُباعی پڑھ کر سجدے میں جا پڑتے جس کے راوی حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین دہلوی قدس سرہٗ ہیں ؎

خواہم کہ ہمیشہ در ہوائے تو زیم
خاکے شوم و بہ زیر پائے تو زیم
مقصود من بندہ زکونین توئی
از بہر تو میرم واز برائے تو زیم

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی اور سیرت کے بے شمار عملی نمونے اور اُسوے ہمہ وقت جس رُوح سے زندہ و پائندہ تھے وہ یہی ذکرِ الٰہی، تفویضِ مطلق اور عبادتِ خداوندی کی رُوح تھی، گویا اسی کے لئے اس پاک زندگی کا لمبا چوڑا ڈھانچہ بنایا گیا تھا کہ اس میں یہ ذکر وفکر کی رُوح پھونکی جائے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک زندگی کا ہر لحہ ذکر اللہ سے معمور اور فکرِ آخرت سے بھرپور تھا۔

ذکرِ عام کے بارے میں حدیث ہے کہ:-

کان یذکر اللہ علیٰ کل أحیانہ.

ترجمہ:- آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر لحہ ذکرِ الٰہی میں لگے رہتے۔

کان دائم الفکرۃ حزیناً.

ترجمہ:- آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ متفکر اور غمزدہ سے رہتے تھے۔

پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی سیرت بالاصل نہ ملوکیت تھی نہ ریاست، نہ غلبہ وقہر تھی نہ تسلط واستیلاء، نہ تعیش تھی نہ تزئین، نہ آرائش وزیبائش تھی نہ راحت طلبی وآسائش، بلکہ بندگی، سرافندگی، نیاز کیشی، عبودیت اور طاعت وعبادت تھی، جس میں خوئے ذکر اور بوئے فکر سمائی ہوئی تھی اور جو کچھ بھی زندگی کی نقل وحرکت تھی وہ

اسی فکرِ دائمی اور ذکرِ دوامی کے رنگ میں تھی، قرآن نے اسی ذکر وفکر کے مجموعے کو دانائی کہا ہے اور اُولوالالباب یعنی عقل مندوں کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:-

اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ. (آل عمران:۱۹۱)

ترجمہ:- دانش مند وہ ہیں جو اللہ کو یاد رکھتے ہیں کھڑے بیٹھتے اور اپنے پہلوؤں پر لیٹے ہوئے اور فکر کرتے رہتے ہیں آسمانوں اور زمین کی ساخت اور بناوٹ میں۔

پس قرآن کی رُو سے محض مفکر بھی دانش مند نہیں جبکہ وہ ذاکر نہ ہوں، اور محض ذاکر بھی پورا دانش مند نہیں جبکہ وہ مفکر اور متفکر نہ ہو۔ حقیقی دانش مندی وہی ہے جس میں ذکر بھی ہو اور فکر بھی، عقل بھی ہو اور عشق بھی، محبت بھی ہو ہوش بھی، پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اسی ذکر وفکر کا مجموعہ اور ان دونوں مقاموں کا کامل امتزاج تھی، جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت ان دونوں رُوحوں کا مظہر تھی وہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاست بھی ان دونوں رُوحوں سے عبادت کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم خلیفۂ خداوندی بھی ہیں، معاملات کے فیصلے بھی دے رہے ہیں، دیوانی اور فوجداری کے مقدمات بھی فیصل فرما رہے ہیں۔

جہاد کے لئے لشکر بھی بھیج رہے ہیں، غنائم کی تقسیم بھی کر رہے ہیں، حدود و قصاص کا اجراء بھی ہو رہا ہے، فتوحاتِ ممالک کا سلسلہ بھی جاری ہے، صوبوں اور نئی حکومتوں میں گورنر بھی مقرّر کئے جارہے ہیں، یہ سب کچھ ہو رہا ہے مگر صحنِ مسجد میں ذکر اللہ، فکرِ آخرت کے ساتھ کیا جارہا ہے، یعنی یہ سب کچھ تھا مگر عبادتِ الٰہی کے ہی رنگ میں تھا، ڈھانچہ اگرچہ سیاست کا تھا مگر رُوح عبادت کی اس میں کارفرما تھی، اور رُوح اور ڈھانچے میں کاملی مناسبت کے ساتھ ڈھانچہ اس رُوح کے حسبِ حال تھا اور رُوح ڈھانچے کی مثال۔

پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ سیرت کا امتیازی اور غالب پہلو یہی ایمان و عبادت اور ذکر و فکر تھا جس میں عقل و عشق، محبت و بصیرت، مادّیت و ملکیت، امارت و مسکنت، خلافت و عبادت کا کامل اجتماع و امتزاج تھا کہ ایک سے دُوسری متقابل صفت کسی حالت میں بھی بے فکر نہیں بنا سکتی تھی، حتیٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غزوات اور جنگوں میں بہ نفسِ نفیس خود بھی شرکت فرماتے اور نہ صرف شرکت بلکہ ان کی قیادت فرماتے لیکن یادِ الٰہی اور رنگِ عبودیت سے یہ ہنگامہ خیزی بھی بھرپور رہ کر عبادت ہی کے رنگ میں ادا ہوتی تھی، عین جہاد میں بھی ذکر اللہ اور متعلقہ دُعائیں پڑھتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لشکروں کی قیادت فرماتے جس سے یہ جہاد اعلیٰ ترین عبادت بن جاتا اور عین لڑائی میں جبکہ نماز کا وقت آتا تو یہ اضافی عبادت اس حقیقی عبادت میں حارج نہیں بن سکتی تھی بلکہ اس کی مدّت متعین تھی ۔

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز
قبلہ رُو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز

جس سے نمایاں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ سیرت کا بنیادی پہلو ایمان و عبادت تھی، جس کے لئے دیگر شعبہ ہائے زندگی بطور خادم اور بطور وسائل کے کام کرتے تھے، پس زندگی کے عام شعبوں کی عبادتیں وقتی تھیں اور یہ اصل عبادت ہمہ وقتی۔

اب اس سیرتِ جامعہ کا خلاصہ یہ نکل آیا کہ سیرتِ مقدسہ اُصولاً زندگی کے تین شعبوں پر مبنی ہے، تعلق مع اللہ، تعلق مع الخلق اور تعلق مع النفس۔ تعلق مع النفس کے سلسلے میں پاک دامنی، پاک نفسی، عفت و عصمت، حیاء و انکسار، غیرت و حمیت، ہمت و شجاعت، صبر و قناعت، حلم و ضبط، اعتماد و توکل، زُہد و قناعت، مجاہدہ و ریاضت، تحمّلِ شدائد و مصائب اور خداترسی وغیرہ کے اعلیٰ ترین ملکات اور اخلاقِ حمیدہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرتِ صالحہ کا خمیر تھے۔

ادھر تعلق مع الخلق کے سلسلے میں خدمت خلق اللہ، صلہ رحمی، نصرت و اعانت، جود وسخا، ایثار و عطاء، راحت رسانی اور کفِ اَذیٰ (ایذا رسانی سے بچنا)، عفو و درگزر، محبت و شفقت، دِلسوزی و ہمدردی، تعلیم و تربیت، ارشاد و تزکیہ وغیرہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک طبیعت کے فطری جوہر تھے۔ اور تعلق مع اللہ کے سلسلے میں عبادت و ریاضت، مجاہدہ و مراقبہ، کسرِ شہوات و لذّات، تقرّب و انابت، توبہ و اِستغفار، تہجد و شب بیداری، ذکر و فکر وغیرہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک فطرت کی افتاد تھی۔

لیکن ان تینوں تعلقات میں تعلق مع اللہ ہی دونوں تعلقات کی استواری کی رُوح تھی، جو نفس و خلق کے تعلقات کو صحیح نہج پر قائم کرتی ہے، اگر نفسِ انسانی کو تعلق مع اللہ سے آشنا اور اس کے تقاضوں کا خوگر نہ بنایا جائے تو تعلق مع الخلق اور تعلق مع النفس صحیح بنیادوں پر کبھی قائم نہیں رہ سکتا۔ آج بھی جو اللہ سے منقطع ہو کر ان تعلقات کو خوشنما بنانے کی فکر میں ہیں وہ طرح طرح کی مہلک لغزشوں سے دُنیا کو فتنہ و فساد کا گھرانہ بنائے ہوئے ہیں۔

آج یورپ میں عقل و فہم کی کمی نہیں، روابط اور بین الاقوامی علائق کی کمی، سیاستی تعلقات کی ہمہ گیری اور ان کی تدابیر کی کمی نہیں، جتنی کہ صرف ان ہی بین الاقوامی تعلقات کے لئے متحدہ کونسل یو.این.او بھی قائم ہے، جس میں رات دن کے ممالک آتے رہتے ہیں، خانگی زندگی کے لئے تربیتوں کے بے انتہا ڈھنگ اور گھریلو زندگی کی خوشگواریوں کے لئے بے شمار لٹریچر وغیرہ سب ہی کچھ مہیا ہیں، لیکن اس کے باوجود ان ہی کے اقراروں اور اعلانوں سے یہ ہی واضح ہوا ہے کہ گھر اور باہر سے چین اور سکھ مفقود ہے، یہی نفوس کہ جن کی طمانیت کی خاطر یہ سب کچھ کیا جارہا ہے، امن و اطمینان کی ہوا تک سے بھی کوسوں دُور ہوتے جارہے ہیں، اس کی وجہ فقدانِ اسباب نہیں کہ وہ تو سب مہیا ہیں، بلکہ مسبّب الاسباب سے ربط کا فقدان ہے، خداپرستی، خوفِ آخرت اور مالک الملک کے سامنے جواب دہی کی فکر معدوم ہے، اعتقاداً ہو یا

عملاً، جو ان تعلقات کو صحیح نہج پر نہیں آنے دیتا، جس سے ان نفوس میں جذبہ انقیاد و اِتباعِ حق کی بجائے خود رائی اور خود بینی کے جراثیم پرورش پائے ہوئے ہیں، مدارِ کار غرورِ نفس ہے یقینِ حق نہیں، جس کے تحت خودغرضیوں اور قومی، نسلی اور وطنی تعصّبات کی آگ سلگ رہی ہے اور اس سے تمدنی، سیاسی اور اقتصادی اُونچ نیچ کی مہلک وبا، سکون و امن کی جان لیوا بنی ہوئی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دُنیا ان کے تمدنی وسائل اور ایجادات سے فائدہ بھی اُٹھا رہی ہے لیکن دِلوں میں ان سے تنفر کے جذبات بھی لئے ہوئے اور ان کی جبری قیادت کا جوا سروں سے اُتار پھینکنا بھی چاہتی ہے، یہ محبوبیت کا فقدان اسی خداپرستی کے نہ ہونے سے رُونما ہوا، جس سے واضح ہے کہ کوئی بھی انسانی تعلق خواہ وہ اپنے نفس سے ہو یا مخلوق سے بغیر خدائی تعلق کی ہمواری کے ہموار رہنا ممکن نہیں، اسی لئے حضرت صاحبِ سیرت علیہ السلام نے اپنی سیرتِ مبارکہ کی روشنی میں بطور ضابطۂ حیات ارشاد فرمایا کہ:-

من أصلح فيما بينه وبين الله أصلح الله فيما بينه وبين الخلق. (کنز العمال)

ترجمہ:- جس نے اپنے اور اپنے خدا کے درمیان معاملہ دُرست کرلیا، اس کے درمیان اور خلق کے درمیان خود اللہ معاملہ دُرست فرما دیتا ہے۔

اس لئے اگر آج ہم اس سیرتِ پاک کو اپنا کر اپنی زندگی کو صحیح بنیادوں پر اُٹھانا چاہتے ہیں تو اس میں سیرتِ مقدسہ کی روشنی میں ان تینوں کے تعلقات کو عملی صورت دیتے ہوئے ان کی رُوح اور بنیاد تعلق مع اللہ ہی کو بنانا ہے جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مقدسہ کا اَساسی پہلو یہی تعلق ہے۔

اب اگر ہم سیرت، عبادت و اخلاق اور تعلق مع اللہ سے کنارہ کش ہوکر مثلاً قہر و سیاست اور اقتدار و غلبے کی سیرت کو مطمحِ نظر بنالیں جس میں یہ اخلاقی رُوح نہ ہو تو

یہ کوری سیاست ملکِ عضوض ''کٹکھنا بادشاہ'' ہوکر رہ جائے گی، جس میں کسی وقت بھی ظلم وستم، زبردستی اور زبردست آزاری سے بچنے کی کوئی صورت نہیں رہ جائے گی اور اگر محض قومی خدمت اور رفاہِ عامہ کو مقصدِ زندگی ٹھہرالیں جس میں خداترسی اور اخلاقی قدریں نہ ہوں تو وہ کوری، خودغرضی، نمود ونمائش اور شہرت پسندی ہوکر رہ جائے گی، جس میں کسی وقت بھی قلبی یکسوئی اور مخلوق کی مدح وذم سے بالاتر ہوکر غناء واستغناء کی دولت نصیب نہ ہوسکے گی، پھر اسی کے ساتھ اگر ہم تمام طبعی اور اجتماعی تعلقات سے الگ ہوکر محض عبادت وخلوَت گزینی اختیار کریں گے تو نہ صرف ہم تعاونِ باہمی کی ان تمام قوتوں سے محروم ہوجائیں گے جو مدنیت کی رُوح اور اجتماعیت کی اَساس ہیں، اور جن کے بغیر وہ عالمگیر خدمت انجام نہیں پاسکتی جو سیرتِ پاک اور طبیعتِ اسلام کے تقاضے ہیں، بلکہ اس قیدِ تنہائی میں گلّے سے الگ ہوکر کسی وقت بھی نفس و شیطان کی مکاری سے پناہ نہیں پاسکیں گے، جنھوں نے خلوَت گزیں راہبوں کو کتنی ہی بدکاریوں کا شکار بنایا ہے۔

پس خدمتِ خلق بلا عبادت انانیت ہے، خدمتِ نفس بلا خداترسی نفسانیت ہے، انقطاعی عبادت بلا خدمتِ خلق رَہبانیت ہے، اور سیاست بلا عبادت ہی ملوکیت و استبدادیت ہے، اور ظاہر ہے کہ رَہبانیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے نہ ملوکیت، نہ نفسانیت آپ کی سیرت ہے نہ انانیت، کیونکہ یہ اکہری چیزیں الگ رہ کر جیسے مجموعی سیرت نہیں بن سکتیں ایسے ہی اپنی رُوح سے الگ ہوکر اس رُوح کے خلاف خود رونقشوں اور رُسوم کے ساتھ اجزائے سیرت بھی نہیں کہلائی جاسکتیں کہ انہیں جزوی سیرت ہی کہا جاسکے۔

البتہ جب اس خدمتِ خلق اور خدمتِ نفس کے خانوں میں اخلاق وعبادت کا رنگ بھر دیا جائے اور سب اجزاء اپنے مطلوبہ نقشوں کے ساتھ عبادت کے محوَر پر جمع ہوجائیں تو پھر اس جامع سیرت کا عکس پیدا ہوجائے گا جس کا نام لے کر ہم اس کا

کام کرنا چاہتے ہیں، اب اسے نہ نفسانیت کہیں گے نہ رَہبانیت، نہ ملوکیت کہیں گے نہ انانیت، بلکہ ربانیت کہیں گے جس میں انسان اپنی ہر نقل وحرکت کا مرجع، محوَر اپنے رَبّ کو بنالے گا۔ پس ان تمام اجزاء کی پاک اور مطلوب صورتوں کا صحیح اور معقول امتزاج ہی سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی جامع ترین صورت ہے، جس میں فرد کی رعایت الگ ہے اور قوم کی الگ، حکومت کی رعایت الگ ہے اور محکوم کی الگ، اس میں دیانت بھی ہے، خدمت بھی ہے اور عنایت بھی، اور ان سب عناصر کے امتزاج سے سیرتِ صالحہ کا یہ حاصل نکلتا ہے کہ انسان میں طبعی جذبات باقی رہیں مگر ان پر عقل کی حکومت ہو، عقلی نظریات بھی ہوں مگر ان پر وحیٔ الٰہی کی نگرانی ہو، آزادیٔ ضمیر بھی ہو مگر اس میں حق کے ساتھ تقلید ہو، غرض نفس، طبع، عقل، وجدان، ضمیر اور جذبات میں سے کوئی چیز پامال نہ ہوسکے، سب کے تقاضے کارفرما رہیں مگر ہر ایک کی نقل وحرکت کا محوَر طاعتِ الٰہی اور ذکرِ خداوندی ہو، اور کسی وقت بھی یہ تقاضے پابندیٔ حق سے آزاد نہ ہوں، پس اسی جامعیت اور اعتدالِ کامل کا نام سیرتِ مقدسہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

آج اگر ہم اپنے نونہالوں کے لئے سچے دِل سے یہ چاہتے ہیں کہ ایک طرف تو وہ نہایت اُونچے پیمانے کے دِین دار اور خداپرست ہوں جن میں رواداری ہو اور بے قیدی بداعتقادی اور اُصولِ آزادی نہ ہو، ان کی نگاہ خدا پر ہو اور اسی پر بھروسہ اور اعتماد رکھتے ہوں، اور دُوسری طرف وہ ملک کے سچے شہری اور متمدن ہوں جن کے حالات و معاملات میں دیانت، صداقت و راست گوئی اور راست بازی ہو، شخصی مفاد کے غلبے کے بجائے قومی اور جماعتی مفاد ان پر غالب ہو، ایک طرف وہ مساجد و مدارس کی زینت ہوں اور دُوسری طرف درباروں اور بازاروں کا نظم بھی ان کے ہاتھوں میں فروغ پا رہا ہو، ایک طرف ان کی خلوَت گاہیں یادِ الٰہی سے بھرپور ہوں اور دُوسری طرف ان کی جلوتیں اور حکومت کے دفاتر ان کی عدل گستری سے معمور ہوں،

ایک طرف وہ اپنے ملک میں خوش حال اور خوش آل ہوں اور دُوسری طرف ملک ان کی طرف رُجوع ہوکر نہ صرف ان سے عزّت مندانہ تعلقات و معاملات ہی کو اپنی آبرو سمجھیں، بلکہ ان کے مثالی معاملات سے بھی درس لیں تو یہ جامع زندگی بجز اس سیرتِ جامعہ کی عملی پیروی کے اور کہیں بھی انہیں دستیاب نہیں ہوسکتی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پیشتر انسانوں کی یہ دُنیا دِین کے نام سے رَہبانیت اور انقطاع کا شکار تھی، ترکِ لذّات اور ترکِ مرغوبات ہی اصل دِین بن گیا تھا، تعذیبِ جسمانی کا ہی نام تہذیبِ رُوحانی رکھ لیا گیا تھا، اور اس قسم کے لوگ ساری دُنیا سے الگ تھلگ ہوکر پہاڑوں کی کھوہ اور دروں میں چھپے ہوئے پڑے تھے، نہ وہ دُنیا کے لئے کارآمد تھے، نہ دُنیا ان کے کام کی تھی، جن کو حدیثِ نبوی میں: ”فتلک بقایاهم فی الصوامع و الدیار“ سے متعارف کرایا گیا ہے، اور دُوسری طرف ان پہلوؤں کے بالکل برخلاف متضاد کنارہ پر نظمِ ملک اور تمدن کے نام سے نفس پروری، رَہبانیت اور نفس پرستی کا ثبوت دیا جارہا تھا جس کا محوَر اس دور میں زبردست طاقتیں تھیں۔

ایک طرف فارس میں کسریٰ کی حکمرانی تھی جو مشرقی ممالک پر اثرانداز تھی اور دُوسری طرف رُوم میں قیصر کی جہانبانی تھی جو مغربی ریاستوں پر چھائی ہوئی تھی، اور اس طرح دُنیا کی تمام چھوٹی بڑی حکومتیں انہیں دو گروپوں میں بٹی ہوئی تھیں اور دونوں حکومتوں کی سیاست ملوکیت اور استبدادِ خالص کی گود میں پروَرِش پاکر انسانوں کی گردنوں پر مسلط تھی، یہ حاکم و محکوم کے دو طبقوں میں بٹ کر اپنی سالمیّت کھوچکے تھے، آقائی اور غلامی کے دو طبقے بنے ہوئے تھے، اس لئے راعی اور رعایا میں محض جبری علاقہ رہ گیا تھا، رعایا اپنے حکمرانوں سے تنگ اور ان پر لعنت بھیجتی تھی، اور راعی یا حکمران طبقہ رعایا کو بہائم کا درجہ دیئے ہوئے تھے جن کی محنت سے دولت سمیٹتے رہنا ہی اس کا سب سے بڑا کام رہ گیا تھا۔ بظاہر رابطہ اور بحقیقت نفرتِ باہمی کے جراثیم راعی

و رعایا میں پرورش پا رہے تھے، ملک بظاہر کرّ وفر سے آراستہ تھے مگر اندرونی طور پر باہمی بے اعتمادی کی بھٹی بنے ہوئے تھے، دولت غیرمتوازن ہوکر اُمراء کے چند خاندانوں میں سمٹ آئی تھی، ایک ایک امیر اور نواب کے بدن پر جب تک ایک ایک لاکھ روپے کی مالیت کا لباس، سونے کے تاج سروں پر اور جوہرات سے مرصع پٹکے زیبِ کمر نہ ہوتے تو وہ سوسائٹی میں آنے کے قابل نہیں سمجھا جاتا تھا، اور عوام کی آبرو صرف بھوکے ننگے رہ کر خواص کی فرمانبرداری کو مانتے رہنا قرار پاچکی تھی، غرض پورا ملک سیاسی، اقتصادی اور طبقاتی اُونچ نیچ اور باہمی بے اعتمادی کا جہنم بنا ہوا تھا۔

دُنیا والے دُنیا کے نام پر ان ہی دو متضاد کناروں پر تھے کہ قدرت نے ان کے دِلوں کی فریاد سنی اور اس افراط وتفریط کے عذابِ الیم سے چھڑانے کے لئے عدل ومساوات کا آفتابِ جہاں تاب چمکایا، یعنی فاران کی چوٹیوں پر حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اپنی کامل الاعتدال عدل ومساوات پر اور اُخوّتِ باہمی اور اعتمادِ مابینی کی پاکیزہ ترین تعلیم اور سیرت لے کر دُنیا میں نمودار ہوئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طرف رَہبانیت کو للکارا اور ایک طرف اس ملوکیت کی بجائے خلافت کا آوازہ لگایا، دِین اور دُنیا کی تفریق مٹاکر دونوں کا سنگم بنایا، پہاڑوں اور غاروں کی انقطاعی عبادت کے بجائے مساجد اور کھلی زمین کی جلوہ گاہوں میں اجتماعی عبادت کا راستہ دِکھایا، حاکم ومحکوم کا فرق مٹاکر قومی خدمت کا ڈول ڈالا، اور "سیّد القوم خادمھم" کا پاکیزہ اُصول پیش کیا۔

راعی اور رعایا میں اُخوّت کا اُصول وتعلق قائم فرمایا، معاشرت اور مدنیت کو مساوات کے اُصول پر قائم کیا، جو بندے خدائی مسند لینا چاہتے تھے انہیں آسمانوں سے زمین پر اُتارا، جن کو بندگی سنبھالنا بھی بھاری ہو رہا تھا انہیں سہارا دے کر زمین سے اُوپر اُٹھایا، جس سے اُونچ نیچ مٹ کر توازن قائم ہوا اور یہ دونوں متضاد طبقے ایک دُوسرے کے قریب ہوئے، جس سے رَہبانیت بھی دَم توڑ گئی اور ملوکیت پر بھی زندگی

کی راہیں تنگ ہوکر رہ گئیں۔

اِنسان کا کمال اور اوصافِ حق سے آراستہ ہوکر خلیفۂ خداوندی بن جانا سب نے محسوس کرلیا اور اس کا سب سے بڑا عیب خدا سے کٹ کر اپنے نفس کی پوجا کرنا شمار کیا گیا، غرض سیرتِ مقدسہ کے عدل و مساوات اور اجتماعیت نے بڑھ کر رَہبانیت وملوکیت پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ قیصریت وکسریت کے بت اوندھے ہوگئے اور دیانت و سیاست کی آمیزش سے ایک طرف خلافتِ خداوندی انسانوں میں نمایاں ہوئی اور دُوسری طرف دیانتِ اجتماعی کے جوہر پیدا ہوئے اور دونوں میں توحید و عدل کا رنگ صاف نمایاں ہوگیا۔

توحید نے لاکھوں انسانوں کی کثرتوں کو ایک کرکے ان میں جماعتی عبادت کا جذبہ پیدا کیا اور عدل و مساوات نے اُونچ نیچ میں پڑے ہوئے بے اعتماد انسانوں میں اعتمادِ باہمی اور مابینی خدمت وتعاون کے جذبات پیدا کردیئے، جس سے ان میں یکسوئی آگئی، اور اسی طرح پہاڑوں میں پڑے ہوئے رہبان تو منظرِ عام کی عبادت گاہوں میں کندھے سے کندھا ملاکر کھڑے ہوگئے اور عرشِ حکومت پر بیٹھے ہوئے ملوک فرشِ خاک پر اُتر کر عوام کے ساتھ آئے اور ادھر جو لوگ استبداد پسندوں کی غلامی میں پڑے ہوئے دَم توڑ رہے تھے ان میں حوصلے پیدا ہوئے اور وہ آزادیٔ حریت کی چمک دمک دیکھ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور خود اپنے ہاتھوں سے غلامی کی زنجیریں توڑ کر میدانِ مساوات میں آگئے، اور جو لوگ تمدن کی ظاہری چمک دمک پر فریفتہ رہ کر خالق کے سامنے سرِ عبودیت جھکانے کا وقت ہی نہیں پاتے تھے وہ اپنی دُنیا کے جھرمٹ میں رہ کر بھی دِین سے محروم نہ رہے۔

غرض اس سیرتِ مقدسہ نے مرتی ہوئی دُنیا کو سنبھال لیا اور مادّیت و رُوحانیت اور دیانت و سیاست کے صحیح امتزاج سے ایک ایسی مخلوط اور معتدل راہ دِکھائی کہ ہر ایک اپنے دائرۂ کار میں رہ کر دِین اور دُنیا دونوں سے غیر منقطع ہونے کے قابل بن گیا۔

(ماہنامہ ''الرشید'' لاہور دسمبر ۱۹۸۵ء)

حجۃ الاسلام

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی

نوّر اللہ مرقدہٗ

ذیل کا مکتوب حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم دیوبند نبیرہ قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، نے قریشی احسان الحق صاحب پرنسپل گورنمنٹ کمرشل ٹریننگ انسٹیٹیوٹ سیالکوٹ کے نام لکھا ہے، قریشی صاحب نے اپنے خط میں حضرت قاری صاحبؒ سے استفسار کیا تھا کہ آیا کتاب ''آبِ حیات'' مصنفہ حضرت نانوتویؒ عام علماء کی دسترس سے باہر ہے؟ جیسا کہ مولانا محمد منظور نعمانی صاحب مدیر ''الفرقان'' لکھنؤ نے اپنے ایک مضمون میں رائے ظاہر کی ہے۔ مولانا محمد منظور نعمانی کا یہ مضمون ''تعلیم القرآن'' راولپنڈی میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ حضرت قاری صاحب کا یہ مکتوب پُر از معلومات ہے اور اسے من وعن درجِ ذیل کیا جاتا ہے۔

سلامِ مسنون نیازِ مقرون!

گرامی نامہ باعثِ شرف ہوا، میں اس وقت گجرات، بمبئی، مدراس، مالابار، بنگلور وغیرہ کے طویل سفر کے لئے تیار تھا، وقت نہ تھا کہ دیوبند سے عریضہ ارسال کرسکوں، اس لئے گرامی نامہ سفر میں ساتھ رکھ لیا کہ راستے میں جواب عرض کرسکوں گا، سفر میں بھی مصروفیت کار بڑھی رہی، آج ''میل وشارم'' میں قدرے فرصت ملی تو قلم لے کر بیٹھا اور جو کچھ ذہنِ نارسا میں آیا، اسے صفحۂ قرطاس پر اُتارا، جس کے پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ تأخیرِ جواب کی معافی چاہتا ہوں۔

''آبِ حیات'' کے سلسلے میں ''الفرقان'' کے مضمون کا اقتباس پہلی ہی دفعہ

نظر سے گزرا، واقعہ کی حد تک بات دُرست ہے، لیکن لوگوں کا اُسے مسئلہ ''حیات النبی'' کی نفی یا معنوی تحریف کے لئے آڑ بنالینا غلط ہے۔ ''الفرقان'' کے اقتباس کا حاصل یہ ہے کہ ''آبِ حیات'' مشکل اور دقیق کتاب ہے، لیکن جو کتاب مشکل ہو، اس کا مضمون ناقابلِ قبول یا قابلِ انکار بھی ہوا کرے، بالکل انوکھی منطق ہے۔

صوفیاء اور عرفائے اسلام کی دقیق المضامین کتابیں جو ان کی اصطلاحی تعبیرات میں لکھی گئی ہیں، یا معقولات کی دقیق التعبیر کتابیں جو درسوں میں پڑھائی جاتی ہیں، اس اُصول پر قابلِ انکار ہی نہیں بلکہ غلط اور مہمل ٹھہر جائیں گی۔ خود حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی دُوسری محققانہ کتابیں مثل: تقریرِ دل پذیر، انتصار الاسلام، حدیث العلماء، عصمتِ انبیاء اور قبلہ نما وغیرہ جو توحید و رسالت، معصومیت انبیاء، مبداء و معاد اور نبوات کے حقائق پر مشتمل ہیں، کہ ان کے مسائل توحید و رسالت وغیرہ کا انکار یا ان میں تأمل اس وجہ سے جائز ہوجائے گا کہ ان کتابوں کی تعبیر دقیق اور خالص علمی اور عرفانی ہے، جو عوام الناس یا عوام علماء کی دسترس سے باہر ہے؟

بہرحال مسئلہ حیات النبیؐ کے انکار یا اضمحلال کے جواز کے لئے ''آبِ حیات'' کے دقت و غموض کو پیش کیا جانا، یا اسے حیلہ بنانا بہت ہی عجیب سی بات ہے جو فہم سے بالاتر ہے۔ پھر اگر عقیدۂ حیات النبیؐ کی بنیاد ہی ''آبِ حیات'' پر ہوتی، تب بھی اس کی دقتِ تعبیر کے حیلے سے کچھ کہنے سننے کی گنجائش ہوتی، لیکن کون نہیں جانتا کہ اس مسئلے کی بنیاد ''آبِ حیات'' نہیں بلکہ کتاب و سنت کی نصوص اور اُمت کا اِجماع ہے۔

''آبِ حیات'' لکھی جاتی یا نہ لکھی جاتی، مجھ جیسا نالائق اسے درساً پڑھے بغیر سمجھ سکتا یا نہ سمجھ سکتا، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ اس پر قابو پاسکتے یا نہ پاسکتے، مسئلہ حیات النبیؐ اپنی جگہ حق اور واجب القبول تھا۔

خود حضرت نانوتوی (قدس سرہ العزیز) بھی تو آخر ''آبِ حیات'' لکھنے

سے پیشتر یہی عقیدہ رکھتے تھے، جو انہوں نے اپنے مشائخ (رحمہم اللہ) سے ورثے میں پایا تھا، کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم برزخ میں حیاتِ جسمانی و دُنیوی کے ساتھ زندہ ہیں، اُسی کے اثبات کے لئے انہوں نے ''آبِ حیات'' جیسی قیمتی کتاب لکھی، نہ یہ کہ ''آبِ حیات'' لکھنے کے دوران میں اتفاق سے یہ عقیدہ سخن گسترانہ انداز سے ذہن میں منضبط ہوگیا اور حضرتؒ نے اسے بطور ایک علمی نظریئے کے قبول کر کے عقیدہ بنالیا۔

بہرحال ''آبِ حیات'' عقیدۂ حیات النبیؐ کی بنیاد نہیں، اور نہ ہی کسی بڑے سے بڑے عالم کا کلام کسی دینی عقیدے کی بنیاد بن سکتا ہے، بلکہ ''آبِ حیات'' اس ثابت بالشریعت عقیدے کے علمی و عرفانی دلائل اور متعلقہ حقائق و معارف کا مجموعہ ہے، جس میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے برزخ میں حیاتِ جسمانی و دُنیوی کے ساتھ زندہ ہونے کے مختلف پہلو واشگاف کئے گئے ہیں اور کتاب وسنت کے اس نقلی دعویٰ کو عقلی اور حسّی انداز کے دلائل وشواہد سے نمایاں کیا گیا ہے۔

یہ کہنا کہ ''آبِ حیات'' میں حضرتِ اقدسؒ نے موتِ نبوی کا اِنکار کردیا ہے، افتراء اور فتنہ پردازی ہے، حضرتؒ نے صراحت کے ساتھ "اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ'' کے تحت موتِ نبوی کا اثبات کرتے ہوئے حیاتِ نبوی پر روشنی ڈالی ہے۔ حضرتِ اقدسؒ معاذ اللہ نہ موتِ نبوی کے منکر ہیں، جو قطعی ہے، نہ حیات بعد الموت کے منکر ہیں، جو منصوص ہے۔ بلکہ بلا کسی شائبہ تفرد کے اس بارے میں پوری اُمت کے ساتھ ہیں، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر موت بھی طاری ہوئی، اور موت کے بعد برزخ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حیات بھی عطا ہوئی، جو جسمانی و دُنیوی ہے۔

حضرتؒ کا جو کچھ بھی کلام ہے، وہ اس موت اور حیات بعد الموت کی کیفیت میں ہے، کہ اس کے طاری ہونے کی نوعیت کیا تھی؟ جو فنِ حقائق کا مسئلہ ہے، نہ کہ فنِ عقائد کا، اور اس کا حاصل یہ ہے کہ جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناسوتی حیات

عام انسانوں جیسی حیات نہ تھی، اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور تمام انبیاء علیہم السلام کی موت اور حیات بعد الموت بھی عام انسانوں کی موت اور حیات بعد الموت کی طرح نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر موت طاری ہونے سے زوالِ حیات یا انقطاعِ حیات کلیۃً نہیں ہوا، بلکہ حیات سمٹ گئی، اور آثارِ حیات حسّی طور پر منقطع ہوگئے، برزخ میں وہی سمٹی ہوئی حیات بدستورِ سابق پھر بدنِ مبارک میں پھیلا دی گئی، اس دعویٰ کا تعلق نہ درحقیقت موت کے طریان سے ہے، نہ بعد الموت حیات کے سریان سے، جو عقیدہ ہے، بلکہ ان دونوں کی کیفیت اور صورت تکوّن سے ہے، اس لئے اسے تفرد کہنا بھی تحکم ہے، تفرد بمقابلہ عقیدہ ہوتا ہے نہ کہ مُسلَّمہ عقیدہ کو مان کر اس کی باطنی حقیقت کو بیان کرنے سے، بالخصوص جبکہ اس خاص کیفیت ممات و حیات کے بارے میں سلف کے اشارات بھی موجود ہوں تو بیانِ کیفیت میں بھی تفرد نہیں رہتا۔ ہاں! تفرد اگر ہے تو طریقِ استدلال اور دلائل و براہین کی ندرت میں ہے نہ کہ دعویٰ میں۔

نیز اگر ان دلائل کی رُو سے انکار ہے، تو موتِ نبوی یا حیاتِ نبوی کا نہیں، بلکہ اس خاص کیفیت کی موت اور خاص انداز کی حیات بعد الموت کا غیر انبیاء سے ہے۔ اب اگر اس موت و حیات کی مذکورہ کتاب، مخصوص کیفیت اور اندرونی حقیقت کا انکار اربابِ سطح کرنے لگیں تو یہ انکار ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک نابینا کسی بینا کے مشاہدات کا انکار محض اس لئے کرنے لگے کہ یہ حقائق اسے نظر نہیں آتے۔ تو جیسے یہ انکار درخورِ التفات نہ ہوگا، ایسے ہی یہ طرزِ عمل بھی لائقِ توجہ نہیں ہوسکتا، کہ اربابِ ظواہر ان حقائق کو اسی پیمانے سے ناپنے لگیں جس سے مدلولاتِ ظاہری کو ناپا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس طرح نصوص کے مدلولاتِ ظاہری کا پیمانہ نصوص کے ظواہر ہوتے ہیں، ایسے ہی ان مدلولاتِ خفیہ کا پیمانہ بواطنِ نصوص ہوتے ہیں، "لِكُلِّ اٰيَةٍ مِنْهَا ظَهْرٌ وَّ بَطْنٌ وَلِكُلِّ حَدٍّ مُطَّلَعٌ" اور ساتھ ہی "وَلِكُلِّ فَنٍّ رِجَالٌ"۔

باطنی حقائق کے اثبات کو ظاہری مدلولات کا انکار سمجھ جانا اسی کا فعل ہوسکتا ہے جسے نہ ظواہرِ نصوص پر پورا عبور حاصل ہو، اور نہ ہی وہ نصوص کے ظہر و بطن کے مابین ربط سے واقف ہو۔

درحالیکہ نصوص کے ظواہر بلاشبہ اپنے بواطن سے کلیۃً مربوط اور وابستہ ہوتے ہیں، اور اس ارتباط کا انکشاف خود ایک مستقل علم ہے جو راسخین فی العلم ہی کا حصہ ہے، اس لئے ان بواطن کا انکار درحقیقت ظواہر سے بھی کما حقہ ناواقفیت یا فنِ حقائق سے عدمِ مناسبت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرزِ عمل کا شکار ''آبِ حیات'' بھی ہوئی ہے، ورنہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ''آبِ حیات'' کے دقیق ہونے کو مسئلہ حیات النبیؐ کے انکار و نفی سے کیا تعلق ہے؟

دارالعلوم دیوبند میں حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کی تصانیف کو درساً درساً پڑھانے کا سلسلہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے شروع فرمایا تھا، اور عرصہ تک یہ سلسلہ جاری رہا، اس سے پہلے دارالعلوم کے مخصوص اکابر و اساتذہ حضرتؒ کے مضامینِ حکمت کو دُروس میں بذیل کتاب و سنت بیان کرنے کے عادی رہے ہیں۔

حضرتِ اقدس شیخ الہند مولانا محمود الحسن، میرے والد ماجد حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہم اللہ خصوصیت سے کلامی اور فقہی مسائل کی تشریح، حضرتِ اقدسؒ ہی کی تصانیف کی روشنی میں فرماتے تھے، جس سے طلباء کو ان علوم سے بلا درس و تدریس ہی کافی مناسبت پیدا ہوجاتی تھی۔

موجودہ اساتذہ میں حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم صاحب مدظلہٗ صدر المدرّسین دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا رسول خان صاحب سابق مدرّس دارالعلوم کو حکمتِ قاسمیہ پر کافی عبور ہے، اور دُروس میں ان کے یہاں موقع بموقع یہ حِکَم و اسرارِ قاسمیہ بیانات میں آتے رہتے ہیں۔

مولانا شبیر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اسلام کے مقابلے میں فلسفہ سو برس تک بھی اگر رنگ و رُوپ بدل کر آئے، تب بھی حکمتِ قاسمیہ کی روشنی میں اس کا ''اندازِ قد'' فوراً پہچانا جائے گا، اور اس کی قلعی کھلے بغیر نہ رہے گی۔ اس لئے حضرتؒ کی کتب کی حکمت باوجود دقیق المدرک ہونے کے یہاں کے طلباء میں بدیہیاتِ اوّلیہ کا درجہ رکھتی تھیں، پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے متعذّر الحصول یا ناممکن الادراک ہونے کا پروپیگنڈا کن مصالح پر مبنی ہے؟

لوگ قاضی حمداللہ، صدرا، شمسِ بازغہ تو سمجھ لیں، اور ''آبِ حیات'' و ''قبلہ نما'' سامنے آئے تو اس کے متعذّر الحصول ہونے کا عذر کر کے کھڑے ہو جائیں، تو سوائے اس کے کہ یا اسے فنِ حقائق سے عدمِ مناسبت یا ''الناس أعداء لما جهلوا'' پر محمول کیا جائے، اور کیا کہا جائے؟

اس تفصیل کے بعد جناب کے ہر دو سوالات کا جواب درج ذیل ہے:-

۱- میں نے ''آبِ حیات'' درساً درساً نہیں پڑھی، جتنا بن پڑا خود ہی اس کا مطالعہ کیا ہے، نہ وہ ناقابلِ فہم و ادراک ہے، اور نہ ہی اس کے علوم ملائکہ کے لئے ہیں، بلکہ انسانوں ہی کے لئے ہیں، مگر ذی استعداد انسانوں کے لئے ہیں جنھیں علومِ دینیّہ کے ساتھ معقول و فلسفہ اور ہیئت و ریاضی میں کافی دستگاہ ہو۔ ''آبِ حیات'' میں مشکل حصہ دلائل کا ہے، مسائل کا نہیں، دعویٰ یا مسئلہ اس میں وہی ہے جو شرعی ہے، یعنی انبیاء علیہم السلام اور سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم برزخ میں جسمانی اور دُنیوی حیات کے ساتھ زندہ ہیں، نمازیں پڑھتے ہیں اور رزق پاتے ہیں، اور یہ کہ آپ کی موت اور حیات بعد الموت عام موتوں اور عام حیاتوں کی طرح نہیں، اور نہ ہی موت طاری ہونے اور حیات بعد الموت کے آنے کی کیفیت ہی عام انسانوں جیسی ہے، اسی لئے اس حیات کے اثرات عالمِ دُنیا تک بھی پہنچے ہوئے ہیں کہ نہ ان کی پاک بیویاں بیوہ اور قابلِ نکاح ہوتی ہیں، اور نہ ہی ان کے اموال میں میراث بٹتی

ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دعویٰ یا شرعی مسئلے میں کوئی اِشکال نہیں، اِشکال اگر ہے تو دلائل اور ان کی محققانہ تعبیر میں ہے، لیکن عوام کے لئے، نہ کہ اہلِ علم اور اہلِ ذوق کے لئے۔ اور کچھ بھی ہو میرے یا کسی کے اسے درساً درساً پڑھنے یا کتاب کے مشکل ہونے سے اس کھلے ہوئے شرعی مسئلے پر کیا اثر پڑسکتا ہے کہ اس اِشکال کی آڑ میں مسئلے کی نفی یا انکار کیا جائے، یا حضرتؒ کو اس عقیدے کے کسی بھی پہلو میں جمہور سلف و خلف سے الگ یا متفرد کہا جائے؟

۲- ''الفرقان'' میں ذکر کردہ واقعہ بالکل صحیح ہے، لیکن آخر میں اِجمال کردیا گیا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ:-

''حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے ''آبِ حیات'' پڑھانے سے یہ کہہ کر معذرت فرمائی تھی کہ یہ کتاب بہت عالی اور دقیق مضامین پر مشتمل ہے، اور میں اہتمام کے جھگڑوں میں مبتلا رہ کر چونکہ ہمہ تن اس کتاب کی طرف توجہ نہیں دے سکتا، اس لئے اس کا پڑھانا میرے لئے مشکل ہے، یہ کتاب ایسی نہیں کہ میں ذیلی اور ضمنی طور پر محض سرسری مطالعے سے اسے حل کرکے اس پر قابو پاسکوں۔''

بہرحال اس واقعہ سے کتاب کے ناممکن الفہم ہونے یا اس میں بیان شدہ مسئلہ حیات النبیؐ کے مشکوک یا مشتبہ ہونے پر استدلال کیا جانا قطعاً بے معنی ہے۔

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ اور دیوبند کے تمام اکابر و علماء کا مسلک اس بارے میں صاف رہا ہے، اور ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عالمِ برزخ میں حیاتِ جسمانی و دُنیوی کے ساتھ زندہ ہیں۔

اور یہ ناکارہ خدامِ اکابر بھی، انہی اکابر ممدوحین کے اس مسلک کا پابند اور من و عن متبع ہے۔

(ماہنامہ ''الصیانۃ'' لاہور مارچ ۲۰۰۱ء)

فضائلِ شبِ قدر اور نزولِ قرآن مجید

(مجلس نمبر ۱۵، ۲۳؍رمضان المبارک ۱۳۹۴ھ)

آج کی رات میں بادل کی کثرت تھی، نمازِ تراویح اگر چہ باہر ہی پڑھی گئی لیکن بارش کا شبہ تھا، نماز سے فراغت کے بعد کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ آج شبِ قدر ہے، حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ نے اپنے معمول کے مطابق اہلِ علم کے سوالات کا محققانہ جواب دینا شروع کردیا، ہماری دِلی خواہش تھی کہ آج کی مجلس میں حضرتِ والا سے شبِ قدر کے متعلق سوالات کئے جائیں، ہم نے بعض احباب سے مشورہ بھی کیا، انہوں نے ہماری رائے سے اتفاق کیا، حالت یہ تھی کہ بادل کی کثرت کی وجہ سے کبھی بوند پڑتی، کبھی بند ہوجاتی، مگر ابھی تک پورا مجمع اور حضرتِ والا صحن میں ہی تشریف فرما تھے، موقع پا کر ہم نے اپنا مقصد ظاہر کردیا کہ حضورِ والا ہم لوگوں کی خواہش ہے کہ آج شبِ قدر کے متعلق کچھ بیان فرمادیں، حضرت حکیم الاسلام سارے سوالات کو چھوڑ کر ہماری طرف متوجہ ہوگئے اور فرمایا کہ: ہاں! آج شبِ قدر کے آثار محسوس ہو رہے ہیں، اتنے میں بوندیں تیزی سے پڑنے لگیں، پھر آپ اندر کمرے میں تشریف لے گئے اور ساتھ ہی پورا مجمع بھی، حضرتِ والا نے بیان کرنا شروع فرمایا۔ حضرت حکیم الاسلام نے فرمایا کہ:-

شبِ قدر کی بڑی فضیلت ہے، اس کے بارے میں قرآن شریف میں فرمایا گیا ہے کہ: "لَیۡلَةُ الۡقَدۡرِ خَیۡرٌ مِّنۡ اَلۡفِ شَهۡرٍ" یعنی ایک رات ہزار راتوں سے زیادہ افضل ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ہزار سال مخلصانہ عبادت سے جو مقام حاصل ہوتا ہے، لیلۃ القدر میں اس کی برکت وفضیلت سے ایک رات میں آدمی اس مقام کو

پالیتا ہے اس لئے یہ مبارک اور مقبول رات ہے۔ اور قاعدہ بھی ہے کہ جب ظرف مقبول ہوتا ہے تو مظروف بھی مقبول ہوجاتا ہے، اور ظرف دو ہی ہیں، یا تو ظرفِ زمان یا ظرفِ مکان، بعض چیزیں زمانے میں واقع ہوتی ہیں اور بعض چیزیں مکان میں واقع ہوتی ہیں، اگر زمانہ مقدس ہے تو اس میں جو خیر کا عمل ہوگا وہ دُوسرے زمانے کی نسبت سے ہزاروں درجہ بڑھا ہوا ہوگا، اسی طرح اگر مکان مقدس ہے اور اس میں نیکی کی جائے تو وہ نیکی دُوسرے مکانوں کی نیکی کی نسبت ہزاروں درجہ بڑھی ہوئی ہوگی، یہی عبادت آپ یہاں کریں اور یہی عبادت جا کر بیت اللہ میں کریں، تو بیت اللہ کی ایک نماز ایک لاکھ کے برابر ہوتی ہے، اور یہاں ایک نماز ایک ہی نماز کے برابر ہوگی، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ یہاں ایک لاکھ نماز بھی پڑھیں اور اسی کی وجہ سے کسی مقام پر پہنچیں تو بیت اللہ میں ایک ہی نماز پڑھنے سے وہ رُوحانیت کا مقام حاصل ہوجائے گا۔ اور یہ وجدانی چیز ہے آدمی خود محسوس کرتا ہے، مثلاً حج کے موقع پر بہت سے خلافِ طبع اُمور پیش آتے ہیں، شہر اپنا نہیں، زبان نہیں جانتے، اجنبیت کی وجہ سے ساری تکلیفیں اُٹھاتے ہیں، مگر جہاں حرم میں قدم رکھا تو ایسا سکون معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی تکلیف ہی نہیں ہوئی تھی، بیت اللہ پر نظر پڑی اور ساری تکلیفیں ختم ہوئیں تو وجدانی طور پر ہر شخص محسوس کرتا ہے۔ آخر بیت اللہ پر نظر پڑتے ہی یہ کیفیت کیوں پیدا ہوئی؟ مجھے اپنا گھر دیکھ کر یہ کیفیت کیوں پیدا نہیں ہوتی؟ اپنے شہر کو دیکھ کر یہ کیفیت کیوں پیدا نہیں ہوتی؟ اور بیت اللہ کی صورت دیکھی تو ایک رُوحانیت اُبھری، پھر تواضع اور انکساری و محبت اور جوش یہ سارے جذبات پیدا ہوتے ہیں، اور جب بیت اللہ میں پہنچتے ہیں تو ان جذبات کی کوئی انتہاء نہیں رہتی اور ہر شخص محسوس کرتا ہے، لیکن مقامات کو عارف ہی پہچانتے ہیں کہ کیا مقام حاصل ہوا، عوام بھی محسوس کرتے ہیں کہ اب تک ہم کیسے تھے اور حرم میں داخل ہونے کے بعد کیسے ہوگئے، وہی نماز آپ بازار میں پڑھیں جس کو شر البقاع کہا گیا ہے، یعنی بدترین جگہ، اگر وہاں عبادت

کی جائے تو وہ اِخلاص و معرفت نصیب نہیں ہوگی جو مسجد میں ہوگی، اس سے معلوم ہوا کہ مکان کے فرق کی وجہ سے عمل میں فرق پڑ جاتا ہے۔

اور یہی حالت زمانوں میں ہے، اگر ایک عبادت آپ جمعہ کی رات میں کریں، اس کا درجہ بڑھا ہوگا دیگر راتوں سے، اور وہی عبادت آپ لیلۃ القدر میں کریں تو اس کے مراتب بہت بڑھ جائیں گے جو اور راتوں میں عبادت سے حاصل ہوتے ہیں، کیونکہ وہ زمانہ مقدس ہے۔ تو جیسا ظرف ہوگا ویسا ہی مظروف ہوگا۔ اگر ظرف تکونا ہے تو جتنا پانی بھریں گے وہ تکونا ہی نظر آئے گا، چوکور اور گول نہیں بنے گا کیونکہ ظرف کی ساخت ہی ایسی ہے، اور اگر ظرف سلیقے کا بنا ہوا ہے تو جو چیز اس میں بھریں گے وہ بھی ویسا ہی نظر آئے گی، مثلاً شیشہ اگر سفید ہے تو جو چیز اس میں بھریں گے وہ سفید ہی معلوم ہوگی، اور اگر سبز ہے تو ساری چیز سبز ہی نظر آئے گی، خواہ وہ شے سفید ہی ہو، کیونکہ اس ظرف کا اثر ہے۔ تو جب مادّیات اور حسیات میں یہ چیز ہے تو رُوحانیت میں کیوں نہ ہوگی۔ تو لیلۃ القدر میں جو طاعت کی جائے گی جس کے بارے میں قرآن نے صراحت کی ہے: ”لَیۡلَۃُ الۡقَدۡرِ خَیۡرٌ مِّنۡ اَلۡفِ شَھۡرٍ“ اگر آپ ایک ہزار مہینے عبادت کریں اور ایک عبادت اس رات میں کریں تو یہ عبادت وہی ثمرہ پیدا کرے گی جو ایک ہزار مہینے عبادت کرنے سے ثمرہ پیدا ہوتا ہے، ایک تو یہ کھلی ہوئی فضیلت ہے۔

شبِ قدر کی دُوسری فضیلت

اور شبِ قدر کی دُوسری فضیلت یہ ہے کہ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ اس رات میں جبریل علیہ السلام اُترتے ہیں ”فی قمقمۃ من الملائکۃ“ ایک بڑے جلوس کے ساتھ آتے ہیں، کروڑوں ملائکہ ساتھ میں ہوتے ہیں، ظاہر بات ہے کہ کسی مجلس میں اگر ایک اہل اللہ آجائے تو مجلس کے رنگ میں فرق پڑ جائے گا اور توجہ الی اللہ پیدا ہوجائے گی، اور جب اربوں کھربوں اہل اللہ ہوں گے تو ظاہر بات ہے

کہ زمین کی نورانیت کتنی بڑھ جائے گی، تو ان ملائکہ کے آنے سے قلوب کے اندر سکینت اور بشاشت اور انشراح پیدا ہوتا ہے، یہ لیلۃ القدر کے ساتھ مخصوص ہے جو دُوسری راتوں میں نہیں ہے۔

لیلۃ القدر کی تیسری فضیلت

اور تیسری بات یہ ہے کہ گویا عالَمِ غیب سے آدمی کا سابقہ پڑتا ہے، دیگر راتوں میں آپ نماز پڑھیں گے تو آپ دُنیا میں ہیں، لیکن لیلۃ القدر میں جب اربوں کھربوں ملائکہ کا ہجوم ہوتا ہے جو اہل اللہ ہیں اور وہ بھی معصیت سے پاک وصاف، "بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ" وہ اللہ کے مقبول بندے ہیں، "لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ" وہ نہ عصیان کو جانیں، نہ معصیت کو جانیں، بلکہ کمالِ اِخلاص اور کمالِ معرفت کے حامل، اور جب ایسے اہل اللہ ہوں اور کروڑوں ہوں تو کیا ان کا اثر نہیں پڑے گا؟ تو اس وقت لیلۃ القدر میں آدمی کو عالَمِ غیب سے قرب ہوجاتا ہے۔ تو کل تین فضیلتیں ہوئیں، ایک تو یہ کہ ظرف مقدس، دوم ملائکہ کی صحبت، تیسرے ان کی نورانیت کا اضافہ جس سے قلوب میں نورانیت پیدا ہوتی ہے، اور قلب کی نورانیت حسّی نہیں ہے، جیسا کہ آفتاب کا نور ہے کہ چاند نہ نظر آنے لگے، بلکہ معنی نورانیت ہے کہ قلب میں سکون وفرحت اور بشاشت اور توجہ الی اللہ کا نزول ہوتا ہے۔ قلب کی نورانیت کا ہر شخص تجربہ کرلے، اگر اسی رات میں خلوص کے ساتھ عبادت کرے اور توجہ الی اللہ ہو تو اَضعافاً مضاعفاً طاعت کا ثواب بڑھ جائے گا، پھر وہ رات خود مقدس ہے اور واقع ہوئی مقدس مہینے کی رات میں، کیونکہ رمضان کا مہینہ بھی تو خود مقدس ہے وہ سیّد الشہور ہے، اس کے اندر شیاطین بھی بند ہیں، نفس پر بھی پابندیاں ہیں اور تزکیۂ نفس کے سارے سامان موجود ہیں، لہٰذا جب ان سامانوں کے ساتھ لیلۃ القدر میں عبادت ہوگی تو لازمی طور پر توجہ الی اللہ کامل ہوگی، دُنیا کی طرف توجہ نہیں ہوگی۔ اور ظاہر بات ہے کہ عبادت کا وزن اخلاص ہی سے ہوتا ہے، جب اخلاص کامل ہوا تو

عبادت بھی کامل ہوگی۔ تو رمضان اور رمضان میں لیلۃ القدر، اور لیلۃ القدر میں ملائکہ کا اِجتماع، اور عالَمِ غیب کا قریب آجانا، یہ تمام اثرات ہیں کہ جن سے برکات کا ظہور ہوتا ہے، دیگر راتوں میں آپ توجہ کریں گے، عالَمِ غیب کی طرف کوشش کریں گے کہ ادھر توجہ ہو، مگر عالَمِ غیب آپ کے پاس نہیں آئے گا، بلکہ آپ خود جائیں گے، اگر آپ میں طاقت ہے تو پہنچ جائیں گے، اور اگر طاقت نہیں ہے تو نہیں پہنچیں گے، اگر تھوڑی طاقت ہے تو ذرا قریب ہوگئے، لیکن جب سارا عالَمِ غیب ہی نیچے اُتر آیا ہو تو اگر رُوحانیت کا کمزور آدمی بھی ہے تو اس کے اندر طاقت پیدا ہوجائے گی، یہ لیلۃ القدر کی بات ہے۔

شبِ قدر کے چھپالینے کی وجہ

ایک صاحب نے سوال کیا کہ یہ رات پوشیدہ کیوں رکھی گئی، اس کی وجہ کیا ہے؟ اگر متعین ہوجاتی تو عبادت میں سہولت ہوتی۔ حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تاکہ آپ ہر رات میں یہ توجہ کریں کہ ممکن ہے اب ہو، اگر آپ کو بتلادی جاتی کہ فلاں تاریخ میں آئے گی تو چپ چاپ بیٹھے رہتے کہ جب وہ رات آئے گی تو عبادت کریں گے، اس لئے چھپائی گئی تاکہ آپ سست نہ ہوجائیں اور بھروسہ نہ کر بیٹھیں اور معطل نہ بن جائیں۔

اس لئے اس تعطل کو رفع کرنے کے لئے اس رات کو چھپادیا گیا مگر چھپانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ زیادہ چھپادی گئی ہے، بلکہ فی الجملہ چھپادی گئی ہے کیونکہ اس قدر متعین ہے کہ رمضان میں وہ رات ہوتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورے سال میں تلاش کی زحمت سے آپ بچ گئے، اور رمضان میں ظنِ غالب بتایا کہ عشرۂ اَخیرہ میں ہے، ادھر بیس دن رمضان میں عبادت کرتے کرتے قلب میں صلاحیت پیدا ہوئی اور اس کے بعد آگیا عشرۂ اَخیرہ اور ساری راتوں میں صرف ایک رات شبِ

قدر کی رکھی تاکہ طاعت میں اور قوت پیدا ہوجائے، متعین کرنے میں سارے رمضان آدمی بے توجہ رہتا کہ جب وقت آئے گا عبادت کرلیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ موت کا وقت کسی کو نہیں بتایا گیا تاکہ پوری زندگی میں موت کی استعداد پیدا کرتا رہے اور آخرت کے لئے سامان کرتا رہے، اگر یہ بتلادیتے کہ ساٹھ برس کے بعد اتنے بج کر اتنے منٹ پر موت آئے گی تو اس میں دو خرابیاں تھیں۔ اوّل تو یہ کہ آدمی کی زندگی اجیرن ہوجاتی، اب وہ گن رہا ہے کہ اب موت کے اتنے دن رہ گئے ہیں، کھانا پینا سب بے مزہ ہوجاتا اور نظامِ عالم برباد ہوجاتا، اس لئے موت کا وقت نہیں بتلایا۔ دُوسری اس لئے موت کا وقت نہیں بتلایا کہ عمر کو عبادت میں استعمال کرو، ممکن ہے اس وقت موت آجائے اور ممکن ہے کہ دس گھنٹے کے بعد آئے، ایسا نہ ہو کہ میں اس وقت غافل ہوں اور موت آجائے تو غفلت باقی نہیں رہے گی۔ معلوم ہوا کہ چھپانے میں بیداری پیدا ہوتی ہے اور متعین کرنے میں بیداری باقی نہیں رہتی۔ اب ایک ہیں فرائض، ان کے اوقات متعین کردیئے، کیونکہ یہ اللہ کی طرف سے واجب ہے، جھک مار کر کرنا پڑے گا۔ اور جو چیز واجب نہیں ہے ان کو چھپادیا تاکہ اس کو تلاش کرو، اسی لئے شبِ قدر چھپادی گئی تاکہ پورے رمضان اس کی تلاش میں رہو اور بیدار رہو، اگر بالفرض کسی نے کچھ بھی نہیں کیا تو کم سے کم اس پر کوئی وبال تو نہیں ہوگا، کیونکہ وہ فرض اور واجب نہیں، بے توجہی رہی تو رہی آپ نے قصداً اپنا نقصان کیا، فرائض میں اوقات کی تعیین کردی گئی اس لئے کہ وہ ہر شخص پر واجب ہے، اگر فرائض متعین نہ ہوتے تو عمل کرنا مشکل ہوجاتا، کوئی نماز صبح کے وقت پڑھ لیتا، کوئی شام کے وقت، اس سے تفرقہ پیدا ہوتا اس لئے ان کی تعیین کردی، اور جو نوافل و مستحبات ہیں وہ افضل ہیں ان کی تعیین نہیں کی تاکہ بھروسہ نہ کر بیٹھیں ایک رات کے اُوپر، بلکہ پورے عشرۂ اَخیرہ میں جم کر عبادت کریں، یہ تو بنی آدم ہی کی خیرخواہی کے لئے کیا ورنہ اللہ کے خزانے میں کیا کمی ہے۔

جبریل علیہ السلام کا شبِ قدر میں قریب آنا اور اہل اللہ کا ان سے فیوض و برکات حاصل کرنا

ایک صاحب نے سوال کیا کہ حضرت! حدیث شریف میں آیا ہے کہ شبِ قدر میں حضرت جبریل علیہ السلام مسلمانوں کے گھر آ کر ان سے ملاقات کرتے ہیں، تو ملاقات کرنے کا کیا مطلب؟ وہ کس طرح ملاقات کرتے ہیں؟ حضرتِ اقدس حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ کیا کبھی آپ سے ملاقات ہوئی ہے؟ اتنا کہتے ہی ساری مجلس ہنس پڑی۔ پھر حضرتؒ نے فرمایا کہ ان کے آنے سے ہر انسان کو فائدہ پہنچتا ہے، لیکن انسانوں کے مراتب مختلف ہیں، جو صاحبِ معرفت ہیں اور بصیرتِ قلب رکھتے ہیں ان کو ان انوار کا زیادہ احساس ہوتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ خصوصی ملاقات ہوتی ہے، لیکن جن کے اندر معرفت نہیں ہے وہ عمومی طور پر احساس کرتے ہیں کہ ہمارے قلوب کے اندر برکت آ رہی ہے، یہ آپ کا فعل ہے، جبریل علیہ السلام کا فعل نہیں ہے، وہ تو دُنیا میں آ گئے، رہا ان سے زیادہ فائدہ کون اُٹھاتا ہے؟ تو بصیرت والے فائدہ اُٹھاتے ہیں، بے بصیرت والے نہیں، جو زیادہ فائدہ اُٹھائیں گے جبریل علیہ السلام ان سے زیادہ قریب ہو جائیں گے، اور جو کم اُٹھائیں گے ان سے بُعد رہے گا، اور جو بالکل نہیں اُٹھائیں گے ان کے لئے کچھ بھی نہیں ہوگا۔

جبریل علیہ السلام کسی خاص شخصیت سے ملنے نہیں آتے، اب یہ اَشخاص پر موقوف ہے کہ کون ان سے ملنا چاہتا ہے اور کون نہیں ملنا چاہتا، اگر ملنا چاہے تو مل لے، جن کے قلب کے اندر بڑا ادراک اور بڑی بصیرت ہے وہ جبریل علیہ السلام کے انوار کو محسوس کرتے ہیں اور ان کی طرف جھکتے ہیں، تو گویا یہی ان کی ملاقات ہے، جیسے آفتاب سب پر اپنی روشنی ڈالتا ہے، اب ایک شخص وہ ہے کہ اس کی روشنی سے فائدہ اُٹھا رہا ہے، اور ایک شخص وہ ہے جو گھر کے اندر ہے وہ فائدہ نہیں اُٹھاتا۔ تو جس نے دُھوپ سے فائدہ اُٹھایا وہ آفتاب سے قریب ہو گیا، اور جس نے نہیں اُٹھایا وہ

آفتاب سے بعید کہا جائے گا، مگر آفتاب سب کے لئے آتا ہے، وہ کسی خاص شخص کے گھر میں نہیں آتا بلکہ زید، عمر، بکر سب پر اپنی روشنی ڈالتا ہے، جس کا جی چاہے روشنی حاصل کرلے اور جس کا جی چاہے نہ کرے۔

شبِ قدر کی مخصوص عبادت

ایک صاحب نے سوال کیا کہ حضرت! اس رات میں کیا کوئی مخصوص عبادت ہے؟ حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ عبادت میں تو کوئی تخصیص نہیں ہے، لیکن یہ ضرور ہے کہ نوافل میں جتنا قرب ہوتا ہے، دُوسری طاعت میں اتنا قرب نہیں ہوتا، لہٰذا نوافل کی کثرت زیادہ مناسب ہے، اب تلاوتِ قرآنِ پاک بڑی عبادت ہے، لیکن نفل اس عبادت کو بھی شامل ہے کیونکہ اس میں کلامِ پاک کی تلاوت بھی ہے اور نوافل بھی ہے۔ ایک شخص تو وہ ہے کہ فقط تلاوت کر رہا ہے، اس سے برکات حاصل ہوں گی، لیکن جامع برکت اسی وقت ہوگی جبکہ نماز کے اندر تلاوت ہو، تو جتنا قرب نوافل سے ہوتا ہے اتنا صرف تلاوت سے نہیں ہوتا اور یہ تلاوت اور نفل میں تقابل نہیں ہے، کیونکہ نفل میں خود تلاوت موجود ہے۔

حضراتِ صحابہؓ کی ترقی کی وجہ

حضراتِ صحابہؓ کی جو ترقی ہوئی ہے وہ دو چیزوں سے ہوئی ہے، ایک کثرتِ صلوٰۃ اور ایک کثرتِ جہاد، جہاد میں تو انہوں نے نفس کو مار ڈالا اور کچل ڈالا، اور نماز میں توجہ الی اللہ اور تعلق مع اللہ پیدا کیا، تو صحابہؓ کی جو سب سے بڑی عبادت تھی وہ یا تو جہاد یا کثرتِ صلوٰۃ، اسی سے ان کی ترقی ہوئی اور اسی میں وہ کامیاب ہوئے، اور ان سب سے بڑھ کر سیّد الکونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت اور آپ کی مجلس میں حاضری، یہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مخصوص دولت تھی۔

(ماہنامہ ''الصیانۃ'' لاہور نومبر ۲۰۰۱ء)

اُمتِ مسلمہ کی ذمہ داری

''اُمتِ مسلمہ کی ذمہ داری'' جیسے ہمہ گیر عنوان کی وسیع تفصیلات کی مختصر ترین وضاحت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کے بارے میں ''قرآنی تعارفی کلمات'' کے سوا کسی دُوسری تعبیر میں اس لئے ممکن نہیں کہ یہ اُمت آپؐ ہی سے وابستہ ہے، اور آپؐ ہی کی نسبت سے دُنیا میں پہچانی جاتی ہے۔

اس دعوے پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں کہ قرآنِ کریم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ تعارف پیش فرمایا کہ دُنیا کی کسی مذہبی کتاب نے اپنے راہ نما کا اتنا مکمل اور مبنی برحقیقت تعارف نہیں کرایا، اور اس تعارف کا امتیاز مزید وعظیم یہ ہے کہ اسی سے اس راہ نما اور کتاب سے وابستہ اُمت کی ذمہ داریاں بھی متعین ہوکر سامنے آجاتی ہیں، اور یہ خصوصیت مزید لائقِ ذکر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی، کسی ایک ملت، یا طبقے یا خطے کی راہ نما نہیں بلکہ پورے عالمِ انسانیت کے لئے، رہتی دُنیا تک کے لئے دائمی راہ نما ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قرآنی تعارف کا اَوّلین جزو ''وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ'' ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ہم نے آپؐ کو سارے جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی امیر وغریب، راعی اور رعایا، کمزور اور قوی، خواص اور عوام، صاحبِ عہدہ ومنصب اور بے منصب، منصف اور انصاف طلب، شاگرد اور اُستاذ، متمدن اور غیر متمدن، معیشت اور معاشرت، امن اور فساد، جنگ اور مصالحت وغیرہ تمام اَحوالِ انسانی کے لئے مینارۂ نور ہے کہ جس کی

اطاعت و فرماں برداری ہی میں تمام تر فلاحِ انسانیت مضمر ہے۔ قرآن تعارف کا جزوِ ثانی: "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" یعنی انسانی زندگی کے تمام اعمال، تمام افعال، تمام اقوال اور تمام احوال میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مکمل ترین مشعلِ راہ ہے۔ اور تعارفِ قرآنی کا تیسرا رُخ: "مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَآ أَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ" ہے، اس آیتِ کریمہ میں تین حقیقتوں کا برملا اظہار فرمایا گیا ہے۔ اوّل یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مقدسہ پر وہ سلسلۂ نبوّت کہ جو اوّل النبیّین حضرت آدم علیہ السلام سے چل کر ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں تک چلتا رہا، وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی پر ختم کردیا گیا ہے، اس وضاحت ختمِ نبوّت سے یہ حقیقت بھی کسی دلیل کی محتاج نہیں رہی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے تمام راہ نما اور انسانیت کے مربی افعال و اقوال، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات بغیر کسی ادنیٰ تبدیلی وتحریف کے ہمیشہ ہمیشہ اس امتیاز کے ساتھ من جانب اللہ محفوظ رہیں گی کہ مخالف اقوام و اُمم کی نت نئی ہزار سازشوں اور دُشمنیوں کے باوجود اس کا بچانا تو بجائے خود ہے، اس میں ذرّہ برابر تبدیلی بھی نہیں ہوسکے گی۔

جس کے معنی یہ کہ انسانیت کے لئے سراپا رحمت بن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دِین اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی پر تکمیل کردہ نبوّت، بغیر کسی ادنیٰ فرق کے قیامت تک انسانیت کی رہنمائی کرتی رہے گی۔

اس جامع تعارف کے ذریعہ اصلاً اس حقیقت و امتیازِ محمدی کو آشکارا فرمانا ہے کہ صداقت وحقانیت کی بنیاد پر، عالمی رہبر و رہنما صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذاتِ مبارکہ اس لئے ہوسکتی ہے کہ تمام انبیائے سابقین نے صرف اپنی اپنی قوموں کو اپنے دِین کا مخاطب بنایا، بخلاف احمدِ مجتبیٰ محمدِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ آپ نے تختۂ زمین پر بسنے والی کالی، گوری، زرد اور سرخ، متمدن و غیرمتمدن، افریقن، امریکن، یوروپین اور ایشین تمام اقوامِ عالَم کو، انسانیت کے مکمل احترام کے

ساتھ مخاطب بنا کر اعلان فرمایا کہ: "یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا" (اے دُنیا بھر میں بسنے والے انسانو! میں تم سب کے لئے اللہ کا رسول ہوں)۔

تو نبوّتِ محمدیہ کا اوّلین امتیاز یہ ہے کہ اس نے اپنے خطاب میں تمام جغرافیائی حد بندیوں کو ختم کر دیا ہے اور نسلی، سیاہ و سفید کی، ملک و وطن کی، زبان و بیان کی، اور ہر قسم کی خودساختہ تقسیموں اور تفریقوں کو ختم کر کے صرف اِنسانیت کو ترجیحی عظمت عطا فرمائی۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و پیغامات اِنسانیت پر وارد ہونے والے تمام اچھے بُرے اَحوال کا مطابق فطرت رہنمائی کے ساتھ احاطہ کرتی ہیں۔

اور نبوّتِ محمدی کا وہ منفرد امتیاز کہ جو بلاشرکتِ غیرے صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تعلیمات اور آپ کی سیرتِ مقدسہ ہی کو حاصل ہے وہ یہ ہے کہ روزِ اوّل کی طرح آج پندرہ صدیاں گزر جانے کے باوجود بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و تعلیمات بلا کسی تحریف اور آمیزش کے موجود و محفوظ ہیں۔ اور بلاخوفِ تردید یہ دعویٰ بھی صرف غلامانِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کر سکتے ہیں اور تقابلی مطالعے کی صورت میں اس دعوے کو ثابت بھی وہی کر سکتے ہیں، اس لئے کہ اس کائناتِ رنگ و بو میں بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے کسی بھی مذہب کی تعلیمات، اپنے لانے والے تک سندِ متصل کے ساتھ مطلقاً موجود نہیں ہیں، بخلاف تعلیماتِ محمدی کے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کے پاس قرآنِ کریم کی ایک ایک آیت کی سند اللہ رَبّ العزت تک، اور ایک ایک روایت کی سند خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک مکمل طور پر موجود و محفوظ ہے۔

اور کسی تفصیل کے بغیر یہ قرآنی صداقت، اُمتِ مسلمہ کی ذمہ داریوں کے موقف کو مشخص کر دیتی ہے کہ کتابُ اللہ نے اور رسول اللہ نے اس اُمت کو دِین سازی کا حق نہیں دیا، بلکہ صرف اللہ کی جانب سے نازل فرمودہ دِین پر عمل کا مخاطب بنایا

ہے، ارشادِ ربانی ہے: ''وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ'' اس اِجمال یا تفصیل کی روشنی میں ''اُمتِ مسلمہ کی ذمہ داری'' یہ قرار پاتی ہے کہ:۔

۱۔ ''دِینِ محمدی'' کے جزوی اور کلی اَحکام پر برضا و رغبت عمل کے عادی بنیں۔

۲۔ اور ''صالحیت'' کے حصول کے ساتھ ''مصلحیّت'' کی ذمہ داری کے تحت اس پیغامِ سرمدی کو اَقوامِ عالَم تک اس طرح پہنچائیں کہ ان کے قلب و دِماغ میں پیدا ہونے والے شکوک و شبہات کو، کتاب و سنت کی روشنی میں دلائل و براہین سے زائل کر کے، انہیں اطمینانِ قلب کی دولت سے مالا مال کریں۔

اور اس کے بعد اپنی قدرت اور استطاعت کے مطابق اس بین الاقوامی پیغامِ محمدی کو جائز وسائلِ وقت کو استعمال کر کے، انسانیتِ عامہ کو اس سے بہرہ مند فرمائیں۔

ملتِ اسلامیہ پر یہ وہ عظیم و عالمی ذمہ داری ہے کہ جو اَقوامِ عالَم میں مروّج اَدیان و مذاہب نے اپنے ماننے والوں پر عائد نہیں کی ہے، جس کی وجہ اس کے سوا اور دُوسری نہیں ہوسکتی کہ وہ مذاہب و اَدیان غیر مستند ہونے کی وجہ سے فکر و شعورِ انسانی کو مطمئن کرنے کی ذمہ داری نہ لیتے ہیں اور نہ مطمئن کر ہی سکتے ہیں، اس لئے کہ دیومالائی مفروضہ قصوں اور ناقابلِ یقین اَفکار و اَوہام پر مبنی نام نہاد تفصیلات نہ ذہنِ انسانی کے لئے اپیل کرنے والی ہوسکتی ہیں اور نہ اطمینان بخش۔

پھر بعض مذاہب میں انسانوں کی غیر فطری اور غیر معقول یہ تقسیم کہ ایک طبقہ برتری کے اس مقامِ عظمت پر بلا کسی معقول بنیادی وجہ کے فائز قرار دے دیا جائے کہ وہ جہالت و بداخلاقی کی انتہاء کے باوجود محض اپنی خود ساختہ نام نہاد برتری کی وجہ سے دُوسرے طبقات کے کثیر العلم اور وسیع الاخلاق افراد پر بہرصورت فائق سمجھا جائے۔

پھر قدرت کی جانب سے عطا کردہ صلاحیتوں کو نظر انداز کر کے کسی طبقے کے لئے برتری رکھنے والے طبقے کی جان و مال کی حفاظت کو لازم کر دینا، کسی طبقے کو

تجارت و زراعت کا ذمہ دار قرار دے دینا وغیرہ، غیر فطری، غیر معقول اور غیر منصفانہ تقسیم، انسانیت کا یہ نظام کبھی بھی انسانوں کے لئے قابلِ تحمل نہیں ہوسکتا۔

دینِ فطرت ''اسلام'' رنگ و نسل اور سرزمین اور وطن کو اہمیت نہ دے کر، دین و مذہب کا وہ عالمگیر نظام عطا کرتا ہے کہ جس کی بنیاد، تمام صفاتِ کمال سے موصوف خدائے واحد پر ہے کہ جو ساری کائنات کا خالق اور تمام انسانوں کا واحد پالنہار ہے، اسی بنیاد پر اس نے اپنی کتاب قرآنِ کریم کو ''هُدًى لِلنَّاسِ'' فرمایا اور اپنے آخری پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو ''رحمة للناس'' اور ''کافةً للناس'' فرمایا۔

آج کی اہم ترین ملّی، قومی اور اسلامی ضرورت یہ ہے کہ نبوّتِ محمدیہ کے مذکورہ اجزائے ثلاثہ کی روشنی میں ملتِ اسلام کی صدی کا لائحہ عمل متعین کریں۔

(ماہنامہ ''الصیانۃ'' لاہور جنوری ۲۰۰۲ء)

صدیقِ حمیم و رفیقِ قدیم
حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ

معیت و رفاقت

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نامِ نامی سامنے آتے ہی اپنے باہمی تعلقات کی وہ پوری تاریخ ایک دَم سامنے آگئی جس میں اس احقر اور مفتی صاحبؒ نے ایک طویل عرصہ گزارا ہے۔

مفتی صاحبؒ سے جیسی معیت احقر کو شروع سے حاصل رہی، ویسی کسی دُوسرے ہم درس و ہم سبق کے ساتھ نہیں رہی، یہ رفاقت رسمی اور ظاہری نہ تھی، بلکہ حقیقی اور معنوی تھی، جس کی قدر و قیمت اس مخلصانہ تعلق سے بیش از بیش ترقی پذیر رہی اور جس کا تسلسل برس ہا برس قائم رہا، یہی وجہ ہے کہ مفتی صاحبؒ کے انتقالِ مکانی سے احقر کو جتنا ملال اور رنج پہنچا، شاید کسی اور کے جانے سے طبیعت اتنی متاثر نہیں ہوئی، حتیٰ کہ اپنے مکان میں بیٹھ کر بہت دیر تک آنسوؤں سے روتا رہا، گھر والوں نے گھبرا کر پوچھا کہ آج کیا کوئی حادثۂ عظیم پیش آگیا ہے جو خلافِ عادت اتنے گریہ و بکا کا سبب بن گیا ہے؟ تب مفتی صاحبؒ کے فراق کا یہ سبب کھلا۔

رفاقتِ تعلیم

ابتدائی تعلیم میں ہم دونوں ہم درس و رفیق رہے، آپؒ کے والدِ بزرگوار حضرت مولانا محمد یاسین صاحبؒ فارسی کے مُسلّمہ اُستاذ و قطبِ عالم حضرت گنگوہیؒ کے

متوسلین میں سے تھے، اُن کے یہاں فارسی کی تعلیم ایک ساتھ ہوئی، پھر اس سے اُوپر کی عربی تعلیم شروع ہوئی تو اس میں بھی وہی میرے مستقل رفیقِ درس تھے، تعلیم جن اساتذہ سے پائی وہ بھی مشترک ہی تھے، اساتذہ کی غیر معمولی عنایات و توجہات میں بھی ہم دونوں شریک رہے۔

عارف باللہ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ، عالمِ ربانی حضرت مولانا میاں اصغر حسین صاحب مدظلہٗ اور محدّثِ وقت حضرت الأستاذ الاکبر مولانا سیّد محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اور اُستاذ المعقولات حضرت مولانا رسول خان صاحبؒ، حضرت مولانا سیّد اصغر حسین صاحبؒ اور حضرت علامہ ابراہیم صاحبؒ جیسے اساطینِ علم خوش بختی سے ہمیں ملے، اس طرح آغازِ تعلیم سے لے کر تکمیل تک حضرت مفتی صاحبؒ کے ساتھ تعلیمی اور تدریسی رفاقت مسلسل رہی۔ یاد نہیں پڑتا کہ اس رفاقت و معیت میں کبھی کوئی فکری و ذہنی اِنقطاع رُونما ہوا ہو، اگرچہ مفتی صاحبؒ کی علمی مصروفیات اور مشاغلِ علم میں مسابقت ان کے کسی ہم درس و رفیق کے بس کی بات نہ تھی، وہ اس میدان میں سب سے آگے تھے۔

رفاقتِ تدریس

تعلیمی دور ختم ہوجانے پر بھی یہ رفاقت اس شکل میں برقرار رہی کہ فراغت کے بعد دونوں ہی کو دارالعلوم کی خدمت انجام دینے کا ایک ساتھ ہی موقع ملا، احقر کا اوّلاً تدریس سے اور ثانیاً انتظامی اُمور سے تعلق ہوا، اور مفتی صاحبؒ کا اوّلاً تدریس سے اور ثانیاً افتاء سے تعلق ہوا۔

رفاقتِ سلوک

پھر یہ بھی حسنِ اتفاق ہے کہ مسترشدانہ تعلق میں بھی یہ اشتراک و توافق سامنے آیا کہ ہم دونوں خانقاہِ امدادیہ کے حاضر باش اور فیوضِ اشرفیہ کے خوشہ چین

بنے اور اس میں بھی معیت و رفاقت اس درجہ کی رہی کہ حضرت مرشد تھانوی نوّر اللہ مرقدہٗ کی عنایات و افاضات ہم دونوں پر مسلسل مبذول رہیں، مفتی صاحبؒ تو اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر مقامات طے کرتے چلے گئے، احقر دارالعلوم کی انتظامی ذمہ داریوں کے سبب اس راہِ سلوک میں اتنا تیز رو نہ بن سکا، گو حضرت مرشد تھانویؒ یہ فرما کر تسلی بھی فرمادیا کرتے تھے کہ اِن مشاغل میں نیت مجاہدے کی کرلی جائے تو اس میں وہی ثمرات مرتب ہوں گے جو ذکر و شغل پر ہوتے ہیں بلکہ اس سے زیادہ، لیکن بہرحال وہ طبعی مشغلہ علمی ہمہ وقت بروئے کار نہ رہ سکا، تاہم حضرت مفتی صاحب مرحوم سے باطنی رفاقت ہمہ وقت میسر رہی جو ایک طویل مدّت پر مشتمل ہے۔

رفاقتِ خدمت

جب احقر کو نیابتِ اہتمام کے بعد اہتمام کی مرکزی اور بنیادی ذمہ داری اکابر کی طرف سے تفویض فرمائی گئی تو مفتی صاحبؒ بھی اپنے رُسوخ فی العلم اور تفقّہ فی الدین کی بنا پر صدارتِ افتاء تک جا پہنچے جو دارالعلوم کے ممتاز مناصب اور اعلیٰ ترین اعزازات میں شمار کیا جاتا ہے، اور ممدوحؒ جب یہاں سے پاکستان تشریف لے گئے تو وہاں بیٹھ کر بھی افتاء و تفقّہ پر جتنا کام تن تنہا اُنہوں نے کیا درحقیقت وہ ایک جماعت کا کام تھا جو تنہا ایک فرد نے انجام دیا، حتیٰ کہ اپنی ان خدمات کے بدولت رائے عامہ نے آپ کو ''مفتیٔ اعظم پاکستان'' کا لقب عطا کیا جو یقیناً اُن کے شایانِ شان تھا۔

میری جب کبھی بھی پاکستان حاضری ہوتی تو مفتی صاحبؒ ہمیشہ ملاقات میں پہل فرماتے، اور اپنے قائم کردہ دارالعلوم شرافی میں لے جانا اور علمی جلسے اور مجالس منعقد کرنا ایک لازمی بات تھی، خود اُن جلسوں میں شریک رہتے اور مجھ پر تقریر کا اصرار فرما کر تقریر سنتے اور غیر معمولی طور پر محظوظ محسوس ہوتے تھے۔

یہ تو اپنے راست تعلق کی باتیں تھیں جو سینے میں محفوظ اور سینے سے سفینے پر

قلم برداشتہ آگئیں۔ لیکن حضرت مفتی صاحبؒ کا مقام بزرگوں کی نگاہ میں کیا تھا، اس کی نوعیت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ کے اخیر عمر کے فتاویٰ کی ایک خاص تعداد ایسی تھی جن پر وہ نظرِ ثانی نہیں فرما سکے تھے، اُن کی وفات کے بعد حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے اُن کے فتاویٰ پر نظرِ ثانی کے لئے حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ ہی کا انتخاب کیا تھا، اس سے اُن کی دقتِ نظر اور تفقہ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، مفتی صاحبؒ کی انہی خصوصیات نے ہم عمروں میں اُنہیں ایک ممتاز مقام عطا کیا تھا۔

اُن کی زندگی کا آخری شاہکار ''تفسیر معارف القرآن'' ہے، یہ ایک ایسی عظیم و رفیع قرآنی خدمت ہے کہ اگر مفتی صاحبؒ صرف یہی ایک خدمت انجام دیتے تو ان کی عظمت و رفعت اور عنداللہ مقبولیت کے لئے کافی تھا، لیکن اس کے علاوہ ان کی ہر علمی خدمت اپنی جگہ اتنی اہم اور نفع بخش ہے کہ عوام و خواص اس سے مستغنی نہیں رہ سکتے، اور ہر اہلِ علم مفتی صاحبؒ کی علمی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرنے پر مجبور ہے۔

غرض دارالعلوم دیوبند کے مکمل ترجمان، علمائے حق کی سچی نشانی اور خانقاہِ تھانویؒ کے قابلِ فخر نمائندے تھے، ان کی وفات سے نہ صرف پاکستان کے صفِ اوّل کے علمائے دیوبند میں ایک زبردست خلا پیدا ہوگیا بلکہ خود دارالعلوم دیوبند کے لئے یہ ایک ایسا صدمہ ہے جسے وہ بالخصوص ایسے موقع پر شدّت سے محسوس کرتا ہے جبکہ وہ اپنے اجلاس صد سالہ اور تقریبِ دستار بندی کے اہتمام میں مصروف ہے، جس میں مفتی صاحبؒ جیسی شخصیت کی شرکت اجلاس کو چار چاند لگادیتی، حضرت مفتی صاحبؒ کو بھی اس اجلاس کا بہت انتظار تھا اور بڑے شوق و جذبے سے اس میں شرکت کے لئے آمادہ تھے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی جدائی کا قلق تو یقیناً مرتے دَم تک رہے گا، البتہ جو بات قابلِ رشک اور لائقِ اطمینان ہے وہ یہ کہ حضرت مفتی صاحبؒ نے لائق اَخلاف چھوڑے، بلاشبہ مولانا محمد تقی عثمانی اور مولانا محمد رفیع و اِخوانہم سلّمہم اللہ، مفتی صاحبؒ

کے زندہ کارنامے ہیں جو ''اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِّأَبِیْہِ'' کے صحیح مصداق ہیں، جنھیں مفتی صاحبؒ نے اپنی نسبی جانشینی کے ساتھ علمی وراثت بھی بجاطور پر اس طرح منتقل فرمائی کہ اِن شاء اللہ حضرت مفتی صاحبؒ کی خدمات کا شجرِ طوبیٰ زیادہ سے زیادہ برگ و بار لائے گا اور اَربابِ علم وفضل اُس کی گھنی چھاؤں سے برابر مستفید ہوتے رہیں گے۔

احقر اس وقت بیرونی سفر کے لئے پابرکاب ہے، حضرت مفتی صاحبؒ کی شخصیت، علم وفضل اور خدمات پر روشنی ڈالنے کا موقع نہیں، دفعۃً ذہن پر جو یادوں کی پرچھائیاں آئیں، وہ قلم بند کردیں، ورنہ مفتی صاحبؒ کا تذکرہ ''لذیذ بود حکایت دراز ترگفتم'' کا مصداق ہوتا!

رَحِمَہُ اللہُ رَحْمَۃً وَّاسِعَۃً

والسلام

(حضرت مولانا قاری) **محمد طیب** (صاحب مدظلہم)

مہتمم دارالعلوم دیوبند

۲۷؍رجب ۱۳۹۹ھ

(ماہنامہ ''البلاغ'' کراچی ذیقعدہ ۱۳۹۹ھ)

اَحکامِ لباس ... حسنِ اخلاق

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ آج سے دس بارہ برس قبل انگلستان کے دورے پر تشریف لے گئے، آپ گلاسٹر شہر میں بھی قیام پذیر ہوئے، اس دوران حضرتؒ کی کئی مجالس ہوئیں جن میں سے ایک مجلس کی ٹیپ ہمیں مل گئی جسے درجِ ذیل کیا جا رہا ہے۔

۱- حضرتؒ سے کسی نے پوچھا کہ مسجد کے اِمام کے لئے شریعت نے کوئی خاص کپڑا پہننے کا حکم فرمایا ہے کہ اُسے پہن کر ہی نماز پڑھائے؟ حضرت حکیم الاسلامؒ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ:-

شریعت نے حدود بتلائی ہیں وضع قطع، اس پر بحث نہیں کی کیونکہ وہ ہر ملک کی الگ الگ ہوتی ہے، کہیں لمبا کُرتا ہے، کہیں قمیص ہے، کہیں چھوٹا کُرتا ہے، ملکوں کے اپنے حالات ہیں، تو کپڑوں کی جنس کے بارے میں تو بتلایا کہ ریشم کے سوا اور کپڑے پہننے کی اجازت ہے، البتہ ہر کپڑے میں کچھ حدود بتلا دی ہیں، مثلاً یہ کہ ٹخنوں سے نیچا نہ ہو، پاجامہ یا لنگی یہ ٹخنوں سے نیچی نہ ہو، اس کی ممانعت فرما ءگئی ہے، اسی طرح اِسبال یعنی اتنا لمبا پاجامہ پہنے کہ وہ زمین پر لگتا رہے یہ علامت کبر کی ہوتی ہے، عموماً متکبروں کا لباس ہوتا ہے، جیسے کہ بادشاہوں کے جبے کہ بادشاہ کدھر ہے اور اُس کا جبہ کدھر ہے، یہ شرعاً ممنوع ہے، یا مثلاً کُرتے کی آستین اتنی بڑی بن جائے کہ ہاتھ چھپ جائے، پھر بھی کپڑا فُٹ بھر آگے ہے، اس سے روکا ہے شریعت نے کہ یہ اِسراف ہے، فضول خرچی ہے۔ تو اس قسم کی حدود تو بتلا دیں، لیکن کوئی خاص وضع قطع یہ نہیں ہے۔

اب حضراتِ صحابہؓ میں اُون کا لباس پہننے والے بھی تھے، سوت کا بھی پہنتے تھے، بعض کتان کا بھی پہنتے تھے، حسبِ حیثیت اُن کا لباس ہوتا تھا، شریعت کا تو حکم یہ ہے کہ اوّل تو کپڑا پاک رہے، ناپاک کپڑے سے نماز نہیں ہوتی، قرآنِ کریم میں فرمایا گیا: ”وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ“ تو صفائی ستھرائی یہ بتلائی گئی، پھر بتلایا کہ زیادہ نیچا کپڑا نہ ہو کہ ٹخنوں سے بھی آگے نکل جائے۔

حدیث میں ہے کہ جب فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ زخمی ہوگئے، وفات ہونے والی ہے تو لوگ عیادت، مزاج پُرسی کے لئے بکثرت آرہے تھے، ایک نوجوان بھی آیا، اس نے مزاج پوچھا، آپؓ نے جواب دیا، جب وہ جانے لگا تو فرمایا: اس جوان کو بلاؤ، واپس آیا، اس کے کپڑے زمین پر گھسٹتے جارہے تھے، آپؓ نے ارشاد فرمایا:-

يا فتى! ارفع ازارک فانه انقى لثوبک واتقى لربّک.

ترجمہ:- اے نوجوان! کپڑے کو اُونچا کرکے پہن، کیونکہ یہ تیرے کپڑوں کے لئے صفائی کا باعث بھی ہوگا اور جتنا ٹخنوں سے اُوپر ہوگا اتنا تقویٰ پیدا ہوگا، پروردگار کا خوف پیدا ہوگا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قلب کے اُوپر لباس کا بھی اثر پڑتا ہے، اگر لباس کوئی بُری وضع کا ہوا تو بُرے اثرات پڑیں گے، اچھی وضع کا ہوا تو اچھے اثرات آئیں گے، لباس کا خاص اثر دِل کے اُوپر پڑتا ہے اور دِل میں تبدیلی پیدا ہوجاتی ہے۔ کوئی شخص عورتوں کا سا لباس پہن لے تو چند دن کے بعد اس کے دِل میں جذبات بھی نسوانی پیدا ہوں گے، اس کا جی چاہے گا کہ بولوں بھی عورتوں کی طرح، چلوں بھی عورتوں کی طرح، یہ اس لباس کا اثر ہوگا۔ اگر کسی نے درویشوں کا سا لباس پہن لیا تو زُہد وقناعت کے اثرات پیدا ہوں گے، اور علماء کا سا لباس پہن لیا تو وَرَع وتقویٰ کے اثرات ہوں گے، اور آزاد لوگوں کا سا لباس پہن لیا تو وہی شوخی، بے باکی، بے خوفی دِل میں پیدا ہوگی۔ تو لباس کا اثر پڑتا ہے قلب پر اور اخلاق میں تغیر تبدل پیدا ہوتا ہے،

اس لئے شریعت نے حدود قائم کر دیں کہ نہ اتنا لمبا ہو کہ زمین پر لگے، نہ اتنا اُونچا ہو کہ وہ رانوں تک آ جائے، اس میں بھی ستر باقی نہیں رہتا، درمیانی چال چلنی چاہئے۔

مگر پھر بھی کوئی وضع کا لباس نہیں کہ ایسی قمیص ہو، ایسا اچکن ہو، ہر زمانے میں یہ چیز بدلتی رہتی ہے، کل تک لوگ اچکن پہنتے تھے، اب لوگ شیروانی پہننے لگے، کوٹ پہنتے ہیں، یہ وضع قطع ہر دور میں، ہر قوم میں، ہر ملک میں الگ الگ ہوتی ہے، اس پر پابندی شریعت نے عائد نہیں کی، صرف یہ کہا ہے کہ لباس ایسا ہو کہ وہ آزاد قسم کے لوگوں کے مشابہ نہ ہو جائے کہ جنھیں نہ دِین کی فکر نہ اس کا خیال، رات دن وہ لباس ہی کے خراش تراش میں لگے رہتے ہیں، بس یہ نہ ہو، جنس متعین کر دی کہ ریشم نہ ہو، پھر یہ بتلا دیا کہ نہ اتنا باریک کپڑا پہنو کہ اس میں سے بدن نظر آئے اور لوگوں کی نگاہیں اس پر پڑیں، نہ اتنا موٹا ہو کہ ٹاٹ پہن کر ہی آ جائے کہ ہم بھی فقراء ہیں۔

نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن لبسة الشهرتين.

ترجمہ:- منع فرمایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لباس سے کہ وہ شہرتیں پیدا کرے۔

یعنی اتنا اعلیٰ لباس ہو کہ لوگ دیکھیں کہ عجیب وغریب لباس ہے، اس میں تو کبر پیدا ہوگا اور دُوسروں کا دِل ٹوٹے گا، یا درویشوں کی طرح ٹاٹ پہن کر آ جائے کہ نگاہیں اُٹھیں گی کہ بڑے زاہد و عابد ہیں، اس قسم کی شہرت والا لباس شریعت نے پسند نہیں کیا۔

۲- حضرت حکیم الاسلامؒ سے پوچھا گیا کہ ٹائی پہن کر نماز پڑھنا کیسا ہے؟ لوگ کہتے ہیں کہ یہ "من تشبّه بقومٍ فهو منهم" میں داخل ہے۔

حضرتؒ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ:-

بھائی کوٹ ہو یا ٹائی، تشبّہ کا تعلق ہے عرفِ عام سے، اگر کوئی چیز کسی کافر قوم سے مخصوص ہو کہ وہ چیز دیکھ کر یہ سمجھ میں آئے کہ یہ فلاں قوم کا ہے، وہ تو ہے

ممنوع، لیکن جب وہ اتنی عام ہوجائے کہ مسلم، غیر مسلم سب میں پھیل جائے تو پھر تشبّہ کے مد میں ممنوع نہیں رہے گا، اب اگر آپ روکیں گے تقویٰ کی وجہ سے کہ یہ صالحین کا لباس نہیں ہے تو یہ اخلاقی چیز ہے۔ پھر یہ ٹائی کچھ انگریزوں کے ساتھ مخصوص نہیں، انگریز ہو یا غیر انگریز ہندوستانی، پاکستانی، عربی سب اسے باندھتے ہیں، تو تشبّہ کے مد میں اسے منع نہیں کرسکتے، ہاں! کوئی اور خرابی ہو تو وہ دُوسری بات ہے۔

۳- حضرت حکیم الاسلامؒ سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی غیر مسلم ہماری مسجد میں آنا چاہے تو ہم اُسے اندر داخل ہونے دیں یا دُور کردیں؟

آپؒ نے ارشاد فرمایا کہ:-

نفرت کا اظہار نہیں کرنا چاہئے، یہ نہیں ہے اسلام میں، آپ اپنی بات اس کے دِل میں اسی وقت ڈال سکیں گے جب اُسے کچھ مانوس کرلیں گے، اگر نفرت دِکھا کر اَچھوت بنادیا تو وہ آپ کی بات ہی کیوں سنے گا؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذ بن جبل اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کو یمن بھیجا تو ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو تو گورنر بنادیا اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو چیف جسٹس قاضی القضاۃ بنایا، اور نصیحت یہ فرمائی کہ وہاں زیادہ تر رعایا ملے گی عیسائی، تو فرمایا: ''بشرا ولا تنفرا'' بشارت سنانا، نفرتیں مت دِلانا۔ ''ویسرا ولا تعسرا'' اُن کے سامنے آسان دِین پیش کرنا، مشکلات میں اُنہیں مبتلا نہ کرنا، اور فرمایا کہ مل کر رہنا، اختلاف ونزاع مت کرنا۔ اس لئے کہ اگر نزاع اور نفرت پیدا ہوئی تو آپ کا کلمۂ حق وہ کبھی نہیں سنیں گے، اور اگر مانوس کرلیا اپنے سے، کلمۂ حق آپ سنائیں گے تو کچھ اثر پڑے گا اُن کے دِل پر۔ تو غرض اسلام نے نفرت کو ختم کردیا ہے، اس واسطے نفرت کا اظہار نہ ہو، دھکے نہ ہوں، بلکہ اُسے غنیمت جاننا چاہئے، وہ آئے ہیں تو انہیں آہستہ آہستہ صحیح مسئلہ بتادینا چاہئے، کلمۂ حق ڈالیں ان کے قلب میں۔

ہم ایک دفعہ سندھ گئے، یہ انقلاب سے ایک سال پہلے کی بات ہے، وہاں

جلسہ تھا، ہمیں بنادیا گیا اس کا صدر، ہم نے خطبۂ صدارت پڑھا، مشترکہ جلسہ تھا، ہندو بھی بہت آئے ہوئے تھے، ہم نے جب خطبہ پڑھا تو اُن پر کچھ اثر ہوا، بعد میں دو تین ہندو سیٹھ آئے، اور مجھے کہا کہ ہم آپ کی چائے کی دعوت کریں گے تو آپ مان لیں گے؟ میں کہا: ضرور مان لیں گے، اُنہوں نے چائے کی دعوت کی، دس پندرہ آدمی تھے، ہم وہاں پہنچے، پہنچنے میں دیر ہوگئی، عین مغرب کا وقت ہوگیا، ہم جب وہاں پہنچے تو ہندو سیٹھ کہنے لگے کہ آپ کے دِل میں کچھ فکر اور پریشانی ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ نماز کی وجہ سے ہوگی، میں نے کہا: آپ نے بالکل صحیح سمجھا، مغرب کا وقت آچکا ہے، اس نے کہا کہ یہاں مسجد تو ہے نہیں، دو چار میل دُور پر ہے، اگر آپ ہمارے گھر میں نماز پڑھ سکیں تو پڑھ لیں، ہم نے کہا: بھائی! ہمارے لئے تو دُنیا کی ساری زمین مسجد بنادی گئی ہے، ہر جگہ پڑھ سکتے ہیں۔ تو بھائی پھر کیا تھا، وہ ہمارے لئے لوٹوں میں پانی بھر بھر کر لے آئے، ان کے لڑکے لڑکیاں نوکر اور پھر سفید چادریں لے کر آئے اور ہمیں بتلایا کہ آپ لوگوں کا قبلہ اس طرف ہے، خیر ہم نے اذان دی، نماز پڑھی، جب ہم نماز پڑھنے کھڑے ہوئے تو اُن کے مرد، عورت، بچے، نوکر سب ہاتھ باندھ کر اَدب کے ساتھ کھڑے ہوگئے کونے میں، اور جو حرکت ہم نے کی وہ اُنہوں نے بھی کی، جب نماز سے فارغ ہوگئے تو وہ سیٹھ کہنے لگے کہ صاحب! ہماری ایسی قسمت کہاں تھی کہ آپ لوگ ہمارے گھر میں آئیں، یہاں آپ نے خدا کا نام لیا، اس کے بعد انہوں نے کہا کہ ہمیں کچھ نصیحت کردو، ہم نے کچھ نصیحت کردی۔ تو وہ ہمارے پاس آئے تو نصیحت کی، اگر ہم اُن سے نفرت کرتے تو نصیحت کا کیا سوال ہوتا۔

اسلام نے نفرت کی جڑ مٹادی، البتہ یہ کہا کہ جو بھی آئے تم اپنا فریضہ مت بھولو، اور وہ ہے دعوت الی اللہ، اللہ کی طرف بلاتے رہو، یہ ہے۔

(ماہنامہ ''الخیر'' ملتان)

پیغام ہدایت نظام

شادی اور نکاح سنتِ انبیاء علیہم السلام ہے، اور اسے اسلام نے صرف معاملے کی حد تک محدود نہیں رکھا، بلکہ عبادات کے زُمرے میں شمار کیا، اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

النکاحُ نِصفُ الدِّین فلیتق اللہ فی النصف الباقی۔

ترجمہ:- نکاح آدھا دِین ہے، آدمی کو چاہئے کہ بقیہ آدھا دین تقویٰ اور طہارت سے حاصل کرے۔

نکاح ہی ہے جس کے ذریعہ عفت، پاک دامنی اور خیال کی پاکیزگی حاصل ہوتی ہے، آدمی حرام سے بچتا ہے، اور حلال کے دائرے میں محدود رہتا ہے، نکاح ہی ہے جس کے ذریعہ اتحادِ باہمی اور قبائل اور خاندانوں کے باہمی تعاون کی بنیاد پڑتی ہے، کتنے ہی اجنبی باہم مربوط ہوجاتے ہیں اور پہلے سے بیگانے ہوں تو یگانگت بڑھ جاتی ہے اور باہمی حقوق قائم ہوجاتے ہیں، اسی لئے حق تعالیٰ شانہ نے جہاں آبائی اور جدّی نسب کو محلِ نعمت میں شمار فرمایا، وہیں صہری اور سسرالی رشتے کو بھی نعمت ظاہر فرمایا، ارشادِ خداوندی ہے:-

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا۔

(الفرقان:۵۴)

ترجمہ:- اور اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے ایک قطرۂ پانی سے بشر کو پیدا کیا اور پھر اس کے لئے نسبِ آبائی اور سسرالی رشتہ پیدا فرمایا۔

پس جیسے نسب کو نعمت ظاہر فرما کر بشر پر اپنا احسان جتایا کہ یہ نعمت اس کے سوا کوئی دُوسرا نہیں دے سکتا ایسے ہی سسرالی رشتے کو بھی نعمت ظاہر فرمایا کہ اجنبی دِلوں کو اس طرح باہم ملا دینا بھی اسی کا کام ہے جو کسی مخلوق کے بس کی بات نہیں۔ اسی لئے حق تعالیٰ نے نکاح کی غرض و غایت ظاہر فرماتے ہوئے اسے اپنی قدرت کی نشانی اور آیت قرار دیا۔

کیا یہ قدرت ہی کا کرشمہ نہیں کہ نکاح سے ایک منٹ پہلے مرد و عورت باہم اجنبی ہیں اور ایک دُوسرے کے دُکھ درد کو بعینہٖ اپنا دُکھ درد نہیں سمجھتے، اگر کبھی اجنبی عورت کسی تکلیف میں مبتلا ہوجائے تو سوائے عام انسانی ہمدردی کے آدمی اس کی کوئی خاص ٹیس اور چبھن اپنے دِل میں اس طرح محسوس نہیں کرتا کہ بے چین ہوجائے اور اپنے دُکھ درد کو بھول جائے، لیکن نکاح سے ایک منٹ بعد اگر عورت کے دُکھ درد کی بات اس کے کان میں پڑجائے تو وہ متفکر، پریشان اور بے چینی کا شکار ہوجاتا ہے اور اپنے دُکھ درد کو بھول کر منکوحہ کے دُکھ درد کے مداوے میں مستغرق ہوجاتا ہے، یہی صورت عورت کی بھی ہے، یہ دِلوں کا ملاپ اور قلوب کی وحدت کیا محض قدرت ہی کا کرشمہ نہیں کہ دِلوں کی دُنیا بیک دم بدل ڈالی اور جانبین کے دِلوں میں انقلابِ عظیم رُونما فرمادیا، اس لئے اگر اسے آیت اور نشانی فرمایا گیا ہے تو وہ ایک حقیقتِ واقعی ہے محض کوئی نظریہ نہیں۔ ظاہر ہے کہ دو کا یہ ملاپ فریقین کے متعلقین کا بھی قدرتی ملاپ ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ لڑکی والے لڑکے والے کے، اور لڑکے والے لڑکی والے کے دُکھ درد میں شریک نہ ہوں اور باہم یگانگت محسوس نہ کریں، اس لئے نکاح جیسے خود ایک آیت اور قدرت کے کرشموں کی ایک عظیم نشانی ہے ایسے ہی وہ باہمی اتحاد و یگانگت کا بھی ایک معجزانہ وسیلہ ہے۔ اس طرح حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد نکاح فرماکر قبائل کو اپنے ساتھ ملایا، باہم شیر و شکر فرمایا اور اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نکاح کے تعلق کی پختگی اور مضبوطی کا اہتمام تھا، طلاق جو قاطعِ نکاح ہے،

باوجود جائز ہونے کے عنداللہ اس کو مبغوض قرار دیا، چنانچہ فرمایا: ''أَبْغَضُ الْمُبَاحَاتِ عِنْدَ اللہِ الطَّلَاقُ'' جائز چیزوں میں سب سے زیادہ عداوت خدائے تعالیٰ کو طلاق سے ہے، کیونکہ یہ قاطعِ نکاح ہے، نکاح جو ذریعۂ اتحاد و وحدت ہے، تو طلاق قاطعِ اتحاد و ملاپ بھی ہے، درآنحالیکہ انبیاء علیہم السلام کا مقصدِ وحید توحید کے ساتھ اتحادِ باہمی بھی ہے کہ ٹوٹے ہوئے دِلوں کو جوڑ دیا جائے اور بچھڑے ہوؤں کو ملا دیا جائے، اور خدا سے ٹوٹے ہوئے دِل کو خدا کے ساتھ جوڑ دیا جائے، اس لئے وہ نکاح کے تعلق میں کسی ادنیٰ اختلال کو بھی کیسے گوارا فرماسکتے تھے؟ البتہ نکاحی تعلق مضبوط سے مضبوط اور ذریعۂ اتحاد بنانے کا جو راستہ شریعتِ الٰہی نے طے فرمادیا وہ بنیادی طور پر دو چیزیں ہیں، ایک شفقت، ایک اطاعت، جس سے معاشرے کی گاڑی چلتی ہے۔

خاوندوں کو تو حکم دیا کہ وہ بیوی کے ساتھ انتہائی شفقت اور دِل داری سے پیش آئیں اور نرم اخلاق سے اس کے دِل کو موہ لینے کی سعی میں لگے رہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ:-

انَّ أكرمكم المؤمنين أحسنكم أخلاقًا وألطفكم أهلًا.

(یعنی) تم میں سب سے زیادہ قابلِ تکریم وہ مسلمان ہے جس کے اَخلاق پاکیزہ ہوں اور بیوی کے ساتھ لطف و مدارات کا برتاؤ کرتا ہو۔

حتیٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کھانا کھاتے وقت اپنے ہاتھ سے بیوی کے منہ میں لقمہ دے دینا بھی صدقہ کے حکم میں ہے، جس پر اَجر دیا جاتا ہے اور اسے عبادت شمار کیا جاتا ہے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ازواجِ مطہراتؓ کے ساتھ انتہائی ملاطفت اور دِل جوئی کا عمل فرمات تھے، اس لئے بیویوں کے ساتھ دِل جوئی اور ان پر لطف و کرم اور شفقت و محبت کے برتاؤ سے جہاں نکاح کی حقیقی غرض و غایت نکلتی ہے وہیں اس سے قلوب میں سکون اور باہمی مودّت اور اتحاد پیدا ہوتا ہے،

ارشادِ باری ہے:-

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً. الآية. (الروم:۲۱)

ترجمہ:- اور اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تم میں سے تمہارے جوڑے بنائے تا کہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور تم میں آپس میں مودّت اور رحمت پیدا ہو، بلاشبہ اس میں فکر کرنے والوں کے لئے قدرت کی نشانیاں ہیں (کہ بے تعلق قلوب میں وہ کس طرح اچانک تعلقِ خاص بلکہ محبتِ باہمی کا علاقہ قائم فرمادیتا ہے)۔

اور یہ اس لئے کہ بیوی خاوند کی وجہ سے اپنے گھربار، ماں باپ، اپنے عزیز و اقارب کو چھوڑ چھاڑ کر خاوند کے گھر آتی ہے کہ اس کی بن کر رہے، اگر وہ بھی ملاطفت اور شفقت سے دست کش ہوجائے اور اس کے ساتھ بے رحمی اور ایذا رسانی کا برتاؤ کرے تو یہ غریب عورت کہاں جائے؟ نہ اِدھر کی رہے گی نہ اُدھر کی، اپنے عزیز تو خاوند کی وجہ سے چھوٹے اور خاوند بھی اپنا نہ ہوا تو اس غریب کا ٹھکانہ ہی کیا باقی رہا سوائے اس کے کہ غم میں گھل گھل کر اپنی زندگی ختم کردے۔

ادھر بیویوں کو حکم دیا گیا کہ وہ خاوند کی اطاعت اور اِتباع میں سرگرمی دِکھلائیں اور کوئی حرکت ایسی نہ کریں جس سے خاوند کا دِل ٹوٹے اور وہ بیوی سے بیزار ہوجائے، جس سے اس تعلق کی غرض و غایت ہی فوت ہوجائے، جیسے بدمزاجی، دُرشت کلامی، سرکشی اور نافرمانی اور شوہر کے مال میں خیانت یا مال کو بجائے شوہر کے گھربار پر خرچ کرنے کے اس کی اجازت کے بغیر اپنے میکے پر صَرف کرنے لگے، جو بلاشبہ خیانت ہوگی اور خاوند کے لئے بددِلی اور بیزاری کا باعث ہوگا، جس سے یقیناً اس تعلق کی خوشگواری اور آخر کار نفسِ تعلق ہی کی بقاء میں خلل پڑجائے گا، جس کے

اثرات پورے گھرانے پر پڑنا قدرتی اَمر ہے، اسی بنا پر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ انتہائی بات فرمادی کہ اگر میں غیر اللہ کے لئے کسی کو سجدے کا حکم دیتا تو بیویوں کو حکم دیتا کہ وہ شوہروں کو سجدہ کیا کریں، چونکہ غیر اللہ کو سجدہ کرنا شرک اور قطعی حرام ہے اس لئے یہ اَمر نہیں کیا، مگر اس سے اطاعتِ شوہر کی انتہائی تاکید برآمد ہوتی ہے کہ حرام اطاعت کے سوائے کوئی بھی اطاعت ایسی نہیں ہے جس کے لئے بیوی مأمور نہ ہو، اسی لئے احادیث میں فرمایا کہ: اگر شب میں بیوی خاوند کے ساتھ سرکشی برتتی ہے تو تمام ملائکہ اس پر لعنت کرتے ہیں، یہی صورت دن کی بھی ہوتی ہے۔

بہرحال یہ دو ہی باتیں اطاعتِ شوہر، ملاطفتِ زوجہ وہ ہیں جن کے بغیر زندگی آگے نہیں بڑھ سکتی، ان دونوں باتوں کا تعلق کسی ظاہری نمائش یا زینت پر نہیں رکھا گیا بلکہ ایک ایسی حقیقت پر رکھا گیا جو لافانی اور جاودانی ہے، مثلاً اگر خاوند کی ملاطفت کا تعلق عورت کے ظاہری حسن و جمال، مال و دولت اور عرض و وجاہت و عزّت سے ہے تو یہ تمام چیزیں دُنیا ہی میں پائیدار نہیں ہیں چہ جائیکہ آخرت میں کارآمد و نافع ثابت ہوں، اس لئے کہ جب یہ کم یا گم ہوں تو شوہر کی ملاطفت ختم ہوجائے گی اور تعلقات میں کشیدگی بلکہ آخرکار انقطاعِ تعلق تک نوبت پہنچے گی، اور اگر اس تعلق کی بنیاد عورت کی دِین داری پر رکھی جائے تو دِین سدابہار اور دُنیا کے بعد آخرت تک ساتھ جانے والا ہے، اس لئے اس پر مبنی شدہ تعلق بھی دائمی اور مضبوط اور خوشگوار رہے گا، جس میں کوئی عارضی چیز خلل انداز نہ ہوگی، اس لئے حدیثِ نبوی میں ان اُمور کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ:-

تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ لِأَرْبَعٍ لِمَالِهَا وَلِجَمَالِهَا وَلِحَسَبِهَا وَلِدِيْنِهَا فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّيْنِ.

ترجمہ:- عورت سے نکاح (بظاہر اسباب) چار وجوہ سے کیا جاتا ہے، اس کے مال دار ہونے کی وجہ سے، اس کے خوبصورت

ہونے کی وجہ سے، اس کی عرفی عزّت و وجاہت کی وجہ سے، اس
کی دِین داری کی وجہ سے، سوتم ان تمام اُمور میں دِین داری کو
ترجیح دو۔

ظاہر ہے کہ مال و جمال اور عرفی حیثیت آنی جانی چیزیں ہیں، اگر بیوی پر لطف وشفقت ان کی بنا پر ہے تو اوّل تو یہ لطف وشفقت نہیں بلکہ خودغرضی ہے اور جس حد تک ہے بھی تو اس کے زوال سے تعلق زائل ہوجائے گا اور گھریلو زندگی میں ناچاقی اور بیزاری رُونما ہوجائے گی جس سے گھر کے تباہ ہونے کی صورت پیدا ہوگی، لیکن اگر نکاح کا مبنیٰ عورت کی دِین داری ہے جو خاوند کے بھی دِین دار ہونے کی کھلی علامت ہے اور لطف وشفقت اس بناء پر ہوگا تو اس کی بنیاد خوفِ خدا پر ہوگی اور آدمی محسوس کرے گا کہ جب خدا نے اسے میرے ذمہ لگادیا تو حسبِ اَوامرِ خداوندی اس کے ساتھ لطف وکرم کا برتاؤ کروں، خواہ وہ حسین وجمیل ہو یا نہ ہو، مال دار ہو یا نہ ہو، صاحبِ جاہ ومنزلت ہو یا نہ ہو۔

ظاہر ہے کہ اس جذبے سے یہ ملاطفت وشفقت عین دِین ہوگی اور مرتے دَم تک قائم رہے گی، ہاں! اگرحق تعالیٰ دِین داری کے ساتھ ساتھ حسن و جمال، مال و منال بھی جمع فرمادیں تو یہ سونے پر سہاگہ ہے، لیکن یہ اُمور تعلق کی بنیاد بنانے کے قابل نہیں ہیں، کیونکہ ہرآن قابلِ زوال و اختلال ہیں، بہرحال نکاح کے تعلق میں پختگی اور پائیداری ان دو ہی اُمور سے آتی ہے، شوہر کی اطاعت اور زوجہ کی دِل داری۔

دُوسری بات یہ بھی پیشِ نظر رہنی چاہئے کہ زوجہ کوئی باندی نہیں ہوتی، بلکہ شریکِ حیات اور رفیقۂ زندگی ہوتی ہے، اس لئے اس کے ساتھ اُونچ نیچ کا برتاؤ کسی طرح بھی جائز نہیں، وہ قابلِ احترام بنائی گئی ہے نہ کہ موردِ تذلیل و اہانت، چنانچہ عرب ممالک میں آج بھی اگر عورت سامنے آجائے تو "حُرمة" کہہ کر لوگ توقیر کے ساتھ اسے راستہ دیتے ہیں، نیز اگر اس کی حرمت وعزّت باقی نہ رہے تو گھر والے

بلکہ اولاد تک بھی اس کی عزّت نہیں کر سکتے، اس لئے شریعت نے جہاں مرد کو عورت پر حقوق دیئے ہیں اسی طرح عورت کو بھی مرد پر حقوق دیئے تا کہ وہ معاشرے میں باعزّت رہیں، چنانچہ قرآن حکیم نے ارشاد فرمایا: "وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ" اور عورتوں کے بھی حقوق (مرد پر) اسی طرح ہیں جس طرح (مرد کے حقوق) عورت پر ہیں۔

مثلاً اگر مرد کو طلاق کا حق دیا گیا ہے تو عورت کو بھی خلع کا حق سونپا گیا ہے، اگر نزاعِ باہمی ہے تو مرد اور عورت دونوں کو اپنے اپنے افراد کو حَکَم منتخب کرنے کا برابری کے ساتھ حق دیا گیا ہے، جو اس کی واضح دلیل ہے کہ عورت کو لاوارث بنا کر مرد کے سپرد نہیں کیا جاتا بلکہ باعزّت اور باحقوق بنا کر دیا جاتا ہے، پس اگر بیوی کو اطاعت کا ذمہ داری بنایا گیا ہے تو مرد کو دِل داری کا۔ تو یہ دونوں کے منصب کا تقاضا ہے، کوئی اُونچ نیچ پیشِ نظر نہیں۔ خلاصہ یہ کہ معاشرتی مساوات کے ساتھ شوہر کی شفقت و اعانت اور زوجہ کی فرماں برداری ہی سے گھریلو زندگی کا گاڑی رواں دواں ہوسکتی ہے، جس کا اسلام نے راستہ بتلادیا ہے کہ وہ دِین اور دِینی جذبات کی پاسداری اور شرعی معاشرے کی پابندی کے سوا دُوسرا نہیں ہے، اس لئے شوہر اور زوجہ کے مطالعے میں ایسی کتابیں رہنی چاہئیں جن میں زوجیت کے حقوق اور اسلامی معاشرہ، رہن سہن اور باہمی تعلقات کے خوشگواری کے طریقے واضح ہوں اور وہ بکثرت شائع شدہ ہیں، جیسے حضرت تھانویؒ کی بہشتی زیور یا حقوق الزوجین، یا حقوق المعاشرہ وغیرہ وغیرہ۔ اُمید کہ احقر کی شرکت و حاضریٔ نکاح سے یہ پیغام زیادہ نافع ہوگا، شرکت وقتی چیز رہتی ہے اور یہ دوامی دستور العمل ہوگا، واللہ الموفق وھو المستعان۔

(ماہنامہ "دارالعلوم" دیوبند جون ۱۹۷۵ء)

آج ہر جگہ مسلمان مار کیوں کھا رہا ہے؟

آج لوگ شکایت کرتے ہیں مختلف اَقوام کی کہ دُنیا کی قومیں ہم پر ظلم کر رہی ہیں، عیسائیوں نے یہ ظلم کیا، ہندوؤں نے یہ ظلم کیا، مکان جلادیئے، جانیں تلف کردیں۔ میں کہتا ہوں، یہ شکوہ غلط ہے، کسی نے آپ کونہیں مارا پیٹا، آپ نے خود اپنے نفس کے اُوپر ظلم کیا، اس واسطے کہ آپ جس چیز سے زندہ تھے وہ رُوحِ قرآنی، روحِ ایمانی، جب وہ رُوح آپ نے مضمحل کردی، ختم کردی تو لاشہ بن گئے تو ہر قوم کا فرض ہے کہ لاش کو دفن کردے، جلادے، اگر وہ پڑی رہ جائے گی تو بدبو پھیلے گی، دُنیا میں تعفن پھیلے گا، صحتیں خراب ہوجائیں گی، تو اگر لاشے کو کوئی قوم جلادے، ماردے تو شکوہ کیوں ہے؟ صورت اس کی یہ ہے کہ رُوح پیدا کرو، زندہ پر حملہ کرنے کی کسی کو جرأت نہیں ہوسکتی، لاش پڑی ہوئی ہوگی جس کا جی چاہے گا حملہ کردے گا، تو آپ لاش کی طرح بن گئے ہیں، پھر اگر کوئی جلادی تو روتے کیوں ہیں آپ؟ کوئی اگر ماردے تو روتے کیوں ہیں آپ؟ آپ اپنے اندر رُوح پیدا کیجئے، جب جاندار بنیں گے کسی کو مجال نہیں کہ ترچھی آنکھ سے دیکھ بھی سکے آپ کو، اگر آپ کے اندر کچھ نہ ہو جس کا جو چاہے کرے۔ گیند تو آپ نے دیکھی ہوگی، جب اس میں ہوا بھری ہوئی ہوتی ہے اگر اُسے زمین پہ دے کے مارتے ہیں تو دس گز اُوپر جاتی ہے، وہ گیند کی طاقت نہیں وہ ہوا کی طاقت ہے جو اس کے اندر بھری ہوئی ہے، ہوا آپ چبھا کر نکال دیں، جہاں گیند کو دے کے ماریں گے پھس سے وہیں ہوکر رہ جائے گی، نہ اُوپر اُچھلے گی نہ کچھ، تو ہوا آپ میں بھری ہوئی تھی قرآن وحدیث کی، ایمانی رُوح کی، جب اسے آپ نکال

دیں گے جس کا جہاں جی چاہے پٹخ دے وہیں پڑے رہ جائیں گے آپ، اور اگر وہ ہے اندر، اگر کوئی پٹخ بھی دے گا تو دس گز جائیں گے اُوپر آپ گدا کھا کے اور اسے پھر ڈرنا پڑے گا آپ سے، تو آپ دُوسروں کی مذمت نہ کریں اپنی رُوح کو دُرست کرلیں، اپنے اندر زندگی پیدا کریں، پھر کسی مجال نہیں کہ نگاہ اُٹھا کے بھی دیکھ سکے۔ وہ یہی رُوح ہے قرآن و حدیث کی، اسی رُوح کو لے کے صحابہؓ چلے تھے تو دُنیا کا نقشہ بدل دیا انہوں نے، آج اس رُوح کو ہم نے نکال دیا تو دُنیا نے ہمارا نقشہ بدل دیا، یہ فرق ہے۔ تو ایسے بنئے کہ دُنیا کو آپ بدل دیں، اکبر نے کہا ہے نا ۔

کیا ہوا آج جو بدلا ہے زمانے نے تجھے

مرد وہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں

تو مرد بننا چاہئے نہ کہ زنخان بن جائے آدمی، نہ کہ عورت بن جائے آدمی، تو زمانے کو بدلنے کی کوشش کیجئے نہ کہ زمانے کی رَو میں بہنے کی۔ آپ کوشش کریں وہ جب ہی ہوگا، جب قوتِ ایمانی، قوتِ رُوحانی، قوتِ قرآنی آپ کے اندر موجود ہوگی تو پھر کسی کی مجال نہیں کہ نگاہ بھر کے بھی دیکھ سکے، بلکہ آپ کی نگاہوں کو دیکھیں گے لوگ۔

یہی یہود و نصاریٰ تھے آج سے بارہ سو برس پہلے جو خود آتے تھے کہ ہم آپ کی حکومت چاہتے ہیں، ہم آپ کے زیرِ قدم رہنا چاہتے ہیں، آج وہ آپ کو رعایا بنانے کے لئے بھی تیار نہیں۔ فرق وہی ہے کہ اس وقت رُوح موجود تھی، آج اس رُوح کو آپ نے کردیا مضمحل تو غلام بنانے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں تو میں آپ کو، یہ فرق ہے۔

مجھے واقعہ یاد آیا، مکہ معظمہ میں تھا کہ مولانا سلیم صاحب مرحوم باحیات تھے، تو یہ جو صہیونی انقلاب ہوا اور مصر کے بعض علاقوں پر یہودیوں نے قبضہ کیا اور مسجدِ اقصیٰ بھی ان کے ہاتھ میں چلی گئی، اس کا واقعہ بیان کیا اس شخص نے جو مصر سے آیا تھا کہ جب غزہ پر قبضہ ہوگیا یہودیوں کا تو مسلمان بھاگے وہاں سے کہ کسی طرح مصر

کے علاقے میں پہنچ جائیں، جان بچے، آبرو بچے۔ اس میں ایک عالم بیچارے بوڑھے وہ بھی نکلے بیوی ساتھ، بچے ساتھ، سواری کچھ نہیں، پیدل ہانپتے کانپتے کہ تیس چالیس میل ہے العریش اور وہاں سے مصر (قاہرہ) کی سرحد قریب ہے، میں کسی طرح قاہرہ پہنچ جاؤں، تو قبضہ تو ہو چکا تھا یہودیوں کا، ادھر سے ایک یہودی کمانڈر کی جیپ کار آرہی تھی اور یہ عالم بیچارے بچوں کو اُنگلیاں پکڑے ہوئے جارہے تھے، اسے کچھ رحم آیا ان کے بڑھاپے پر، اس نے جیپ کار روک لی اور اُتر کر پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ انہوں نے نام بتلایا، کہاں جانا چاہتے ہیں؟ کہا کہ قاہرہ، کیوں؟ کیونکہ یہاں بھی بدامنی ہوگئی۔ کہا: آپ کے پاس سواری نہیں؟ کہا: نہیں، سواری کچھ بھی نہیں تو انقلاب ہوگیا یہودیوں کا قبضہ، اس نے کہا کہ مجھے آپ کے بڑھاپے پر رحم آرہا ہے، آپ میری کار میں بیٹھ جائیں میں آپ کو سرحد پر لے جاکر چھوڑ دوں، یہ بیوی بچوں کو ضعفاء کو کہاں آپ لئے پھریں گے، چالیس میل ہے یہاں سے۔ پہلے انہیں شبہ ہوا کہ کہیں یہ بٹھا کے کہیں جاکے پٹخ نہ دے، پھر اس نے یقین دلایا کہ مجھے آپ کے بڑھاپے پر رحم آرہا ہے، آپ یقین کیجئے میں آپ کو پہنچادوں گا۔ یہ بیٹھ گئے بچوں کو بیوی کو لے کر، وہ کیمپ تھا مصریوں کا، اب قبضہ تھا یہودیوں کا اس پر، اس نے ایک خیمے میں لے جاکے انہیں اُتارا کہ آپ تھوڑی دیر دَم لیں، سانس لیں اور میں کچھ کھانا لاتا ہوں، کھاپی لیں، پھر میں آپ کو پہنچادوں گا۔ تو صوفے پر بٹھایا انہیں اور خود بیٹھ گیا وہ یہودی کمانڈر نیچے اور اس نے کہا کہ حضرت عمر سے تو آپ واقف ہوں گے، کہا: واقف کیا، وہ تو صحابی ہیں اور جلیل القدر خلیفۂ نبی ہیں۔ کہا: کیا آپ ان کے کچھ اوصاف بیان کرسکتے ہیں؟ انہوں نے کہا: ہاں، انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فضائل، مناقب، کمالات بیان کرنا شروع کئے، وہ سنتا رہا، اس نے کہا: یہی اوصاف ہیں نا حضرت عمر کے؟ کہا: یہی، کہا: جب یہ اوصاف تھے مسلمانوں میں تو ہم یہودی ان کی جوتیوں کے نیچے تھے، آج آپ کی کیا حالت ہے؟ اس نے کہا کہ جس خانہ میں

میں نے آپ کو بٹھلایا ہے، یہ ایک مصری لیفٹیننٹ کا کمرہ ہے، کل پچیس فوجی اس کے ماتحت ہیں، یہ اس کا خیمہ ہے، شراب کی بوتلیں اس میں سجی ہوئی ہیں، صوفے اس میں لگے ہوئے ہیں، جائز ناجائز عورتیں ان کے ساتھ تھیں، وہ لڑنے کے لئے آئے تھے یہودیوں سے تو یہودی کیوں نہ غالب ہوں ان کے اُوپر، جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اوصاف تھے تو یہودی آپ کی جوتیوں کے نیچے تھے، جب آپ کی یہ حالت ہوئی شراب و کباب کی تو آج آپ کو ہماری جوتیوں کے نیچے ہونا چاہئے، آپ غم کیوں کر رہے ہیں؟ اب یہ چپ تھے عالم، کیا جواب دیں، واقعہ ہے۔ اس نے کہا: بس مجھے یہی بتلانا تھا، اب آپ چلئے میں آپ کو پہنچا دُوں گا۔ اس نے جیپ کار میں بٹھا کے قاہرہ کی سرحد پر لے جاکر چھوڑ دیا اور شکریہ ادا کیا اور اس نے کہا کہ: ہم آپ کے دِین کے مقابلے پر نہیں ہیں، آپ لوگوں کے مقابلے پر ہیں، آپ نہ اپنے دِین کے ہیں، نہ ہمارے دِین کے ہیں، آپ تو شراب و کباب میں مصروف ہیں تو ہم کیوں نہ لڑیں آپ سے؟ کیوں نہ قبضہ کریں آپ کے اُوپر؟

میں نے اس لئے کہا کہ آج وہی یہود و نصاریٰ جو جوتیوں کے نیچے تھے آج وہ آپ کو نصیحت کر رہے ہیں، اتنا انقلاب پیدا ہوگیا، کیا تھے ہم اور کیا ہوگئے، اس حالت کو بدلنے کی ضرورت ہے اور اس کی پہلی بنیاد تعلیم و تربیت ہے کہ علمائے ربانی سے تعلیم پائیں، تدریس کے ذریعے قرآن و سنت کا علم حاصل کریں، اس پر عمل کرنے کی ٹریننگ حاصل کریں، ذوق اور فہم اپنا صحیح کریں، ان کی صحبت و معیت میں رہ کر رنگ پیدا کریں، "صِبْغَةَ اللهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللهِ صِبْغَةً" اللہ کا رنگ اپنے اندر داخل کریں، محض کتاب پڑھ لینا کافی نہیں ہے، اس رنگ کو بھی لینا ضروری ہے کہ قلب کا رستہ بھی صحیح ہو، وہ بغیر مجاہدہ و ریاضت کے دُرست نہیں ہوتا، اس کی ضرورت ہے، یہ مدارس اور جو سچی خانقاہیں ہیں وہ اسی لئے قائم ہیں کہ دِلوں کو بھی دُرست کریں، قوالب کو بھی دُرست کریں۔ یہ کرنا پڑے گا، اور یہ نہیں کریں گے تو پھر اس کے لئے

تیار ہو جائیے کہ ساری دُشمن آپ پر غالب ہوں اور آپ ان کے تحت مغلوب ہوں، آپ آئے تھے غلبہ پانے کے لئے "لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ" تاکہ اللہ کے دِین کو دُنیا کے دِین پر غالب کردیں، جب آپ ہی میں خود وہ دِین نہ ہو تو کاہے کو آپ کو غالب کریں گے؟ اس واسطے عبرت پکڑنے کی ضرورت ہے۔

(حضراتِ صحابہؓ کا مقام اہل السنّت والجماعت کی نظر میں)

(بحوالہ "حق نوائے احتشام" کراچی جون ۲۰۰۲ء)

ختمِ نبوّت
سورۂ کوثر کی روشنی میں!

حضرت موسیٰؑ اور خُلقِ حسن

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی اُمت کو تربیت دی، خلقِ حسن کے اُوپر کہ برابر سرابر معاملہ رکھو، تمہارے ساتھ کوئی ایک پیسے کی نیکی کرے، تم پر واجب ہے کہ تم بھی ایک پیسے کی نیکی کرو، روپے کی کرے تو بھی کرو، کوئی اگر تمہارے ساتھ بُرائی کرے تو تم پر واجب ہے کہ تم بھی بُرائی کرو اتنی، کوئی ہاتھ کاٹ دے، تمہارا فرض ہے تم بھی ہاتھ کاٹ دو، کوئی ناک کاٹ دے تمہاری، تم بھی ناک کاٹو، آنکھ پھوڑ دے، تمہارا فرض ہے کہ ایک آنکھ ضرور پھوڑ دو، تو شریعتِ موسوی میں معاف کرنا جائز نہیں تھا، انتقام لینا واجب تھا، مگر اتنا ہی انتقام جتنا دُوسرے نے بُرائی کی ہے، جس کو قرآنِ کریم میں فرمایا کہ:-

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ. (المائدۃ:۴۵)

ہم نے واجب کردیا تھا اہلِ توراۃ پر کہ نفس کے بدلے میں نفس کو قتل کرو، وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ، کوئی آنکھ پھوڑے تم پر واجب ہے کہ تم بھی آنکھ پھوڑ دو۔ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ کوئی ناک کاٹ لے تو واجب ہے کہ تم بھی ناک کاٹ لو۔ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ

کوئی دانت توڑ دے، تمہارا فرض ہے کہ تم بھی دانت توڑ دو، معاف کرنا جائز نہیں۔
وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ کوئی زخم لگائے، اتنا ہی تم بھی لگاؤ اسے، یہ جائز نہیں ہے کہ
معاف کر کے چھوڑ دو، انتقام واجب ہے۔ یہ تھی توراۃ کی شریعت، تو توراۃ والوں کو
موسیٰ علیہ السلام نے تربیت دی خلقِ حسن کے اُوپر کہ برابر سرابر رکھو معاملہ، نیکی میں
بھی، بدی میں بھی، یہ تو موسیٰ علیہ السلام نے تربیت دی۔

خُلقِ کریم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں خلقِ کریمانہ پر تربیت دی گئی ہے کہ
اگر تمہارے ساتھ کوئی بُرائی کرے تو جائز نہیں ہے کہ تم اس سے بدلہ لو۔ بدلہ لینا
واجب نہیں ہے، معاف کرنا واجب ہے، اگر کوئی تمہارے بائیں گال پر تھپڑ مار دے تو
داہنا بھی اس کے سامنے پیش کر دو کہ ایک اور مارتا چل اللہ تیرا بھلا کرے۔ تو واجب
تھا وہاں معاف کرنا، انتقام لینا جائز نہیں تھا، تو خلقِ کریمانہ پر تربیت دی ہے اُمت کو
حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خُلقِ عظیم

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق سب سے بلند تھے، تو آپ صلی اللہ
علیہ وسلم نے محض معاف کر دینا، محض ایثار کر دینے پر قناعت نہیں کی، بلکہ بُرائی کرنے
والوں کے ساتھ احسان کا برتاؤ کیا، طائف والے گالیاں دے رہے ہیں اور آپ صلی
اللہ علیہ وسلم دُعائیں دے رہے ہیں، انہیں مکہ والے انتہائی ستا رہے ہیں اور آپ صلی
اللہ علیہ وسلم دُعائیں فرما رہے ہیں ان کے واسطے۔ تو یہ محض معاف کرنا نہیں تھا، ایثار
کرنا نہیں تھا بلکہ احسان بھی تھا ساتھ میں کہ بُرائی کا بدلہ احسان س دیا جائے، تو یہ ہے
خُلقِ عظیم۔ تو اس اُمت کو تربیت دی گئی ہے خُلقِ عظیم پر کہ احسان کا برتاؤ کرو۔ دُوسرا
اگر کوئی بُرائی بھی کرے تو محض معاف کرنا نہیں بلکہ دُعائیں کرو کہ اللہ اس کو ہدایت

دے، نیک راستے پر لگائے، تو انتقام لینا تو بجائے خود ہے، معاف کرنا تو بجائے خود ہے، احسان کا برتاؤ بتلایا گیا ہے، جس کو ایک موقع پر قرآنِ کریم میں فرمایا ہے: "فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللهِ لِنْتَ لَهُمْ" اے پیغمبر! وہ رحمت ہے جو ہم نے آپ کے دِل میں کوٹ کوٹ کر بھردی، اس کی وجہ سے آپ کا دِل نہایت نرم اور رحیم و کریم ہے کہ کسی کا بُرا نہیں چاہتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہر وقت شفقت کا جذبہ موجزن رہتا ہے۔ "وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ" اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سخت دِل ہوتے، سخت برتاؤ کرتے، تو سب اُٹھ کر بھاگ جاتے آپ کے اِردگرد سے، کوئی جمع نہ رہتا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے رحمتِ مجسم بنا کر ایک مقناطیس بنادیا ہے کہ عالَم کی کشش ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی، حسنِ خُلق کی ہدایت نہیں کی بلکہ خُلقِ کریمانہ سے شروع کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بدلے لے لیا کریں یہ نہیں فرمایا گیا، چنانچہ عمر بھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ کریمہ یہ رہی کہ کتنی بُرائی کی لوگوں نے، کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقام نہیں لیا، کبھی بُرائی کا بدلہ بُرائی سے نہیں دیا، تو ہدایت کیا ہے؟ فرمایا: "فَاعْفُ عَنْهُمْ" معاف کرو۔ پھر آگے فرمایا کہ یہ درجہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام سے نیچا ہے، آپ کا مقام اس سے بھی زیادہ بلند ہے: "وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ" فقط معاف ہی نہ کریں بلکہ دُعائے مغفرت بھی کریں ان لوگوں کے لئے جو آپ کے ساتھ بُرائیاں کر رہے ہیں، انہیں دُعائیں بھی دیں۔ پھر آگے فرمایا کہ اس سے بھی اُونچا ہے آپ کا مقام، جو بُرائی کرنے والے ہیں فقط معاف ہی نہ کریں، فقط دُعا ہی نہ دیں بلکہ "وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ" کبھی کبھی بلا کر ان سے مشورہ بھی کرلیا کریں، تاکہ یوں سمجھیں کہ ہمیں خالص اپنا سمجھا، تو یہ انتہائی مرتبہ ہے خُلق کا کہ بُرائی کرنے والوں کے ساتھ ساتھ معاف کرنا، معاف کرنے سے زیادہ دُعائیں دینا، اور دُعائیں دینے سے زیادہ اپنے برابر سے بٹھا کر کچھ پوچھ گچھ بھی کرنا کہ بھائی تمہاری کیا رائے ہے اس میں؟ تو یہ انتہائی مقام ہے جس کو فرمایا گیا ہے:

''وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیمٍ'' آپ کو اللہ تعالیٰ نے خُلقِ عظیم پر پیدا کیا ہے، جو اخلاق کا انتہائی مرتبہ ہے۔ تو یہ ظاہر بات ہے کہ خُلقِ عظیم جس ذات کے اندر ہے تو خُلقِ کریم بھی اس کے اندر، خُلقِ حسن بھی اس کے اندر ہے، وہ جامع ہے تمام مقاماتِ اخلاق کا، تو علوم کے اندر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم جامع کہ تمام مقاماتِ اخلاق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک میں جمع کر دیئے گئے ہیں، تو علم کا بھی انتہائی مرتبہ دیا گیا کہ عالَمِ بشریت میں اتنا بڑا عالم کوئی نہیں کہ جتنے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ''علم الأوّلین والآخرین'' اخلاق میں وہ مرتبہ کہ اتنا خلیق نہ اگلوں میں گزرا، نہ پچھلوں میں گزرا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خُلق نہایت مکمل ہے۔

انتہائی نبوّت

اب ظاہر ہے کہ جب نبوّت کی بنیاد ان دو چیزوں پر تھی ''کمالِ علم'' اور ''کمالِ اخلاق'' اور یہ دونوں چیزیں انتہائی طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کی گئیں تو نبوّت بھی انتہائی ملنی چاہئے کہ اس کے بعد میں کوئی درجہ ہی باقی نہ رہے نبوّت کا، کہ کسی کو لایا جائے اور نبوّت کا درجہ طے کرایا جائے، اس لئے نبوّت ختم کر دی گئی، یعنی حدِ کمال پر پہنچادی گئی کہ کوئی درجہ اب باقی نہیں رہا کہ نبی کو لایا جائے اور وہ مقام پورا کرایا جائے۔ اُمت میں بڑے سے بڑے اقطاب پیدا ہوں گے، اولیاء پیدا ہوں گے، ابدال پیدا ہوں گے، انہیں کے ذریعہ وہ کام لیا جائے گا جو پچھلی اُمتوں میں انبیائے کرام علیہم السلام سے لیا جاتا رہا ہے، فرق اتنا ہے کہ انبیاء معصوم ہوتے ہیں کہ گناہ سرزد ہی نہیں ہوسکتا تھا ان سے، اولیائے کرام معصوم تو نہیں ہوتے مگر محفوظ ہوتے ہیں، اللہ کی طرف سے ان کی حفاظت کی جاتی ہے کہ وہ کرتے نہیں گناہ، نفس میں اتنی قوّت ہے کہ وہ مقابلہ کرتے ہیں پوری طرح سے گناہ کا، آنے نہیں دیتے گناہ کو اپنے پاس، اور اگر کبھی پھسل جائیں تو اللہ کی طرف سے حفاظت ہوتی ہے، انہیں

ڈالا نہیں جاتا گناہ کے اندر، تو معصوم نہیں ہیں مگر محفوظ ہوتے ہیں من جانب اللہ، تو اگر انبیاء علیہم السلام معصوم تھے تو اس اُمت کے اولیاء محفوظ بنائے گئے، اگر انبیائے کرام علیہم السلام کے ہاتھوں پر معجزے ظاہر ہوتے تھے تو اولیاء کے ہاتھوں پر کرامتیں ظاہر ہوتی ہیں جو معجزے کی ایک شاخ اور فرع ہیں، وہ معصوم ہوتے ہیں، یہ محفوظ ہوتے ہیں۔ تو ایک قسم کی مماثلت اور مشابہت پائی جاتی ہے اس اُمت کے اتقیاء کو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ، مقامِ نبوّت کے نیچے ہیں، نبوّت تو نہیں آسکتی، مگر کام جو نبیوں کے تھے وہ لئے گئے ہیں۔ ایک نبی جہاں بیٹھ گئے، ملکوں کو ایمان سے رنگ دیا، تو ایک ربانی عالم جہاں بیٹھ گیا اس نے خطے کے خطے ایمان اور علمِ دِین سے رنگ دیئے، کام وہ کیا جو نبیوں کا ہوتا ہے۔ بہرحال ختمِ نبوّت کے معنی قطعِ نبوّت کے نہیں نکلے کہ نبوّت فنا ہوگئی، باقی نہیں رہی، بلکہ تکمیلِ نبوّت کے ہوئے کہ یہ نبوّت اتنی قائم و دائم ہے کہ قیامت تک کے لئے یہی نبوّت کافی ہے۔

کامل نبوّت

تو یہ مغالطہ ایک جاہلانہ مغالطہ ہوگا کہ جب نبوّت ختم ہوگئی تو دُنیا میں رحمت باقی نہیں رہی، یوں کہا جائے گا کہ جب نبوّت کامل ہوگئی تو رحمت بھی کامل ہوگئی کہ انبیاء تو رحمت کے مجسمہ ہوتے ہی ہیں، اس اُمت کو بھی رحمت کا مجسمہ بنایا گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا حدیثِ مبارکہ میں: ”اُمتی ھذا أمة مرحومة“ یہ میری اُمت اُمتِ مرحومہ ہے، کہ اُمتوں پر وہ رحم و کرم نہیں کیا گیا جو اس اُمت پر رحم و کرم کیا جائے گا، چونکہ یہ اُمت مجموعی حیثیت سے قائم مقام ہے سارے انبیاء کی اور خاتم الانبیاء کی تو جو رحمت خاتم النبیین کو دی گئی تھی اسی رحمت کا پَرتو اس پوری اُمت پر ڈال دیا گیا کہ یہ اُمت مرحوم بن گئی۔ تو معلوم ہوا کہ ختمِ نبوّت کے وہ معنی نہیں ہیں جو مغالطہ دینے والے دیتے ہیں کہ نبوّت قطع ہوگئی، ختم ہوگئی، بلکہ نبوّت مکمل ہوگئی تو ختمِ

نبوّت کے معنی قطعِ نبوّت کے نہیں ہیں، تکمیلِ نبوّت کے ہیں۔ کمالِ نبوّت پیدا ہوگیا، جیسا میں نے عرض کیا کہ آفتاب نکل کر اگر یوں کہے کہ "أنا خاتم الأنوار" میں نے سارے نوروں کو ختم کر دیا تو کیا یہ مطلب کہ اب نور منقطع ہوگیا، دُنیا میں اندھیرا پھیل گیا آفتاب کے آنے سے؟ خاتم الانوار کہنے کے معنی یہ ہیں کہ نور مکمل کر دیا میں نے، سارے ستاروں کا نور میرے اندر موجود ہے، اب کسی ستارے کی ضرورت نہیں۔ تو نور اور زیادہ قوی ہوگیا نہ یہ کہ ظلمت پھیلی، تو خاتم النبیّین کے آنے کے بعد نبوّت کے آثار اتنے مکمل ہوئے کہ قیامت تک وہ چلیں گے، اب کسی نبوّت کی ضرورت نہیں ہے کہ اس کے ذریعہ سے ان انوار کو پیدا کیا جائے۔

ختمِ نبوّت کا انکار، کمالِ اسلام کا انکار

بہر حال اس سے معلوم ہوا کہ ختمِ نبوّت اسلام کا ایک بنیادی عقیدہ ہے، اس کا انکار اگر کر دیا جائے تو اسلام کے کمال کا انکار ہوگا، اسلام کا کمال باقی نہیں رہے گا، اسلام کی خصوصیات باقی نہیں رہیں گی، اس کا امتیاز باقی نہیں رہے گا۔ تو جو نبوّت کا دعویٰ کرے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسلام کو ناقص بنا کر پیش کرنا چاہتا ہے، وہ اس اُمت کو ناقص کرنا چاہتا ہے تو یہ غلط ہوگا، اس واسطے کہ یہ مغالطہ ہے، تو میں نے عرض کر دیا کہ اس مغالطے کی حقیقت سمجھ لی جائے، یہ محض غلط اندازی ہے ختمِ نبوّت کے معنی نہ سمجھنے کی وجہ سے، ختمِ نبوّت کے معنی لئے اِنقطاعِ نبوّت کے، قطعِ نبوّت کے، حالانکہ ہیں تکمیلِ نبوّت کے۔

أنا لكم بمنزلة الوالد

تو بہر حال ثابت ہوا ہے کہ ختمِ نبوّت اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے، اس کا ماننے والا ہی اسلام کا ماننے والا ہے، اور اس سے انکار کرنے والا اسلام کا منکر ہے، تو حق تعالیٰ شانہ نے اس کی حفاظت فرمائی، دعویٰ کیا کہ:-

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَآ أَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّنَ.

ترجمہ:- محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم میں سے کسی کے والد نہیں ہیں، وہ صرف خاتم النبیّین ہیں۔

اور خاتم النبیّین کا یہ مطلب ہے کہ ''قیامت تک جتنی اقوام، جتنی اُمتیں آنے والی ہیں، ان سب کو اگر دِین اور ہدایت ملے گی تو اسی نبوّت کی وجہ سے ملے گی'' تو وہ گویا منزلہ اولاد کے ہوگئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بمنزلہ والد ماجد کے ہوگئے، اسی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''أنا لکم بمنزلة الوالد'' میں اُمتوں کے حق میں بمنزلہ باپ کے ہوں اور سارے اُمتی میری اولاد کے درجے میں ہیں۔ تو نسبی اولاد مراد نہیں بلکہ رُوحانی اولاد مراد ہے، تو سارے اُمتی رُوحانی اولاد ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم والد ہیں، یعنی والد سے تقسیم ہوتی ہے جو اولاد میں آتا ہے، اخلاق آتے ہیں، علم آتا ہے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات سے ساری اُمت میں علم اور اخلاق اور دِین پھیلا۔

دو طریقوں سے ختمِ نبوّت کی حفاظت

اس لئے ختمِ نبوّت ایک بنیادی عقیدہ ہے جس کی حق تعالیٰ نے حفاظت فرمائی، تو ایک تو قول کے ذریعہ سے حفاظت فرمائی جیسے اس قول میں دعویٰ کیا اور احادیث میں دعویٰ کیا گیا، ''اِنا اَعطینا'' میں بتلایا گیا کہ عملاً بھی ہم نے حفاظت کی ہے ختمِ نبوّت کی، اور وہ کس طرح سے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دو صاحبزادے پیدا ہوئے، ایک کا نام ابراہیم تھا، ایک کا نام قاسم تھا اور لقب تھا ان دونوں کا طیب و طاہر، یہ دو صاحبزادے پیدا ہوئے، ان دونوں کی وفات ہوگئی باقی نہیں رہے، تو نرینہ اولاد نہ رہی، اولاد آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے چلی ہے تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے چلی

ہے، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد ہے، مگر ماں کی طرف سے وہ سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد ہے، جن کو ''سادات'' کہا جاتا ہے، تو نرینہ اولاد نہ رہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے، اور نہ رکھنے کا کیا مقصد تھا؟ حکمتیں تو ہزاروں ہیں اللہ ہی جانتا ہے، لیکن کھلی حکمت یہ ہے کہ اگر صاحبزادے زندہ رہ جاتے تو آبائی کرامت اس سے مختلف تھی کہ انہیں نبی نہ بنایا جاتا، نبوّت کا مقام نہ دیا جاتا اور اگر نبوّت کا مقام دیا جاتا تو ختمِ نبوّت، ختم ہوجاتی، اس لئے اولاد کا ختم کردینا گوارا کیا گیا، مگر ختمِ نبوّت کا باطل کرنا گوارا نہیں کیا گیا، تو اولادِ نرینہ کو زندہ نہیں رکھا گیا کہ اگر زندہ رکھتے اور نبی نہ ہوتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں توہین لازمی آتی، اور بناتے نبی، تو ختمِ نبوّت باقی نہ رہتی، تو حق تعالیٰ شانہ نے پہلے ہی اُٹھالیا، تو کیا مصلحت تھی۔

مشرکین کے طعنے

تو یہ ختمِ نبوّت کی حفاظت ہوئی، مثلاً آیتوں میں تو قولاً حفاظت کی گئی، اور عملاً حفاظت کی گئی اس طرح کہ اولادِ نرینہ زندہ نہ رکھی گئی، اس سے مشرکینِ مکہ نے طعنہ زنی کرنا شروع کی اور کہا کہ بس جی نبوّت تو ختم ہوگئی، وہ جو نبوّت کے مدعی تھے ان کی اولاد ہی زندہ نہیں رہی، ایک پیدا ہوا وہ گزر گیا، دُوسرا پیدا ہوا وہ گزر گیا، تو یہ مقطوع النسل ہوگئے (العیاذ باللہ) اور دُنیا والوں میں نسل اگر کسی کی منقطع ہوجائے تو وہ عیب سمجھا جاتا ہے کہ فلاں لاوَلد گزر گیا، تو مشرکینِ مکہ نے یہ طعنہ دینا شروع کیا کہ یہ نبی ہیں؟ یہ تو مقطوع النسل ہیں، اور قطع ہوگئی ان کی نسل، آگے ان کا نشان ہی نہیں رہے گا، آگے ان کا کوئی تذکرہ ہی نہیں رہے گا جب اولاد باقی نہیں رہی۔

(ہفت روزہ ''ختمِ نبوّت'' کراچی اکتوبر ۲۰۰۰ء)

ندامت کے دو آنسو

حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اپنے مرضِ وفات میں ایک تفصیلی خط حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے نام ارسال فرمایا، جس میں کوتاہیاں، زندگی کی لغزشیں اور اپنے گناہوں پر بے قراری کا اظہار فرمایا تھا، خط میں کچھ وساوس کا تذکرہ تھا اور حسنِ خاتمہ کے لئے دُعا کی درخواست تھی، ذیل میں حضرت حکیم الاسلامؒ کا حکیمانہ جواب پڑھئے۔

سلامِ مسنون نیازِ مقرون!

مکرمت نامہ مؤرخہ ۲۸ رمئی سے آج ۶ رجون ۱۹۷۳ء کو مشرف ہوا، کل پانچ جون ہی کو میں بھی سفرِ بمبئی و مدراس وغیرہ سے دیوبند واپس پہنچا ہوں۔ جنابِ والا کی علالت سے دِل پر چوٹ لگی ہے، بمبئی میں مولانا عمران خان صاحب سے ملاقات ہوئی تو ان سے استفسارِ حال کرتا رہا، پھر محترمی حضرت مولانا علی میاں صاحب سے ملاقات ہوئی، ممدوح حجاز تشریف لے جارہے تھے، پانچ چھ دن قیام ایک ہی مکان میں رہا اور ان کی معیت کا شرف حاصل ہوتا رہا، ان سے بھی جناب کی مزاج گرامی کی کیفیت پوچھتا رہا، اب گرامی نامے سے کچھ مزید احوال پر روشنی پڑی، حق تعالیٰ جناب کو صحتِ کامل عطا فرما کر مسلمانوں کے سروں پر قائم رکھے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ وَر پیدا

جنابِ محترم نے غایت توجہ سے اپنی قلبی کیفیات اور فکر کی طرف اشارہ فرمایا ہے، جس سے جناب کو پریشانی لاحق ہے، لیکن اپنا ناقص فہم یہ ہے کہ یہ فکر ہی ان شاء اللہ

منبعِ سکون اور حسنِ انجام کی غمازی کر رہا ہے۔ رہیں لغزشیں، تو انبیاء علیہم السلام کے سوا ان سے کون خالی ہے؟ باقی حق تعالیٰ کے یہاں اعمال سے زیادہ قلبی رُخ پر نظر ہے: ''اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنْظُرُ اِلٰی قُلُوْبِکُمْ'' فکرمند قلوب ہی اِن شاء اللہ مقامِ مقبولیت پر ہوں گے، سردارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ مبارک ''فکرمندی'' فرمائی گئی ہے: ''کَانَ دَائِمَ الْفِکْرَۃِ حَزِیْنًا'' اور ''شَیَّبَتْنِیْ ھُوْدٌ وَ اِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ''۔

حق تعالیٰ نے جنابِ محترم کو جیسے دُنیا میں قلبِ فکر عطا فرمایا وہیں الحمدللہ آخرت کے لئے متفکر بھی ارزانی فرمایا، یہ فکرِ آخرت وہ جب ہی دیتے ہیں جب صاحبِ دِل کے لئے نجات و درجات مقصود ٹھہرا لیتے ہیں۔ امام محمد رحمہ اللہ کو بعد از وفات کسی عارف نے خواب میں دیکھا، پوچھا گیا: کیا گزری؟ فرمایا کہ حق تعالیٰ نے بخش دیا اور یہ فرمایا کہ اے محمد! اگر مجھے بخشنا نہ ہوتا تو میں اپنا علم تیرے سینے میں کیوں ڈالتا۔ باقی لغزشیں تو خاصۂ بشریت ہیں، جن سے انبیاء علیہم السلام کے علاوہ کوئی بھی مستثنیٰ نہیں، اگر عدلِ محض سے کام لیا جاتا تو انبیاء اور اجل اولیاء کے سوا کوئی بھی نہ بچ سکتا، اس لئے سب ہی مغفرت اور عفو کے محتاج ہیں اور یہ فضل سے تعلق ہے۔

آپ بحمداللہ اُونچے مقام پر فائز ہیں، حق تعالیٰ نے آپ کے ہاتھوں کلامِ پاک کی تفسیر مکمل کرائی، جسے ہم فخر کے ساتھ اغیار کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ''صدق'' کے کالموں میں آپ نے بمقابلہ اغیار اسلامی تدین وتمدن کی حفاظت فرمائی، یہ خدمات رائیگاں نہیں جائیں گی اِن شاء اللہ۔ باقی یہ صحیح ہے کہ کیا ہم اور کیا ہماری خدمات؟ بجز اظہارِ عجز و ندامت کے اور ہم لوگوں کے پاس ہے کیا؟ مگر کار بفضل است نہ بعدل ''وَلَوْ یُؤَاخِذُ اللّٰہُ النَّاسَ بِظُلْمِھِمْ مَّا تَرَکَ عَلَیْھَا مِنْ دَآبَّۃٍ''، جو پارے جناب کو یاد تھے اور وہ مرض کی وجہ سے یادداشت کی گرفت میں نہیں آرہے ہیں اور نہ طاقت ہی رہ گئی ہے کہ پھر سے یاد کئے جائیں، تو حق تعالیٰ تو عالم الغیب والشہادۃ ہیں، وہ جانتے ہیں کہ کس بندے نے تساہل سے کس نعمت کو کھودیا ہے اور

کون سماوی عذر سے مجبور ہے؟ وہ نہ صرف یہ کہ ایسی حالت کے نقصان کا مؤاخذہ ہی نہیں فرماتے بلکہ سابقہ اَجر کو بھی مسلسل جاری رکھتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ بعض لوگوں نے عمر بھر تہجد نہیں پڑھا ہوگا، مگر محشر میں ان کے لئے ارشاد ہوگا کہ ان کے نامۂ اعمال میں لکھ دو کہ یہ عمر بھر تہجد گزار رہے ہیں، کیونکہ ہر رات کو ان کی نیت یہی ہوتی تھی کہ آج ضرور تہجد پڑھیں گے، مگر آنکھ نہ کھلتی تھی، تو اس میں ان کا قصور نہیں، اس لئے تہجد گزار سمجھ جائے "نِيَّةُ الْمَرْءِ خَيْرٌ مِّنْ عَمَلِهِ"، پھر بھی ہماری جو لغزشیں ہیں وہ خاصۂ بشریت ہیں، سو وہ توبہ کے بعد ان کی رأفت و رحمت کے سپرد ہیں، ان سے زیادہ کون ہے اپنے بندوں پر ترس کھانے والا "اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَّحِيْمٌ"، آپ کی مجبوری اور دِل کی نیت کو جاننے والے ہیں، وہاں قلوب ہی دیکھے جائیں گے کہ اس میں کیا لے کر آئے ہیں؟

حدیثِ قدسی میں ارشاد ہے کہ اے بندے! تو اگر بقدر قرابِ الارض گناہوں کا بار لے کر میرے پاس آئے گا جس میں زمین آسمان چھپ جائیں گے، تو میں اتنی بڑی مغفرت لے کر تجھ سے ملاقات کروں گا، بشرطیکہ میری عظمت تیرے دِل میں ہو۔ سو الحمدللہ کہ وہ عظمت قلبِ گرامی میں موجود ہے، جس کی دلیل یہ فکر ہے، جو قلب میں موجزن ہے، کیونکہ یہ فکر بغیر عظمت و جلالِ خداوندی کے استحضار کے نہیں ہوسکتا، سو یہ فکر مبارک ہو "فَابْشِرُوا وَاَبْشِرُوا"، میرا منہ تو نہیں ہے، چھوٹا منہ بڑی بات، لیکن ایک جرأتِ رندانہ ہے کہ اِن شاء اللہ آپ مقبول ہیں اور خیر ہی خیر ہے، یہ فکر ہی اس کی دلیل ہے۔ الحمدللہ کوئی مایوسی نہیں ہے اور مایوس ہونا مؤمن کی شان بھی نہیں ہے، وہ صرف کفار کی خاصیت ہے، جس سے مسلمان بَری ہے۔ آپ جیسے حضرات سے تو ہم جیسوں کو نجات کی توقع ہے، جناب ذرّہ برابر تشویش قلبِ گرامی میں نہ لائیں، صرف فکر و ذکر کو رفیقِ سفر رکھ لیا جائے، اِن شاء اللہ کافی ہے۔ البتہ ایک جرأت اور گستاخی جناب کے اخلاقِ کریمانہ پر اعتماد کرتے ہوئے ضرور کر رہا ہوں،

جسے عرض کیے دیتا ہوں اور معافی چاہتا ہوں کہ شیطان اگر بہکانے آئے اور وسوسہ اندازی کرے، خواہ بحالتِ صحت یا بحالتِ مرض، خواہ بحالتِ حیات یا بقریبِ ممات، تو اس سے نہ مناظرہ کا جذبہ رکھا جائے، نہ اپنے دلائل پر کوئی زعم کیا جائے، وہ ملعون تمام کتبِ سماویہ کو دیکھے ہوئے اور اپنی تلبیسات کو متوجہ کئے ہوئے ہے، ہمارا علم تو اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا، اس قلتِ علم پر اس کے مقابلے میں ہمارے دلائل ہی کیا ہوں گے؟ اور ہوں گے تو کس کام کے؟ اور زبان کھل بھی جائے گی یا نہیں؟ اس لئے شیطان کا علاج مناظرہ نہیں لاحول ہے، اور صرف ایک ہی جواب ہے کہ ہم بے دلیل اپنے خدا اور رسول اور دِین کو مانتے ہیں اور تجھے معلون سمجھتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے تجھے ابدالدّہر تک ملعون قرار دیا ہے، اس لئے تو بھی جھوٹا اور تیری ساری دلیل بھی جھوٹی اور ناقابلِ التفات ہے، تو دُور ہو، تجھ پر لعنت ہو، ہم تجھ سے مخاطب نہیں ہونا چاہتے۔ بہرحال شیطان کا سیدھا جواب یہی ہے نہ کہ بحث ومباحثہ یا عزمِ مناظرہ۔ یہ بات اپنے ایک بزرگ کے سامنے عرض کرنا یقیناً گستاخی ہے، کہاں میں اور کہاں جناب کی ذاتِ گرامی ؎

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

لیکن خود کی بات بھی کبھی کبھار کارآمد ہوجاتی ہے اور نافع ثابت ہوتی ہے، یہ ایک طالب علمانہ مشورہ دِل میں آیا، جسے بے تکلف عرض کردیا گیا، معافی کا خواستگار ہوں۔

حضرتِ گرامی! میں چیز ہی کیا ہوں؟ کہ دستگیری کا لفظ اس نابکار کی نسبت استعمال فرمایا جائے، یہ جناب کی محض بزرگانہ شفقت ہیں، میرا وظیفہ تو یہ ہے کہ جہاں اپنے بزرگوں کے لئے دُعائے ترقیٔ درجات کرتا ہوں، جنابِ محترم بھی انہیں میں شامل ہیں، جب سروَرِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک اُمتی دُعائے وسیلہ وترقیٔ فضل وفضیلت کرسکتا ہے، کہ جہاں کوئی نسبت ہی نہیں، سوائے غلامی اور آقائی کے، تو ایک حقیر خود کو اپنے ایک بزرگ کے لئے بھی دُعا کی جرأت ہوسکتی ہے۔ میری دُعا تو

یہ ہے کہ حق تعالیٰ میری اور جناب کی دستگیری فرمادے اور ہمیں جنتِ رضوان میں جمع فرمائے، تو وہاں اِن شاء اللہ تفصیلی باتیں ہوا کریں گی۔ بنصِ حدیث اہلِ جنت کو دُنیا کی تمام باتیں یاد ہی ہوں گی، بلکہ ہمہ وقت مستحضر بھی ہوں گی: "عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَأَخَّرَتْ" (اور وہ اس میں باتیں کریں گے کہ وہ فلاں وقت کی بات یاد ہے جو ہم میں تم میں ہوا کرتی تھی) اُس وقت "اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ" کا ظہور ہوگا، اور دُنیا کے بچھڑے ہوئے سب مل جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ جناب کو صحتِ کاملہ، عاجلہ، مستمرہ عطا فرمائے اور زندگی کو مستفیدین کے لئے اور تھامے رکھے اور ہم سب کو حسنِ خاتمہ کی دولت سے نوازے (آمین یا ربّ العالمین)۔

جن لوگوں کے اخلاقی حقوق یاد آئیں، وہ ان کے لئے اِستغفار اور دُعائے ترقئ درجات کافی ہے، حق تعالیٰ کریم ہیں، ان اِستغفاروں اور ندامتوں کا حوالہ دے کر اگر ان اہلِ حقوق سے معافی کی سفارش ٹال سکے گا یا اپنے حق میں عظیم فخر و مباہات اور اس ہولناک دن میں اُسے خود اپنا ذریعہ نجات نہیں سمجھے گا، البتہ اگر کچھ مالی حقوق ہوں تو ان مرحومین کے ورثاء کو ادا کئے جاسکتے ہیں۔

توجہ الی اللہ اور ذِکر وفکر کی توجہ ذاتِ گرامی کو کون دِلانے کی جرأت کرے، جبکہ بحمد اللہ وہ حاصل بھی ہے، اس دُنیا میں وجہ سکون سوائے اسمائے الٰہیہ کے ورد کے اور کوئی چیز نہ ہے، نہ بن سکتی ہے: "اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللهِ، اَلَا بِذِكْرِ اللهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ" سو توجہ بحمد اللہ موجود ہے، بلکہ قلب پر مستولی ہے، جس کی دلیل یہ فکر ہے، باقی دُعائیں ہم خوردوں کی بھی اِن شاء اللہ ہیں، قبول فرمانے والے ہیں، جن کی شانِ اقدس: "اِنَّ اللهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ" ہے اور ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی شان بھی: "بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ"، بتلائی گئی ہے، پس ؎

اے آنکہ کریمی و رسول تو کریم
صد شکر کہ ہستیم میاں دو کریم

لہٰذا ذرا بھی دِل میں تشویش نہ لائی جائے، صرف ذکر وفکر کی طرف توجہ رکھیں اور رجاء کو قلبِ صافی پر غالب رکھا جائے: ''أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ''۔ نہ معلوم اپنی طالب علمانہ بڑ میں کیا کچھ لکھ لیا گیا ہوں، معافی کا خواستگار ہوں، حاضرینِ مجلس میں سلامِ مسنون، مزاجِ مبارک کی کیفیت کسی سے لکھ دینے کو فرما دیا جائے۔ والسلام

محمد طیب، اَز دیوبند

۱۹۷۴/۹/۸ء - ۱۳۹۴/۵/۱۶ھ

یوم السبت

(ماہنامہ ''القاسم'' نوشہرہ، سرحد جولائی ۲۰۰۱ء)

تقریرِ علم و حکمت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَ کَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

اما بعد، حضراتِ محترم! یہاں کی حاضری کے سلسلے میں آپ نے اپنے اس ''سپاس نامہ'' میں جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے، میں آپ کی عزّت افزائی پر آپ کا شکرگزار ہوں، اس قسم کے خیالات میرے لئے حوصلہ افزائی کا سبب ہیں۔

شئے کا اپنے معدن میں آنا اس کی خوشی کا باعث ہے

اس طرح کے مدارس کے سلسلے میں کسی طالبِ علم کا آنا دراصل شئے کا اپنے معدن میں چلا آنا ہے، جیسے مچھلی پانی میں جاکر خوشی محسوس کرتی ہے، ایک طالبِ علم مدرسہ میں آکر بھی اسی طرح خوشی محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے معدن میں چلا آیا ہے۔ بالخصوص آپ کا یہ مدرسہ جو حضرت شیخ الاسلام دامت برکاتہم کی سرپرستی میں چل رہا ہے، اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ یہ مدرسہ دارالعلوم ہی کا بُروز وظہور ہے، اور میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ جیسے دارالعلوم دیوبند کے کسی حصے میں کھڑا ہوکر تقریر کر رہا ہوں، اس لئے جذباتِ تشکر کے ساتھ ساتھ مسرّت بھی ہے۔

مجھے اپنے سفروں میں کوٹھیوں اور بنگلوں میں بھی قیام کا اتفاق ہوتا ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ جو قلبی مسرّت اور رُوحانی سکون اور خوشی کسی درس گاہ میں پہنچ کر اور اپنے عزیز طلبہ میں مل جل کر رہنے میں ہوتی ہے، سچ پوچھئے تو کوٹھیوں میں میسر نہیں آتی۔

تعلیم اِقدام ہے اور انبیاء کا مشن ہے

حضرات! اسلامی نقطۂ نگاہ سے تعلیم سب مقاصد سے اِقدام اور اہم المقاصد بلکہ تمام مقاصد کی رُوح ہے۔ اِسی لائن سے مسلمان آگے بڑھے، خواہ تعلیم عام ہو یا تعلیمِ خاص۔ تعلیمِ عام جسے ''تبلیغ'' کہتے ہیں، اور تعلیمِ خاص جسے عرفاً تعلیم کہتے ہیں اس نے ہی مسلمانوں کو ہمیشہ آگے بڑھایا ہے، اسی کے ساتھ جب کمالِ اخلاق شامل رہے تو دِینی و دُنیوی ترقیات کی تمام راہیں کھل جاتی ہیں۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کا مقصد دو چیزیں بتائیں، ایک تعلیمِ علم، اور ایک تکمیلِ اخلاق۔ تعلیم کے بارے میں اِرشاد فرمایا: ''اِنّما بعثت معلّمًا'' اور تکمیلِ اخلاق کے بارے میں ارشاد فرمایا: ''بعثت لأتمّم مكارم الأخلاق'' جس کا حاصل یہ نکلا کہ بعثت کا پہلا مقصد تو تعلیم ہے اور دُوسرا مقصد تربیت یعنی علم و اخلاق ہی پھیلانے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم دُنیا میں تشریف لائے تھے، اِسی لئے اسلام میں پہلی آیت جو قرآن کی نازل ہوئی وہ تعلیم و تعلّم سے ہی متعلق ہے، ارشادِ خداوندی ہے: ''اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ'' گویا اوّلیں مقصد اسلام کا یہ تھا کہ پڑھو! اور کیا پڑھو؟ پڑھو پروردگار کے نام سے یعنی وہ علم پڑھو جس میں رَبّ کا نام پہلے آئے، اور رَبّ کی معرفت ہو کہ وہی خالق ہے، وہی کریم و اکرام ہے اور وہی معلّم ہے قول سے بھی اور قلم سے بھی۔

جہالت سب سے بڑا روگ ہے

بزرگو! جہالت سے بڑھ کر کوئی دُوسرا روگ نہیں ہے، سرکارِ دو جہاں کی بعثتِ مبارکہ سے پہلے عرب میں ہر طرح کی بُرائیاں تھیں، زناکاری عام تھی، فحش کاری کا بازار گرم تھا، جھوٹ اور ڈاکہ زنی کو مردانگی کو جوہر سمجھا جارہا تھا، لیکن اس دور کو ان بُرائیوں کی طرف منسوب نہیں کیا گیا، یعنی اس دور کو زمانۂ فحش کاری یا زمانۂ زناکاری

وغیرہ کا دور نہیں کہا گیا، جھوٹ اور ڈاکہ زنی کا دور نہیں کہا گیا، نہ اس کو فسق و فجور کا زمانہ کہا گیا، بلکہ اس کو براہِ راست جہالت کی طرف منسوب کر کے زمانۂ جاہلیت کہا گیا، جس سے واضح ہے کہ تمام شرور و مفاسد کی جڑ، بنیاد جہالت ہے اور اس کا دفعیہ ہی تمام مفسدوں کا دفعیہ ہے۔

الغرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دُنیا میں تشریف لاکر جہالت کی تاریکیوں کو دُور کیا اور دُنیا کو ایمان اور علم کی روشنی سے منوّر کیا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اوّلیں حکم بھی ہوا کہ جہالت کو رفع کرو: "اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِی .... الخ"۔

بعثت کی دُوسری غرض

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کی دُوسری غرض تکمیلِ اَخلاق فرمائی اور کہا: "بعثت لأتمّم مکارم الأخلاق" الحدیث۔ یعنی میری بعثت کا مقصد کمالِ اَخلاق سکھلاکر مخلوق کو خلیق بنانا ہے۔

علم بلاشبہ روشنی ہے جس سے راہ نظر آتی ہے، مگر چلنے کی طاقت اَخلاق ہی سے پیدا ہوتی ہے، اور اس کا سرچشمہ محبت ہے اور محبت رُوح ہے ایمان کی جیسا کہ ارشادِ نبوی ہے:-

لا یؤمن أحدکم حتّٰی أکون أحب الیه من والدہ وولدہ والناس أجمعین. الحدیث.

اسی لئے پہلے ایمان پیش فرمایا گیا، پھر علم کی روشنی اور اخلاق کی طاقت پیدا کرنے کا حکم دیا گیا۔

اس حکمت کو ایک مثال سے یوں سمجھئے کہ جیسے سینکڑوں من بوجھل گاڑی کو انجن کھینچتا ہے لیکن انجن کے لئے دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے، ایک لائن لوہے کی دو پٹریوں والی سڑک اور دُوسرے اِسٹیم یعنی بھاپ کی گرم طاقت، ان ہی دو کے ذریعہ

انجن منزلِ مقصود تک پہنچ سکتا ہے، اگر اِسٹیم نہ ہو صرف لائن بچھی ہوئی ہو تو آپ اسے ٹھیل ٹھیل کر کہاں تک چلائیں گے؟ بالشت بھر چلے گا اور پھر کھڑا ہو جائے گا، اور اگر صرف اِسٹیم ہو لیکن لائن نہ ہو تو انجن اِسٹیم کی طاقت کی وجہ سے جتنا زور سے چلے گا اتنا ہی زمین میں دھنستا چلا جائے گا، منزلِ مقصود تک نہیں پہنچے گا، لیکن جب دونوں جمع ہو جائیں کہ لائن بھی سیدھی اور صاف ہو اور اندر اِسٹیم کی طاقت بھی بھری ہو تو انجن چلے گا اور اپنے ساتھ سینکڑوں من بوجھ کی گاڑیوں کو کھینچ کر منزل تک پہنچا دے گا۔

ٹھیک اسی طرح ایک مؤمن کے اللہ تک پہنچنے کے لئے ایک سیدھی لائن کی ضرورت ہے، وہ علمِ شریعت ہے، اور ایک یہ کہ اس کے اندر عشقِ الٰہی اور محبتِ نبوی کی اِسٹیم بھری ہوئی ہو، اگر عشق و محبت نہ ہو تو اُسے وعظ و نصیحت سے کب تک ٹھیل ٹھیل کر چلایا جائے گا، اور اگر عشق و محبت ہو مگر علم کی لائن نہ بچھی ہوئی ہو تو جتنا زور سے چلے گا اتنی ہی جہالت کی وجہ سے بدعات و منکرات کی زمین میں دھنستا چلا جائے گا، لیکن جب علم و عشق دونوں جمع ہو جائیں گے تو یہ کامل الایمان منزلِ خداوندی تک چلے گا، اور جو اس سے بندھ جائے گا اُسے بھی کھینچ کر وہیں پہنچا دے گا۔

پس معلوم ہوا کہ منزل تک پہنچنے کے لئے لائن اور اِسٹیم ضروری ہے، لائن علم ہے، اور اِسٹیم محبت ہے، جو عشقِ الٰہی اور عشقِ نبوی کی آگ سے پیدا ہوتی ہے اور اسی سے انسان عرش تک پہنچتا ہے۔

مدرسہ اور خانقاہ کی حقیقت

جہاں علم سیکھنے سکھانے کا کام ہوتا ہے اس کو اصطلاح میں ''مدرسہ'' کہتے ہیں، جہاں اخلاق کی طاقت پیدا کی جاتی ہے اس کا نام ''خانقاہ'' ہے، مدرسہ کا موضوع روشنی پیش کرنا اور راہ دِکھانا ہے، ساتھ ہی وسیع الخیال بنانا بھی، جس کے نتیجے میں جرأتِ حق، صاف گوئی اور اعلائے کلمۃ اللہ کے اوصاف پیدا ہوتے ہیں، اور خانقاہ

میں اخلاق اور کریکٹر کی طاقت پیدا کی جاتی ہے۔

مگر افسوس کہ اس زمانے میں ایسی خانقاہوں کا وجود اقل قلیل ہے، اَب خانقاہوں میں اخلاقِ ربانی پیدا کرنے کا کام تقریباً ختم ہے، حالانکہ ان کا اصل موضوع تبلیغِ حق اور راہِ حق میں جان سپاری تھا، جن کے طفیل سے ہندوستان میں اسلام پھیلا، اِسی طرح کم مدارس ہیں جن میں پہلے جیسا کام ہوتا ہو، ان دونوں کی کمی سے اُمت کی بنیاد کمزور ہوتی جارہی ہے اور مدارس کے قیام کی تحریک اب پھیکی پڑتی جارہی ہے، حالانکہ تعلیم اور تربیتِ اخلاق کی تحریک نبوّت کی بنیادوں کے قائم کرنے کی تحریک تھی۔

مادّی چاند وسورج سے زیادہ روشنی والے آفتاب و ماہتاب

یہی دو روشنیاں تو تھیں جنھیں لے کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام دُنیا میں تشریف لائے اور اس طرح تشریف لائے کہ آپ کے دائیں ہاتھ میں سورج تھا اور بائیں ہاتھ میں چاند تھا، لیکن یہ مادّی چاند وسورج نہیں کہ ان کی اس چاند وسورج کے سامنے جسے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے کوئی حقیقت نہیں، آپ کے دائیں ہاتھ میں آفتاب سے زیادہ چمکنے والا اور کبھی نہ غروب ہونے والا سورج اللہ کی روشنی کتاب تھی، اور بائیں ہاتھ میں چاند سے زیادہ چمکنے والا قلبِ محمدی تھا، جس میں اخلاقِ محمدی کی روشنی بھری ہوئی تھی، کلامِ خداوندی جلالِ اُلوہیت سے بھرا ہوا تھا، جس کی جلالی شان تھی، یہ جلالی شان جب قلبِ محمدی میں سے ہوکر گزری اور اس میں اخلاقِ عبدیت کی ٹھنڈک شامل ہوئی تو یہ روشنی ٹھنڈی اور معتدل ہوکر دُنیا کے سامنے آئی، اگر بلا نبوّت کے یہ جلالی روشنی دُنیا کو دی جاتی تو اس کا جلال وعظمت دُنیا کو پھونک کر رکھ دیتا اور کوئی تحمل نہ کرسکتا، لیکن قلبِ محمدی کی اخلاقی مسکنت وعبدیت نے اُسے مخلوق کے لئے قابلِ تحمل بنادیا اور وہ ٹھنڈی روشنی کی صورت سے جلوہ گر ہوئی۔

بہرحال اللہ کی روشنی جلالی تھی اور قلبِ محمدی کی روشنی جمالی تھی، اِن دونوں کے مل جانے سے اعتدالی اور کمالی روشنی دُنیا کے لئے نمودار ہوئی، جس میں محبت، میل ملاپ، ہمدردی، تواضع، ایثار اور تمام کمالاتِ علم و اخلاق بھرے ہوئے تھے جن میں ہر مخلوق سے ہمدردانہ برتاؤ کا حکم دیا گیا تھا، ملائکہ کے ساتھ ہمدردی اور محبت کا حکم ہے، ارشاد ہے:-

قُلْ مَنْ کَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِیْلَ فَاِنَّہٗ نَزَّلَہٗ عَلٰی قَلْبِکَ بِاِذْنِ اللہِ .... الخ. (البقرۃ:۹۷)

جنات کے ساتھ ہمدردی کا حکم تھا کہ ہڈی سے اِستنجاء نہ کرو، اس لئے کہ اس میں تمہارے بھائی جنوں کی غذا ہے، اسی طرح کوئلے سے اِستنجاء کو منع فرمایا کہ اس میں بھی اَجنّہ کے لئے غذائی مادّے موجود ہیں۔

جانوروں کے ساتھ ہمدردی کے واقعات تو کتب میں بکثرت ہیں، ایک اُونٹ ایک مرتبہ خدمتِ مبارکہ میں آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر گر پڑا اور اس کی آنکھ میں پانی اور زبان پر فریاد کی بلبلاہٹ تھی اور وہ نہایت ہی لاغر اور ناتواں ہو رہا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُونٹ کے مالک کو طلب فرمایا اور فرمایا کہ یہ شکایت کر رہا ہے کہ تو اس پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالتا ہے، اس نے اِس جرم کا اقرار کیا اور آئندہ کے لئے توبہ کی۔

غرض اس دِین کی روشنی میں جانوروں تک کے ساتھ ہمدردی اور ان کے حقوق کی ادائیگی کا حکم دیا گیا ہے، پھر نہ صرف حیوانات بلکہ جمادات کے ساتھ بھی ہمدردی و محبت کا حکم دیا گیا ہے، نہر کے کنارے پر بھی بیٹھو تو بلاضرورت پانی نہ بہاؤ، وضو بھی کرو تو اِسراف نہ کرو۔

بہرحال یہ تمام اَحکام رحمۃ للعالمینی کی شان سے وابستہ ہیں جن میں خلق اللہ کے ساتھ ہمدردی اور ان پر شفقت کی تاکیدیں کی گئی ہیں، مگر اسی کے ساتھ جلالی

شانیں بھی قائم ہیں کہ اس کے بغیر دِین میں اعتدال قائم نہیں رہ سکتا تھا۔

جہاں یہ شفقت و ہمدردی اور رحم دِلی ہے وہیں اسی رحمۃ للعالمین کی شریعت میں جرائم پر حدود و قصاص کے اَحکام بھی موجود ہیں، جن میں کسی سفارش کو جائز نہیں رکھا گیا ہے، اور اس درجہ مساوات رکھی گئی ہے کہ اس میں بڑا اور چھوٹا سب برابر اور انصاف کی نگاہ میں اعلیٰ و ادنیٰ سب یکساں ہیں، یہاں تک فرمایا گیا ہے:-

لو ان فاطمة بنت محمد سرقت لقطعت يدها. حديث

اسی رحمت کی شریعت میں جہاد بھی موجود ہے، جس میں فتنہ پردازوں کے فتنوں کو دبایا گیا۔

بہرحال یہ شریعت جامع شریعت ہے، جس میں جلال و جمال کو ملا کر شریعتِ محمدی کی تعمیر کی گئی ہے، کیونکہ عمل کی دُنیا میں نہ تو جلالِ محض سے کام چل سکتا ہے اور نہ جمالِ محض سے مقصود حاصل ہوسکتا ہے، اگر آقا اپنے غلام پر ہمہ وقت غصہ اور عتاب ہی کرتا رہے، خواہ وہ اِطاعت کرے یا مخالفت تو غلام بددِل ہوکر کام چھوڑ بیٹھے گا اور اس کے اندر پھر کام کرنے کا کوئی حوصلہ نہ باقی رہے گی، وہ کہے گا: کام کرو تب بھی جوتیاں ہی لگتی ہیں، نہ کرو جب بھی مار ہی کھانی پڑتی ہے، تو کیوں محنت اُٹھائی اور کیوں عمل کی محنت سے اپنی جان کو سوہان بنایا جائے؟

اور دُوسری سمت کوئی آقا ہر وقت جمال ہی جمال میں غرق ہے اور غلام پر شفقت ہی شفقت کر رہا ہے تب بھی غلام کام سے معطل ہوجائے گا کیونکہ وہ سوچے گا جب آقا بے عملی پر بھی خفا ہونا نہیں جانتا تو پھر عمل کی محنت کیوں اُٹھائی جائے؟ تو اس سے خادم ڈھیٹ اور جری بن کر عمل سے معطل ہوجائے گا۔

غرض جلالِ محض بھی عمل میں تعطل پیدا کرتا ہے اور جمالِ محض بھی عملی قوت ختم کردیتا ہے، جلال و جمال ملتے ہوئے ہوں کہ کرنے پر صلہ کی توقع ہے اور نہ کرنے پر سزا کا اندیشہ ہے، تب ہی عمل کی قوت اُبھر کر کام کرتی ہے۔

خلاصہ یہ نکلا کہ اُمید اور بیم اور خوف و رجاء کے ملنے ہی سے عملی قوتوں میں بیداری آتی ہے، اور ایمان نام اسی خوف و رجاء کے مجموعے کا ہے، نہ اُمیدِ محض کا نام ایمان ہے کہ آدمی بیٹھا ہوا اللہ سے اُمیدیں باندھتا رہے، اور نہ خوفِ محض کا نام ہے کہ آدمی اللہ سے ہر وقت کانپتا رہے بلکہ اُمید اور خوف کو جمع رکھنے کا نام ایمان ہے: ''الایمان بین الخوف والرجاء'' ، اس لئے قرآن نے دو جملے استعمال فرمائے ہیں، جن میں اسی درمیانی حالت کی تعلیم دی گئی ہے، ایک جگہ فرمایا:-

وَلَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللهِ، اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ. (یوسف:۸۷)

اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، اس سے مایوس ہونے والے کفار اور منکرین ہوا کرتے ہیں۔

ہمیں تو شدائد کے وقت بھی اُمید باندھنے اور آس لگائے رکھنے کا حکم ہے، اس لئے کہ خدا کی قدرت تو لامحدود ہے، فرائض کے بعد اللہ سے اُمید باندھے رکھنا سب سے بڑی عبادت ہے، اَسبابِ محض پر اُمیدیں باندھتے رہنا تو ایک قسم کا شرک ہے، مگر مسبب الاسباب سے اُمیدیں باندھنا دُنیا میں کشائش کی اور آخرت میں جنت کی توقع رکھنا نہ صرف ثواب بلکہ عین ایمان ہے۔ اللہ کے رسول کا حکم ہے کہ بیمار کی عیادت کے وقت بھی مریض کے بدن پر ہاتھ پھیر کر کہو: ''لا بأس طهور'' مت گھبراؤ، اِن شاء اللہ یہ مرض بھی تمہارے حق میں پاکی اور پاکی کا ذریعہ ہے، جس سے تم گناہوں کی کدورت سے اور بدن کے مادّی روگ سے پاک ہوجاؤ گے، مگر جہاں یہ ہمہ وقتی اُمید بتلائی وہیں قرآن نے ایک دُوسرا جملہ بھی بولا ہے کہ:-

فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ. (الاعراف:۹۹)

اللہ کی مخفی تدبیروں سے بےفکر نہ ہوجاؤ کہ بےفکر ہوکر بیٹھ جانے والے گھاٹے والے ہیں۔

پس پہلی آیت میں یأس سے روک کر رجاء و اُمید کی تعلیم دی گئی ہے، اور دُوسری آیت میں بے فکری سے ہٹا کر فکرمندی اور خوف کی تعلیم دی گئی ہے، پس انہیں دونوں کے مجموعے سے ایمان بنتا ہے، اس سے واضح ہوا کہ اِن دونوں آیات کا مجموعہ ایمان ہے، لہٰذا یہ حقیقت نکھر کر سامنے آ گئی کہ شریعت میں جلال و جمال دونوں ہیں اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم میں جمال و جلال دونوں ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جامع اَخلاق سے اور اپنی جامع تعلیم سے بھی جلال و جمال کی گرم اور ٹھنڈی روشنی دونوں ہی پیش فرمائی، ٹھنڈی روشنی اخلاقِ محمدی ہے، اور گرم روشنی کلامِ ربانی کی روشنی ہے، ایک روشنی تعلیمِ کتاب سے ملتی ہے، اور ایک تربیتِ اخلاق سے ہاتھ آتی ہے، ایک مدرسہ اور ایک خانقاہ سے، اس لئے نہ کوری مُلاّئیت سے کام چلتا ہے، نہ کوری صوفیت سے، نہ تنہا مدرسہ کی تعلیم کافی ہے، نہ تنہا خانقاہ ہی، دونوں کی ضرورت ہے، بلکہ غور کیا جائے تو تعلیم سے بھی زیادہ ضروری چیز تربیت ہے، کیونکہ تربیت بغیر اَخلاق نہیں ہوتی اور تزکیۂ اخلاق کے بغیر عبدیت نہیں آتی، جو تخلیقِ انسانی سے اصل مقصود ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رفعتِ شان اور اسی کے ساتھ شانِ عبدیت

جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تنہا اعلم البشر اور اعلم الاوّلین والآخرین ہی نہیں بلکہ اَعبد الخلائق اور سیّد المتواضعین بھی ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خُلقِ عظیم کا پاک اثر ہے، علم رفعت و سربلندی کو چاہتا ہے اور خلق عبدیت اور تواضع کو، اگر علم کے ساتھ عبدیت شامل نہ ہو تو انسان میں تعلّی اور ترفع پیدا ہو جاتا ہے جو اس کے لئے مہلک ہوتا ہے۔

پس علم کے ترفع کا بدرقہ عبدیت ہے جو تزکیۂ اخلاق اور تصفیۂ نفس سے پیدا ہوتی ہے، اس لئے حضرت سیّد البشر صلی اللہ علیہ وسلم عبدیت میں یکتا اور بے مثال ہیں۔ میں تو کہا کرتا ہوں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ اپنی معبودیت میں وحدہٗ لاشریک لہٗ

ہے، ٹھیک اِسی طرح اس کا محبوب رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنی عبدیت میں وحدہٗ لا شریک ہے، اللہ اللہ ایک طرف تو علوِ مرتبت کا یہ عالم کہ ارشادِ خداوندی: ''وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ'' کی بنا پر یہ فرمایا جاتا ہے کہ: ''بیدی لواء الحمد ولا فخر، أنا سیّد البشر، أنا أوّل من تشق منه الغبراء ولا فخر، أنا قائدهم وخطیبهم یوم القیامة ولا فخر'' تو دُوسری طرف اپنی عبدیت کو اس طرح اُجاگر فرمایا جاتا ہے کہ زندگی کے ہر ہر گوشے سے شانِ عبدیت نمایاں ہے، کھانے میں، پینے میں، چلنے میں، پھرنے میں، پہننے میں، اوڑھنے میں، غرض زندگی کے ہر گوشے میں اِسی عبدیت کا مظاہرہ ہے، کھاتے ہیں تو چوکڑا مار کر کبھی نہیں کھاتے، بلکہ دو زانو بیٹھ کر اور فرماتے ہیں: ''آکل کما یأکل العبد'' میں تو اس طرح کھاتا ہوں جیسے غلام کھایا کرتے ہیں، چلتے ہیں تو آنکھیں نیچی کرکے۔ یہ دُوسری بات ہے کہ خدا نے اپنے نبی کو اتنا بلند مقام بنایا تھا کہ چلتے وقت میانہ قد ہونے کے باوجود سب سے اُونچے نظر آتے تھے، یہی کیفیت مجلس میں ہوا کرتی تھی، حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ میں رَل مل کر بیٹھنے کے عادی تھے مگر اس میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے اُونچے نظر آتے تھے، یہ اللہ کی دی ہوئی بڑائی تھی، صحابہ کرامؓ نے تعظیم کے لئے مجلس میں کھڑا رہنا چاہا تو فرمایا:-

> جس کو یہ پسند ہو کہ لوگ اس کے لئے کھڑے ہوجایا کریں تو اس کو چاہئے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنائے۔

کبھی یہ فرمایا: ''لا تقوموا لی کما یقوم الأعاجم'' یعنی وہ عبدیت کی شان تھی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر ہر نقل و حرکت سے نمایاں ہوتی تھی اور اُمت کے لئے شریعت بنتی تھی۔

نصب العین کی بلندی اور اس کی کامیابی کا راز

یہی کردار کی بلندی ہے جو افراد ہی کو نہیں اقوام کو بھی سربلند کرتی ہے، کیونکہ

قوموں کی ترقی مال و زَر اور مادّی قوتوں سے نہیں ہوتی بلکہ نصب العین کی بلندی اور کردار کی مضبوطی سے ہوتی ہے، اور کردار علم اور حسنِ اخلاق سے پیدا ہوتا ہے اس لئے اپنے سامنے ایک مضبوط نصب العین رکھ کر اس کی کامیابی کے لئے اپنی طاقت کے مطابق آہستہ آہستہ قدم اُٹھانا چاہئے، کسی مدرسہ کا قیام نبوّت کی تعلیم کی اشاعت کا ذریعہ ہوتا ہے، اس لئے آج میں اپنے اس معدن (مدرسہ اسلامیہ عربیہ برن پور) میں پہنچ کر جہاں قلبی خوشی محسوس کرتا ہوں وہیں نبوّت کی بنیادی تعلیم اور قرآنی اَحکام کی روشنی میں کارکنانِ مدرسہ کو کچھ مشورہ بھی دینا چاہتا ہوں۔

مدارس کے نظام میں سب سے بڑی چیز طلبہ کا ڈسپلن اور ان کی اِطاعت شعاری ہے، ایک مدرسہ ہی نہیں کسی بھی کام کے لئے نظم و تنظیم کا اُصول اور طریق کار لازمی ہے، اور مدارس اس کے زیادہ مستحق اور مقتضی ہیں، مدارس کے نظام کے سلسلے میں خود قرآنِ کریم نے زبردست رہنمائی فرمائی ہے، طلبہ کے داخلہ و خارجہ تک کی نشاندہی حضرت موسیٰ و خضر علیہما السلام کے اس قصے سے ملتی ہے جس کو قرآن نے کافی تشریح سے بیان کیا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام جب خضر علیہ السلام سے استفادے کے لئے پہنچے تو سب سے پہلے حضرت خضر علیہ السلام سے اجازت چاہی کہ کیا میں آپ کی پیروی میں آپ سے کچھ سیکھ سکتا ہوں: "هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَىٰٓ أَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا"۔

یہ ایسا ہے جیسے داخلے کی درخواست دی جاتی ہے، اس پر انہوں نے اوّلاً انکار کیا، پھر موسیٰ علیہ السلام کے اِصرار پر ان کی رِفاقت اور استفادہ منظور فرمایا، مگر کچھ شرطیں لگا کر، یہ ایسا ہے جیسا کہ مدارس میں داخلے کی شرائط اور ڈسپلن کی پابندی کی شرطیں تحریری یا زبانی کی جاتی ہیں، جس کا حق اس واقعے سے ان کے لئے ثابت ہوتا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام وہ شرطیں پوری نہ فرما سکے تو انہوں نے (حضرت خضر علیہ

السلام) فرمایا: "هٰذَا فِرَاقُ بَیْنِیْ وَبَیْنِکَ" یہ ایسا ہے جیسا کہ طالبِ علم کا اخراج۔

ظاہر ہے کہ موسیٰ وخضر علیہما السلام دونوں جلیل القدر لیکن ڈسپلن اور نظم کے بارے میں فریقین میں سے اس صفائی پر نہ کوئی بُرا مانتا ہے، نہ چیں بہ جبیں ہوتا ہے، جس سے نظام بہ رجائے خود قائم رہتا ہے اور اُصول کی کامیابی ہوتی ہے۔

ایسے کاموں میں اگر دیانت داری کے ساتھ ہوش مندی کا بھی ثبوت پیش کیا گیا جس کو دانش کہتے ہیں تو کامیابی اور جلد ہوتی ہے، اس لئے تعلیم کے ساتھ نظامِ تعلیم کی بھی ضرورت ہے کہ اس کے بغیر نتائج وثمرات برآمد نہیں ہوتے۔

میں اس مدرسہ میں تعلیم کے ساتھ دانش مندی اور اس کی روشنی میں نظام کی جھلک بھی محسوس کر رہا ہوں، جو اِن شاء اللہ مدرسہ کی ترقی اور نصب العین کی شاندار کامیابی کی ضمانت ہے، اور میں اس پر مولانا عبدالحمید صاحب اعظمی کو جن کی کاوشوں کے یہ آثار ہیں، مبارک باد دیتا ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تعلیم ہی مسلمانوں کے لئے عظیم پناہ گاہ ہے، جس طرح ۱۸۵۷ء کے ایسے ہی حالات میں بھی تعلیم ذریعہ پناہ ثابت ہوئی تھی۔

انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد دُوسرا ۱۹۵۷ء

بزرگانِ ملت! اس وقت ملک کی جو فضا ہے اس میں اپنے معاملات کے سدھار کے لئے احتجاج اور جذباتی تقریریں مفید نہیں ہیں، بلکہ بہت خاموش طریقے سے قوم وملت کی تعمیر میں اپنی تمام تر قوتوں کو صَرف کر دینا ہی اصلاحِ حال کا مؤثر ترین ذریعہ ہے، اس سلسلے میں آزادیٔ وطن کے بعد جمعیۃ علمائے ہند نے مسلمانوں کی تعمیر اور دِینی تعلیم کی بقاء و اشاعت کے لئے جو خاموش خدمات انجام دی ہیں ان کو کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے؟ میں آپ کو وہ دور یاد دِلاؤں جب ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے نتیجے میں ہمارے حالات حد درجہ خراب ہو چکے تھے تو اس پُرآشوب دور میں

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی فراستِ ایمانی اور دینی بصیرت سے ملک کے مستقبل کو بھانپا اور مسلمانوں کو انقلاب کے ناخوش گوار نتائج سے محفوظ رکھنے کے لئے اپنی اور اپنے رفقاء کار کی توجہ قوم کی تعمیر کی طرف پھیر دی، جس کا ظہور مدارسِ اسلامیہ کے قیام کی شکل میں ہوا، سب سے پہلے دیوبند جیسے گمنام قصبے میں اس تعلیمی تحریک کا عملاً نفاذ ہوا، اور ظاہری بے سروسامانی کے ساتھ چھتہ کی مسجد میں ایک اَنار کے درخت کے نیچے مُلاّ محمود نامی ایک اُستاذ اور محمود نامی صرف ایک شاگرد سے، جس کو بعد میں دُنیا نے شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے جانا، دارالعلوم دیوبند کا افتتاح عمل میں آیا، آج دیوبند کا وہی دارالعلوم ہے جس کے علمی فیوض و برکات ہند و پاکستان اور تمام اسلامی ملکوں کے علاوہ ملایا، انڈونیشیا، سیلون، برما، چینی ترکستان، رُوس، زنجبار وغیرہ ممالک تک پھیلے ہوئے ہیں، بلکہ بحرین، نجد و حجاز اور مدینہ منوّرہ و مکہ معظّمہ زادہما اللہ شرفاً میں بھی آج دارالعلوم کا علمی فیض اپنا کام کر رہا ہے، اس وقت ان اکابر نے علم کی یہ سبیل جاری کر کے مسلمانوں کو سنبھالا تھا، وہی نقشِ قدم آپ کے سامنے بھی ہونا چاہئے۔

مدرسہ اسلامی عربیہ برن پور کے متعلق تأثرات

حضرات! آپ نے اپنے سپاس نامہ میں اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ اس مدرسہ کی جدید عمارت کی تعمیر جنوری ۵۷ء سے شروع ہوگی۔

ہر چند کہ لوگ اب گزشتہ انقلاب ۱۸۵۷ء کی خوں چکاں داستان کے پیشِ نظر آنے والے ۵۷ء کو خوش آمدید کہنے کے لئے تیار نہیں ہیں، مگر میں تو یہ کہا کرتا ہوں کہ ۱۸۵۷ء میں اگر کچھ لوگوں نے وحشت و بربریت کا مظاہرہ کیا اور ملک کو تباہ کرنے کے ساتھ مسلمانوں کی بھی تخریب چاہی لیکن کیا یہ بھی واقعہ نہیں ہے کہ وہی انقلاب ۱۸۵۷ء تھا جس کے نتیجے میں کسی کی تخریب کا صحیح جواب دینے کے لئے

دارالعلوم دیوبند کا قیام مسلمانوں کی ملّی تعمیر کا باعث ہوا، کون ہے جو آج اس کی خدمات کا انکار کرسکتا ہے؟ آپ بھی ۵۷ء ہی سے اپنے مدرسہ کے دورِ جدید کا آغاز کر رہے ہیں، خدا کرے آپ کا یہ مدرسہ بھی دارالعلوم کی طرح ایک مرکزی ادارہ ثابت ہو، جس سے اس علاقے کے لوگ اپنی علمی پیاس بجھاسکیں، مگر یہ ضروری ہے کہ قدم بہت نرم رفتاری کے ساتھ احتیاط سے اُٹھایا جائے، کیونکہ اسلام کا آغاز بھی یوں ہی ہوا ہے، کہنے کوتو آج فرزندانِ توحید ستر کروڑ ہیں، لیکن ایک وقت وہ بھی تھا جبکہ خدا کی اس لمبی چوڑی زمین پر صرف تین مسلمان تھے، بچوں میں حضرت علی، عورتوں میں جناب خدیجۃ الکبریٰ اور مردوں میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہم، اِن تین نفوسِ قدسیہ سے بعد میں کروڑوں تک تعداد پہنچ گئی، آج کروڑوں اگر صحیح معنی میں ان پہلوں کے نقشِ قدم پر آجائیں تو یہ تعداد کہاں سے کہاں تک پہنچ سکتی ہے۔

خاتمۂ سخن

میں آپ کے محبت بھرے الفاظ میں آپ کی اس پذیرائی کا شکرگزار ہوں، آپ نے اس سپاس نامہ میں میرے متعلق جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے، خدا کرے کہ آپ کے یہ خیالات میرے حق میں دُعا بن جائیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو اپنی مرضی پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین۔

(مأخوذ ''مقالاتِ طیبہ'' ص:۱۲۸ تا ۱۴۴)

مفتیٔ اعظم ہند
حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ دہلویؒ

افسوس کہ جن مولانا مفتی محمد کفایت اللہ کو آج سے چند دن پہلے ہم ''سلّمہ اللہ'' اور ''دام ظلہٗ'' کہا کرتے تھے، آج ''رحمہ اللہ'' اور ''مرحوم ومغفور'' کی صفت سے یاد کر رہے ہیں۔ افسوس مرحوم ومغفور ہونے پر نہیں کہ یہ تو زندگی کا انتہائی مطلوب اور متمنّٰی ہے، افسوس اُن کے وصال پر نہیں کہ وصال بحق تو حصولِ مقصود ہے، افسوس فراق پر ہے کہ ایک روشنی ہم میں تھی اور نہ رہی۔ علم وعمل کی کتنی ہی خصوصیات ہم میں جلوہ پیرا تھیں اور چھن گئیں، وہ اِن شاء اللہ واصل اور مرحوم ومغفور ہیں اور بنائے ہی گئے تھے رحمت ومغفرت کرنے کے لئے، بقول امام محمد رحمہ اللہ، جب ان کے وصال کے بعد بعض عارفین نے اُنہیں خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ اے محمد! حق تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ فرمایا؟ تو فرمایا کہ حق تعالیٰ نے مجھے بخش دیا اور فرمایا کہ اے محمد! اگر مجھے تیری مغفرت منظور نہ ہوتی تو میں اپنا علم ہی تیرے سینے میں کیوں ڈالتا؟ پس حضرت مفتی صاحب اِن شاء اللہ مغفور اور واصل ہیں، اگر مغفرت و وصل منظور نہ ہوتا تو یہ علمِ کتاب وسنت ان کے سینے میں ڈالا ہی کیوں جاتا؟ اس لئے ان کے وصال و مغفرت پر ان کا رونا نہیں، رونا اپنا اور اپنی محرومی کا ہے کہ ایسا جاذب مغفرت خزانہ ہم سے جاتا رہا۔

حضرت مفتی صاحبؒ اپنے علم وعمل کے لحاظ سے یقیناً مردہ نہیں بلکہ زندہ اور جاوید ہیں، مگر فراق بہرحال فراق ہے، بلکہ زندہ کا فراق مردہ کے فراق سے زیادہ

تکلیف دہ ہے، مردہ چلا جائے تو صبر آ کر اُس کی یاد فراموش ہو جاتی ہے، لیکن زندۂ جاوید کے اَنمٹ کارنامے ہمہ وقت سامنے رہتے ہیں جو اسے بھولنے نہیں دیتے، اس لئے غم و فراق بھی ہمہ وقت تازہ رہتا ہے، اس لئے مردہ کا غم تو ہنگامی ہوتا ہے اور زندہ کے فراق کا دوامی، جس کی تسکین کچھ اس کے تذکرہ ذکر ہی سے ہوتی ہے۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ وقت کے اُن چیدہ اور منتخب روزگار علماء میں سے تھے جو بیک وقت عالم و فاضل، فقیہ و محدث، ادیب و شاعر، ناظم و ناثر، وقور و غیور، تقی و نقی، خلیق و مجاہد اور صاحبِ سعی و عمل، ذکاوت و فطانت میں بے مثل، ان کی ذکاوت کے نمونے خود بھی دیکھے اور بزرگوں سے بھی سنے، غالباً ۱۳۵۶ھ میں ایک بار میں نے حضرت تھانوی رحمہ اللہ سے عرض کیا کہ کاش اس وقت سارے مسلمان کسی ایک مرکز پر جمع ہوتے اور یہ نہیں تو کم از کم اپنی جماعت کے تو ایک مرکز پر جمع رہتے جس کی سہل صورت یہ ہے کہ آپ اور حضرت مولانا حسین احمد صاحب کسی ایک مشترکہ نقطے پر اجتماع فرمالیں۔ تو بڑی آرزو سے فرمایا کہ ہاں! میرا جی بھی چاہتا ہے کہ اگر ایسا ہو جائے تو بہت ہی اچھا ہو اور تم اس بارے میں سعی کرو، میں اپنی جماعت میں اس وقت مولانا کفایت اللہ صاحب کے حسنِ تدبر اور ذکاوت کا معتقد ہوں، پہلے ان سے ملو اور پھر انہیں لے کر مولانا حسین احمد صاحب سے ملاقات کرو۔ دہلی جانے کے لئے مجھے اور مولانا شبیر علی صاحب اور مولانا مفتی عبدالکریم صاحب مفتی خانقاہ تھانہ بھوَن کو منتخب فرمایا، جیب سے پچاس روپیہ نکال کر بڑی اُمنگ اور آرزو کے ساتھ دیئے اور بہت ہی نرمی کے ساتھ فرمایا کہ خوب مٹھائی کھاتے ہوئے دہلی جاؤ اور اس مقصد میں جدوجہد کرو۔ واقعہ طویل ہے، اس کی حکایت مقصود نہیں، ظاہر یہ کرنا ہے کہ اکابرِ جماعت بھی جو حضرت مفتی صاحب سے طبقے میں اُوپر تھے ان کے علم و ذکاء کے گرویدہ اور معتقد تھے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے جب انگریزوں سے ترکِ موالات

کا استفتاء پیش کیا گیا تو غایت انکسارِ نفس اور حدود شناسی کے ساتھ فرمایا کہ مجھے انگریزوں سے غیر معمولی بغض و نفرت ہے، ان کے بارے میں فتویٰ دینے میں مجھے اپنے نفس پر اعتماد نہیں ہے کہ وہ حدود کی رعایت رکھ سکے، درآں حالیکہ قرآنِ حکیم کا فیصلہ ہے کہ: "اِعْدِلُوْا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى"۔ اور یہ فرمایا کہ اپنے مخصوص تلامذہ میں سے فتویٰ لکھنے کے لئے جن تین حضرات کا نام لیا ان میں اوّلین نام حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تھا۔ گویا حضرت کو اپنے نفس پر اس بارے میں اتنا اعتماد نہ تھا، جتنا اُن پر تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اپنے نفس پر بے اعتمادی یہ عین کمال بلکہ منتہائے کمال اور احتیاط و تقویٰ کی اعلیٰ ترین مثال ہے، اور اس لئے فتویٰ صادر فرمانا درحقیقت ایسے ہی اہل اللہ کا حق تھا۔

مگر اسی سے ظاہر ہے کہ ایسے اکابر جن پر خود اعتماد فرمائیں اور اپنے مقابلے میں اعتماد کا اظہار کریں وہ کتنے محتاط اور متدین ہوں گے؟ کسی کے مقبول عنداللہ ہونے کی علامت ہی یہ ہے کہ خواص اہل اللہ کے قلوب میں اس کی وقعت اور منزلت قائم ہو۔

اس سے واضح ہے کہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اپنے چھوٹوں یا ہم عصروں ہی میں معتمد علیہ نہ تھی بلکہ اپنے اساتذہ و شیوخ اور اپنے سے اُوپر کے طبقات میں بھی قابلِ اعتماد اور لائقِ بھروسہ تھی، اور بڑے چھوٹے سب یہ ان کے علم و فضل، اعتدال، رعایتِ حدود اور موقع شناسی کے قائل تھے، جن کے چھوٹے ایسے تھے ان کے بڑے کیسے ہوں گے، اور جن کے بڑے ایسے تھے ان کے چھوٹوں کا کیا کہنا؟

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کی علمی ذکاوت اور تفقہ فی الدین کی خداداد قوّت مشکل سے مشکل مسائل کی گتھیوں کو چٹکیوں میں سلجھادیتی تھی۔ ۱۹۳۰ء کے اجلاس جمعیۃ علماء لاہور کی سبجیکٹ کمیٹی میں کسی مسئلے کے ضمن میں حضرت مفتی صاحب

اور مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری (اہل حدیث) کے درمیان مسلک کے بارے میں ایک بحث آپڑی تو علماء جانتے ہیں کہ حضرت مفتی صاحبؒ نے برجستگی کے ساتھ کیا کیا باریکیاں اور نکات اس میں پیدا کئے اور کس کس طرح مرتجلاً حقائقِ فقہ بیان فرمائے کہ علماء بھی حیران تھے اور مولانا ثناء اللہ صاحب بھی مداح تھے کیونکہ وہ خود بھی ذہین و فطین تھے۔

فوجوں کی طرف سے وہیل مچھلی کے بارے میں اِستفتاء کیا گیا جس کا نام وہ نہیں جانتے تھے، صرف یہ کہ ایک مہیب قسم کا دریائی جانور جس کی صفات فلاں فلاں ہیں جائز ہے یا نہیں؟ حضرت مفتی صاحبؒ نے اس کے بارے میں لغوی، فقہی اور تاریخی تحقیقات پر مشتمل جو فتویٰ لکھا اور اس وہیل کو وہ مچھلی ثابت کیا جو قرنِ اوّل میں صحابہؓ کے لئے خدا نے دریا سے نکال کر کنارۂ سمندر پر پھینک دی تھی اور ''عنبر'' کے نام سے یاد کی گئی تھی، تو علماء جانتے ہیں کہ یہ تدقیق انہی کا حصہ تھا۔

۱۳۵۸ھ میں احقر کے سفرِ افغانستان کے موقع پر جبکہ میں کابل میں تھا صدرِ اعظم سردار محمد ہاشم خاں صاحب کے یہاں مدعو تھا، حاضرینِ مجلس میں سے بعض ذمہ دارانِ حکومت نے علمائے ہند کو سیاسی اور قومی حیثیت سے کچھ معطل اور جامد ثابت کرنے کی طرف اشارے کئے تو میں نے وقت کے مجاہد اور مفکر علماء کی فہرست اور ان کے کارنامے شمار کرتے ہوئے جب حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سیاسی فکر و تدبر اور قومی جدوجہد کا ذکر شروع کیا تو سب کے سر جھک گئے اور بالآخر انہیں علماء کی سیاسی، قومی اور ملکی مساعی کو ماننا پڑا۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند سے ۱۳۱۵ھ میں فارغ التحصیل ہوکر نکلے جو احقر کی پیدائش کا سال ہے، فراغِ تحصیل کے بعد ایک عرصہ تک شاہجہاں پور اپنے وطن میں درس و تدریس کی خدمات انجام دیں، آپؒ کے اس دور کے تلامذہ میں جہاں علماء و فضلاء ہیں وہیں گریجویٹ بھی ہیں جن میں سے جناب حافظ ذاکر علی صاحب آپؒ کے ممتاز شاگرد ہیں، جو شاہجہاں پور

کے بااثر اور مشہور وکلاء میں سے ہیں۔ میں نے ان کی ہی زبانی سنا کہ اُسی زمانے میں شاہجہاں پور میں کوئی عیسائی پادری آ گیا، اور اُس نے اسلام اور مسلمانوں کو چیلنج کیا، وہ اپنی لائن کا فاضل تھا، ہر ایک کو اس کے سامنے آنے کی جرأت نہ ہوئی، حضرت مفتی صاحبؒ اس وقت ایک غیر معروف مدرّس تھے، بحثوں اور مناظروں سے الگ تھلگ ہمہ وقت درس و مطالعے میں وقت گزارتے تھے، کسی کو یہ تصوّر بھی نہ تھا کہ وہ پادری کے مقابل آ جائیں گے، لیکن پادری کی تحدی سن کر حضرت مفتی صاحبؒ میدان میں آ گئے اور اس طرح اس سے نبرد آزما ہوئے کہ بحث و مناظرہ میں اسے عاجز کر دیا، حتیٰ کہ خود اِنجیل کے حوالوں سے اس پر حجتیں قائم کر دیں۔ یہ انتہائی ذکاوت کی بات تھی کہ وقت کے وقت اِنجیل کا مطالعہ اس گہری نظر سے کیا کہ آدھ شب ہی میں اس سے اِستخراجِ مسائل اور اِتمامِ حجت پر قدرت حاصل کر لی، جس سے پادری کا منہ بند ہو گیا اور وہ شکست کھا کر فراری ہوا، اس مناظرے سے حضرت مفتی صاحبؒ کی ذکاوت کا چرچا ہوا۔ شاہجہاں پور کے بعد حضرت ممدوح مدرسہ امینیہ دہلی میں بحیثیت صدر مدرّس تشریف لائے، اور تقریباً ۵۲ برس اِستقامت کے ساتھ دہلی میں مسندِ درس و اِفتاء پر بیٹھ کر خواص و عوام کی قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ آپؒ کے درس اور بالخصوص درسِ حدیث کی یہ خصوصیت تھی کہ نہ لمبی تقریر فرماتے، نہ بیان میں طول ہوتا، بلکہ اپنے اُستاذ (شیخ الہندؒ) کے نقشِ قدم پر مختصر تقریر اور توجیہاتِ حدیث کے سلسلے میں نہایت مختصر، جامع اور آخری توجیہ بیان فرما دیتے، جس سے حدیث کا مغز طالبِ علم کے مغز میں اُتر جاتا تھا اور مستفید کی اِستعداد مضبوط ترین اِستعداد بن جاتی تھی۔ اسی ذیل میں تصانیف کا سلسلہ بھی قائم رہا، اور متعدّد مفید رسالے تألیف فرمائے جن میں سے ''تعلیم الاسلام'' آپؒ کی بہترین تألیف ہے جو عموماً دِینی اور قومی مدارس میں ابتدائی نصاب کا جزو اور مقبولِ عام ہے۔ آپؒ کے ادیبانہ قصائد و اَشعار سے دِینی رسالے مزین ہوئے، ''القاسم'' دورِ اوّل میں بھی آپؒ کے

بعض عربی قصائد طبع ہوئے ہیں، ایک قصیدے کا مطلع یہ ہے:-

عرفت اللہ ربی من قریبٍ　　　فکم بین الالٰہ والعبیدِ

اُردو میں بھی کبھی کبھی اَشعار موزوں فرماتے جیسا کہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی کی ملتان جیل سے رہائی کے وقت (جبکہ وہ اور مفتی صاحبؒ دونوں اَسیرِ حکومت کی حیثیت سے ملتان جیل میں تھے اور موصوف کے لئے مفتی صاحبؒ سے پہلے رہائی کا حکم آ گیا) اُردو کا قصیدہ لکھ کر انہیں ایک جلسے میں سنوایا جو جیل ہی میں منعقد کیا گیا، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب ممدوح کے نام کا نہایت ہی موزوں مسجع بھی حضرت مفتی صاحبؒ نے خود ہی موزوں فرمایا، جو یہ ہے:-

خدمتِ خلق بود خلق حبیب الرحمان

جس سے ان کی اَدبیت اور طبعیت کی موزونیت واضح ہے۔ ان ہمہ وقت کی علمی اور درسی مصروفیات نے آپ کو قومی درد اور قومی خدمات سے کبھی غافل نہیں رکھا، تحریکِ خلافت کے وقت آپ نے نہ صرف ملک وقوم کی سیاسی خدمات انجام دیں، بلکہ جماعتِ علماء میں سیاسی تحریکات اور قومی خدمات کے سلسلے میں آپؒ کی حیثیت ایک بانی کی حیثیت ہے۔ ۱۹۱۹ء میں آپؒ نے جمعیۃ علمائے ہند کی بنیاد ڈالی اور امرتسر میں اس کا پہلا اجلاس منعقد کیا جس میں آپؒ جمعیۃ علماء کے منتخب (حضرت مفتی صاحبؒ حضرت شیخ الہندؒ کی وفات تک جمعیۃ علمائے ہند کے عارضی صدر رہے) صدر قرار پائے، اور ۱۹۱۹ء سے لے کر ۱۹۳۹ء تک بلافصل آپؒ ہی جمعیۃ علماء کے صدر منتخب ہوتے رہے جو سیاسی خدمات کی لائن میں علمائے ہند کے یہاں آپؒ کے مقبولِ عام اور معتمد علیہ خاص ہونے کی دلیل ہے، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپؒ کی طبیعت کے اعتدال اور جامعیت نے جمعیۃ علمائے ہند کا دائرۂ اثر وسیع سے وسیع تر کردیا جس کو نہ صرف ہندوستان کے ہر طبقے کے علماء نے اپنا سیاسی مرکز تسلیم کرلیا بلکہ بیرونِ ہند تک جمعیۃ علماء کی مرکزیت اور سیاسی نہضت تسلیم کرلی گئی۔

۱۹۲۴ء میں جب سلطان ابنِ سعود نے مؤتمر عالمِ اسلامی کا اجلاس مکہ مکرّمہ میں طلب کیا تو آپؒ کو بحیثیت صدر جمعیۃ علماء خصوصی طور پر دعوت دی گئی۔ ۱۹۳۸ء میں مصر میں جب عالمِ اسلام کا ایک مشترک اجلاس بلایا گیا تو آپؒ کو اس کی صدارت کے لئے چنا گیا، جن سے واضح ہے کہ مذہبی اور ملکی دونوں حیثیت سے علمائے ہند و بیرونِ ہند اور سیاسی زعماء بلکہ قائدینِ سیاست آپ کو اپنا مُسلّمہ رہنما اور معتمد علیہ زعیم سمجھتے تھے۔

اس سب پر مستزاد یہ کہ آپؒ مرکزِ علومِ دینیہ دارالعلوم دیوبند کی انتظامی (مجلسِ شوریٰ) کے رکنِ رکین تھے اور اکثر و بیشتر آپؒ کی موجودگی میں مجالسِ شوریٰ کی صدارت آپؒ ہی کے لئے مخصوص رہتی تھی۔ گویا آپؒ علمی، دینی، سیاسی اور انتظامی مجالس کے ایک بنے بنائے صدر تھے کہ صدارت آپؒ سے اور آپؒ صدارت سے متجاوز نہ ہوتے تھے۔ اس کا منشا حضرت ممدوح کی عظمت کے ساتھ ساتھ یہ بھی تھا کہ مجلسی تجاویز کے بنانے میں آپؒ کی قابلیت ممتاز اور مُسلّمہ تھی۔ ماقل و دلّ الفاظ کے ساتھ ایسی جامع تجویز لکھتے تھے کہ واقعات کا خلاصہ، مباحث کا نچوڑ اور منشاء مجوّزین کا فحوی پورا کا پورا اس میں سمایا ہوتا تھا۔ بہت سی ایسی معمالات پیچیدگیاں جو بظاہر لاینحل نظر آتی تھیں، ان کے اعتدالِ مزاج اور علمی اِستحضار کی بدولت بآسانی حل ہوجاتی تھیں۔ رائے فیصلہ کن دیتے تھے اور پھر اسے ایسی خوبصورتی سے قلم بند فرماتے تھے کہ گویا اس میں کوئی نزاع و جدال تھا ہی نہیں، اور سب ہی اس پر متفق ہوجاتے تھے۔

اخلاقی حیثیت سے نہایت وقور، غیور اور باوضع تھے، اپنے چھوٹوں سے خلق و اَدب سے پیش آتے تھے، عام حالات میں ساکت و صامت اور خاموش رہتے تھے اور جب بولتے تو سنجیدگی میں ڈوبا ہوا کلام کرتے اور بقدرِ ضرورت بولتے تھے۔ اس علم و فضل پر سادگی اور بے تکلفی یہ تھی کہ اپنے لئے کوئی ممتاز وضع نہیں بنائی، عام سادہ لباس، بے تکلف معاشرت اور وہی طالب علمانہ زندگی مرتے دَم تک قائم رکھی۔ سفرِ

دہلی کے موقع پر جب کبھی احقر ان کے دولت خانے پر ملنے کے لئے چلا گیا تو اس طرح پیش آتے تھے کہ گویا وہ خورد ہیں اور آنے والا بزرگ ہے۔ اس شخصیت اور علم و وقار پر سادگی کا یہ عالم تھا کہ اپنے گھر کا سودا اور سامان خود ہی بازار سے خرید کر لاتے تھے۔ اس دورِ آخر میں دارالعلوم دیوبند کے مشہور مفتیٔ اعظم اور میرے اُستاذ حضرت الحاج الشیخ مولانا عزیزالرحمٰن صاحب عثمانی دیوبندی قدس سرہٗ کی سادگی اپنے وقت میں ضرب المثل تھی، شیخِ وقت اور مفتیٔ ہند ہونے کے باوجود حضرتِ ممدوح کا روزانہ کا معمول تھا کہ بعد نمازِ عصر اپنے گھر کا سودا اور ضروریاتِ خانہ خود بازار تشریف لے جا کر خریدتے حتیٰ کہ محلّہ کی غریب عورتوں اور بیواؤں سے پوچھتے پھر جاتے کہ کسی کو بازار سے کچھ منگانا ہو تو کہہ دیں۔ غریب پردہ نشین عورتیں روزمرّہ کے خورد و نوش، نمک مرچ، سبزی ترکاری وغیرہ کے لئے پیسے حوالہ کر دیتیں اور حضرت مفتیٔ اعظم اپنے گھر کی ضروریات کے ساتھ محلّہ کے ان گھرانوں کا سامان بھی خود ہی خریدتے، خود ہی اُٹھا کر لاتے اور گھر گھر گھوم کر خود ہی پہنچا آتے۔ اس بے مثال بے نفسی کا عملی نمونہ اس دور میں حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہؒ تھے، آپؒ کا بھی علاوہ اور سادگیوں اور بے تکلفیوں کے یہ روزانہ کا معمول تھا کہ اپنے گھر کا روزانہ کا سامان خورد و نوش، سبزی ترکاری وغیرہ اور ساتھ ہی جس نے آپ سے کچھ منگوانا چاہا وہ بھی خود ہی بازار جا کر خریدتے، زنبیل ہاتھ میں رہتی، سامان سے بھر کر ہاتھ میں لٹکا کر بازار سے لاتے اور کبھی بھی انہیں اپنی شخصیت اور اپنی مُسلّمہ قابلیت و عظمت کا دھیان نہ آتا تھا کہ وہ مفتی اعظم ہند، صدر مدرسہ امینیہ دہلی، صدر مجلسِ شوری دارالعلوم دیوبند اور عالمِ اسلام کی متعارف شخصیت ہیں۔

اس عظمت پر یہ بے نفسی اور فروتنی اسی ذات سے متوقع ہو سکتی ہے جس میں علم کے ساتھ پاکیزگیٔ نفس کا اخلاقی جوہر بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہو۔ ورنہ فی زمانہ اگر کسی شخص کو چار آدمی پوچھنے لگیں یا اتفاق سے کسی اخبار یا اشتہار میں اس کا نام

آ جائے تو اسے سڑک پر پیدل چلنا بھاری ہوجاتا ہے، چہ جائیکہ ہاتھ میں بوجھل زنبیل لٹکا کر اپنے ہی معتقدوں اور نام لیواؤں کے درمیان سے بے تکلف گزر جانا اور گزرتے رہنا۔ یہ کسرِ نفسی انہیں قدسی صفت انسانوں کو دی جاتی ہے جنھیں حق تعالیٰ اپنے دِین کی مخصوص مہمات کے لئے منتخب فرمالیتے ہیں، اس کے مخصوصین قباءِ شاہی اور رسمی کرّ وفر میں نہیں بلکہ گدڑیوں، کمبلوں اور عام وضع کے سادہ کُرتوں ہی میں نمایاں ہوتے ہیں، وہ اِس جہان میں مساکین ہوتے ہیں، مگر اُس جہان میں سلاطین، اور اگر قلوب کی دُنیا میں تلاش کیا جائے تو اس جہانِ فانی میں بھی وہ سلطان ہی ہوتے ہیں، حتیٰ کہ سلاطین خود بھی ان کے آگے جھکتے ہیں، فرق یہ ہے کہ سلاطین اپنے تیغ و تفنگ سے قبضہ پاتے ہیں، اور وہ بھی صرف اَجسام پر، اور یہ اپنی خاموش زندگی اور اِخلاص کی زبان سے قبضہ پاتے ہیں اور اَجسام پر نہیں بلکہ دِلوں اور جانوں پر۔

مبین حقیر گدایان عشق راکیں قوم
شہان بے کمر و خسروانِ بے کلہ اند

اسی انتخابِ خداوندی کا یہ اثر ہوتا ہے کہ مخلوق بھی ہر اچھے منصب، ہر اچھی خدمت اور ہر اچھی ذمہ داری کے لئے انہیں ہی منتخب کرتی ہے۔ یہ چند سطریں حضرت مفتی صاحبؒ کی سوانح نہیں، ان کے مناقب کی داستان نہیں، اس کے لئے دفتروں کی ضرورت ہے، یہ تو صرف "اُذکروا محاسن موتاکم" کے تحت ان کے تذکرے سے اپنے دِلوں کی تسلی اور تسکین ہے اور بس۔ تذکرہ ان کا ہمیشہ رہے گا، ہر زبان اور قلم پر رہے گا، جب اللہ کا ذکر ہوگا تو ان اللہ والوں کا بھی ذکر ہوگا، اور اللہ کا ذکر دائمی ہے تو یہ بھی اپنے ذکر کے لحاظ سے دائمی ہیں۔ یہ چند سطری تذکرہ اسی دوامی ذکر کی ایک شاخ ہے، جس کا مقصد محض یاد ہے، استقصاءِ ذکر نہیں، اور نہ وہ ان سطروں میں ہو ہی سکتا ہے۔ ایک جامع شخصیت کا ذکر ایک شخص کیا کرسکتا ہے، پوری جامعہ بشری کرتی ہے، چنانچہ آج حضرت مفتی صاحبؒ کی وفات کو کوئی ایک حلقہ ہی نہیں رو رہا ہے، علمی

حلقے الگ ماتم کناں ہیں، انتظامی دائرے الگ پژمردہ ہیں، خواص الگ اشکبار ہیں، اورعوام الگ سوگوار ہیں، جامع کو جوامع ہی روتے ہیں کیونکہ حضرت مفتی صاحب فرد نہیں تھے، اُمت تھے، اس لئے یہ رونا پوری ہی اُمت کا ہے، کسی فرد کا نہیں۔

لیس علی اللہ بمستنکر　　أن یجمع العالم فی واحدٍ

حق تعالیٰ حضرتِ مرحوم کو اعلیٰ غرَفِ فردوس میں جگہ عطا فرمائے، مقامِ صدق میں اپنی نزدیکی بخشے اور رحمتوں کی بارش ان پر ہمیشہ ہمیشہ برستی رہے، آمین۔

(ماہنامہ ''القاسم'' نوشہرہ، مفتیٔ اعظم نمبر)

اِمام العصر حضرت مولانا سیّد محمد انور شاہ کشمیریؒ

حضرت الاُستاذ الاکبر علامہ مولانا سیّد محمد انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرہٗ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کی مبارک ہستی نہ کسی تعارف کی محتاج ہے، نہ کسی تاریخ کی دست نگر، ان کی حقیقی تاریخ ایک پیروں چلتی تاریخ ہے، جو ان کے تلامذہ اور مآثرِ علمی کی صورت میں ہمہ وقت دائر و سائر، نمایاں اور چشم دید رہتی ہے۔ اس اُمتِ مرحومہ میں لاکھوں علماء و فضلاء پیدا ہوئے اور اپنے نورانی آثار دُنیا کے لئے چھوڑ گئے، لیکن ایسی ہستیاں معدودے چند ہیں جن کا فیض عالمگیر اور محبوبیت عام قلوب کی امانت ہو اور جن کے علم کے ساتھ ساتھ عمل سے بھی اُمت نے استفادہ کیا ہو۔ حضرت اِمام العصر علامہ انور شاہ صاحبؒ کی ہستی انہیں مبارک اور معدودے چند ہستیوں میں سے ایک ممتاز ہستی ہے جو صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں اور صدیوں کو علم و فضل سے رنگین کر جاتی ہیں۔ حضرتؒ کا علم اگر متقدمین کی یاد تازہ کرتا تھا تو ان کا عمل سلف صالحین کو زندہ کئے ہوئے تھا، اور اُسوۂ سلف کے لئے نمونہ ساز تھے۔ علم، حافظہ، تقویٰ و طہارت اور زُہد و قناعت مثالی تھی۔ علمی حیثیت سے ہم تلامذہ انہیں چلتا پھرتا کتب خانہ کہا کرتے تھے، اور عملی حیثیت جو ہمہ جہت اِتباعِ سنت کے نور میں ڈھلا ہوا تھا، اکثر و بیشتر ان کے عمل ہی سے مسائل معلوم کر لیتے تھے، اور مسئلہ وہی نکلتا تھا جو ان کا عمل ہوتا تھا۔ ان کے روشن چہرے پر ایمان کی چمک اس طرح نمایاں تھی کہ غیر مسلم بھی دیکھ کر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے تھے کہ اگر اسلام مجسم صورت میں آتا تو وہ علامہ انور شاہ کی صورت میں ہوتا۔ ہمارے شیخ و مربی حضرت حکیم الاُمت مولانا اشرف

علی تھانوی قدس سرہٗ فرماتے تھے کہ: ''ہمارے زمانے میں مولانا انور شاہ صاحب کا وجود اسلام کی حقانیت کی دلیل ہے۔''

آج سے ستر اَسّی سال قبل جبکہ حضرت الأستاذ قبلہ شاہ صاحبؒ جوان عمر تھے، مظفرنگر کے ایک جلسۂ مناظرہ میں جو مسلمانوں اور آریوں کے درمیان ہوا تھا، حضرت علامہ مرحوم بھی دارالعلوم دیوبند کی طرف سے اپنے اُستاذ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہٗ کے ساتھ شرکتِ جلسہ کے لئے تشریف لے گئے اور اِسٹیج پر تشریف فرما تھے، تو آریہ مبلغ نے کھلے لفظوں میں کہا تھا کہ اگر کسی کی صورت دیکھ کر اسلام قبول کیا جاتا تو آج بھی مولانا انور شاہ کی صورت دیکھ کر مسلمان ہوجانا چاہئے تھا جن کے چہرے پر ہی اسلام برستا ہوا دِکھائی دیتا ہے۔ درسِ حدیث کے لئے جب حضرت شاہ صاحبؒ اپنے قیام کے کمرے سے درس گاہ کی طرف چلتے ہوئے نظر آتے تو ہم لوگوں میں ایک دُوسرے کو آمد کی اطلاع دینے کے لئے بے ساختہ جو کلمہ زبان زد تھا وہ یہ تھا کہ ''جاء الشیخ الثقة الأمین'' جو درحقیقت ان کے ظاہری و باطنی کمالات کی وجہ سے خودبخود قلوب میں وضع ہوگیا تھا۔ درس میں اس وقار سے بیٹھتے جیسے کوئی پُررُعب و ہیبت بادشاہ اپنی رعایا کے سامنے تخت نشین ہو، کلام نہایت باعظمت، متین اور علمی مواد سے لبریز ہوتا اور نقل و رُواۃ کی قسم سے جو بھی دعویٰ فرماتے اسی وقت کتبِ متعلقہ کھول کر اس کی عبارت سامنے کردیتے۔ کتبِ حدیث کا ڈھیر خصوصیت سے سامنے رکھا ہوا ہوتا تھا۔ درس میں تبحر اور تفقّہ دونوں یکساں چلتے تھے۔ درسِ حدیث فقط فنِ حدیث تک محدود نہ تھا بلکہ جمیع علوم و فنون کے حقائق پر مشتمل تھا۔ میں خود حضرتؒ کی تقریر قلم بند کرتا تھا، اپنی کاپی کی طوالت عنوانات سے بچانے کے لئے تقریباً سات کالموں میں تقسیم کر رکھا تھا اور ہر کالم پر عنوانات کے عنوان دیئے ہوئے تھے، جیسے فنِ صرف و نحو، فنِ معانی و بلاغت، فنِ تفسیر و حدیث، فنِ فقہ و اُصولِ فقہ، فنِ منطق و فلسفہ اور فنِ ہیئت و ریاضی اور فنِ تاریخ وغیرہ، کیونکہ اہم مسائل میں ان

فنون کے مسائل تقریباً ہر روز آتے تھے، جو مسئلہ جس فن کا ہوتا میں اسی کالم میں اس کا اندراج کرلیتا اور درس سے اُٹھ کر یہ معلوم ہوتا کہ ہم لوگ صرف حدیث ہی پڑھ کر نہیں آئے بلکہ جمیع فنونِ متداولہ کا درس لے کر آرہے ہیں۔

لیس علی اللہ بمستنکر   أن یجمع العالم فی واحدٍ

رُوئیداد دارالعلوم میں حضرت شاہ صاحبؒ کے بارے میں لکھا ہے کہ:-

''حضرت شاہ صاحبؒ کشمیر کے ایک ممتاز علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، آپؒ کے والد بزرگوار مولانا سیّد معظم شاہ ایک جید عالمِ دِین اور عارفِ کامل تھے۔ حضرت شاہ صاحبؒ بچپن ہی سے غیر معمولی ذہانت و ذکاوت اور بے مثل قوتِ حافظہ کے مالک تھے۔ آپؒ ۱۳۱۰ھ - ۱۸۸۴ء میں دیوبند تشریف لائے، حضرت شیخ الہندؒ مسندِ صدارت پر متمکن تھے۔ اُستاذ نے شاگرد کو اور شاگرد نے اُستاذ کو پہلی ہی ملاقات میں پہچان لیا، تفسیر و حدیث کی کتابیں شروع کیں اور چند ہی سال میں دارالعلوم میں شہرت و مقبولیت کے ساتھ ایک امتیازی شان حاصل کرلی۔ ۱۳۱۴ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہوکر آپؒ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سندِ حدیث کے علاوہ باطنی فیوض سے بھی مستفیض ہوئے اور خلافت حاصل کی۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد آپؒ نے مدرسہ امینیہ دہلی میں فرائضِ تدریسی انجام دیئے۔ پھر حجِ بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے اور ۱۳۲۷ھ سے دارالعلوم دیوبند میں درس و تدریس کی خدمت انجام دینے لگے، اور حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کے خصوصی مہمان کی حیثیت سے رہے۔ ۱۳۳۳ھ - ۱۹۱۵ء کے اَواخر میں جب حضرت شیخ الہندؒ نے سفرِ حجاز کا قصد کیا تو اپنی جانشینی کا فخر حضرت شاہ صاحبؒ کو بخشا۔ دارالعلوم کی مسندِ صدارتِ حدیث پر تقریباً ۱۲ سال تک آپؒ جلوہ افروز رہے۔ ۱۳۴۶ھ - ۱۹۲۷ء کے اَوائل میں اہتمامِ دارالعلوم سے بعض اختلافات کے باعث آپؒ فرائضِ صدارت سے دست کش ہوکر جنوبی ہند کے مدرسہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل

میں تشریف لے گئے اور ۱۳۱۵ھ-۱۹۳۲ء تک وہاں درسِ حدیث کا مشغلہ جاری رہا۔ قدرت کی جانب سے آپؒ کو حافظہ ایسا عدیم النظیر بخشا گیا تھا کہ ایک مرتبہ دیکھی ہوئی کتاب کے مضامین و مطالب تو درکنار عبارتیں تک مع صفحات و سطور کے یاد رہتیں، اور دورانِ تقریر بے تکلف حوالے دیتے چلے جاتے تھے، اسی کے ساتھ مطالعے کا اس قدر شوق تھا کہ جو علوم کے خزانے ان کے دامنِ جستجو کی وسعتوں کو مطمئن اور تشنگیٔ علم کو سیراب نہ کرسکتے تھے، کثرتِ مطالعہ اور قوّتِ حافظہ کے باعث گویا ایک متحرک و متکلم کتب خانہ تھے۔ صحاحِ ستہ کے علاوہ حدیث کی اکثر کتابیں تقریباً برنوکِ زبان تھیں، تحقیق طلب مسائل میں جن کی جستجو اور تحقیق میں عمریں گزر جاتی ہیں، مسائل کے اِستفسار پر چند لمحوں میں اس قدر جامعیت کے ساتھ جواب دیتے تھے کہ اس موضوع پر سائل کو نہ تو شبہ باقی رہتا تھا اور نہ کتاب دیکھنے کی ضرورت، پھر مزید لطف یہ کہ کتابوں کے ناموں کے ساتھ صفحات و سطور تک کا حوالہ بھی بتلادیا جاتا تھا، وہ ہر ایک علم و فن پر اسی طرح برجستگی کے ساتھ تقریر فرماتے تھے کہ گویا ان کو یہ تمام علوم مستحضر ہیں اور ابھی ابھی ان کا مطالعہ کیا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے علمی ذوق کا طبیعت پر اس قدر غلبہ تھا کہ عرصے تک نکاح اور متاہلانہ زندگی سے گھبراتے رہے، مگر بالآخر بزرگوں کے شدید اصرار سے ۴۳ سال کی عمر میں متاہلانہ زندگی اختیار فرمائی تھی اور اس کے بعد تنخواہ لینے لگے تھے۔ ڈابھیل میں چند سال قیام فرمانے کے بعد آخر میں اَمراض کی شدّت سے مجبور ہوکر دیوبند جس کو آپ نے اپنا وطنِ اِقامت بنالیا تھا چلے آئے اور یہیں ۳/صفر المظفر ۱۳۵۲ھ-۱۹۳۳ء کو تقریباً ۶۰ سال کی عمر میں رحلت فرمائی، مزارِ مبارک عیدگاہ دیوبند کے قریب ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے دورِ صدارتِ تدریس میں ہزار سے زائد طلباء کو درسِ حدیث پڑھایا، جن میں ممتاز تلامذہ کے اسمائے گرامی یہ ہیں: حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ، حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ، مولانا سیّد بدرِ عالم

میرٹھی، مولانا سیّد مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ، مولانا مفتی محمد حسن امرتسریؒ، مولانا شبیر علی تھانویؒ، مولانا عبدالرحمٰن کامل پوریؒ، مولانا محمد یوسف بنوریؒ، مولانا محمد انوریؒ، حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ، مولانا سیّدؒ، مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ، مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا محمد میاں دیوبندیؒ اور مولانا مفتی محمد نعیم لدھیانوی وغیرہ۔

مختصر یہ کہ حضرت شاہ صاحبؒ دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرّسین اور حضرت شیخ الہندؒ کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے، تمام علوم معقولات ومنقولات میں کامل دستگاہ رکھتے تھے، اور قوتِ حافظہ میں یگانہ روزگار تھے۔ کئی مشہور محققانہ کتابوں کے مصنف تھے، ان کا درسِ حدیث اپنے دور کا مشہور درس تھا، جو ایک خاص امتیازی طرز لئے ہوئے تھا۔ آپؒ کے تبحرِ علمی نے درسِ حدیث کو جامعِ علوم وفنون بنادیا تھا اور آپؒ کے درس نے نقل و روایت کی راہ سے آنے والے فتنوں کے لئے آنے کی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔ آج بھی نمایاں اور ممتاز علماء اور صاحبِ طرز فضلاء زیادہ تر آپؒ ہی کے تلامذہ ہیں جو ہند و پاک میں علمی مسندوں کو آراستہ کئے ہوئے ہیں۔ آپؒ کے یہاں رَدِّ قادیانیت کا خاص اہتمام تھا، اور اس فتنے کو اعظم الفتن شمار کرتے تھے، اس سلسلے میں کئی معرکۃ الآراء کتابیں خود بھی تصنیف فرمائیں اور بڑے اہتمام کے ساتھ اپنے تلامذہ سے بھی لکھوائیں۔ اس بارے میں بڑے شغف کے ساتھ لکھنے والوں کو علمی مدد دیتے تھے، حضرت مفتی شفیع صاحبؒ، حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ اور حضرت مولانا سیّد بدر عالم صاحب میرٹھی مہاجرِ مدنیؒ نے خصوصیت سے حضرت شاہ صاحبؒ کی رَدِّ قادیانیت تحریک میں عملی حصہ لیا اور تحریر وتقریر کے ذریعے اس فتنے کی سرکوبی کے لئے سرگرمی سے کام کرتے رہے۔ الغرض حضرت شاہ صاحبؒ کی آخری زندگی تردید قادیانیت میں صَرف ہوئی اور انہیں کامل شغف اس فتنۂ کبریٰ کے استیصال سے رہا، جس سے حضرت شاہ صاحب مرحوم کا بغض فی اللہ نمایاں

ہو جاتا ہے، جو محبتِ حضرت خاتم الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک واضح نشان اور ورثہ انبیاء کی کھلی دلیل ہے۔ حضرتؒ کے اس سلسلے کے مضامین و مقالات جن کا تعلق تردیدِ قادیانیت سے ہے، خصوصاً مقدمہ بہاول پور میں انہوں نے کئی روز مسلسل رَدِّ قادیانیت اور قادیانیوں کے کفر کے اِثبات میں جو نہایت پُرمغز اور علمی بیانات کیے، ان کے اہم اقتباسات حضرت شاہ صاحبؒ کے صاحبزادے مولانا سیّد انظر شاہ صاحب نے اپنی تالیف "نقشِ دوام" میں جمع کر دیئے ہیں، جن سے قادیانیت کے متعلق اکابرِ دارالعلوم دیوبند کا نقطۂ نظر مدلل طور پر سامنے آ گیا ہے اور ساتھ ہی متعلقہ علوم اور اُصول و مقاصدِ دِین بھی واشگاف ہو گئے ہیں۔

(مأخوذ از "دارالعلوم دیوبند کی مثالی شخصیات" (ص:۱۲۴ تا ص:۱۲۹)

حکیم الاُمت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ

حکیم الاُمت مجدّد الملّت حضرتِ اقدس مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہٗ کی شخصیت اور ذاتِ گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، حضرتؒ کی ذاتِ والا صفات یگانہ روزگار اور ''آفتاب آمد دلیلِ آفتاب'' کی مصداق ہے۔

حضرتِ اقدس حکیم الاُمت تھانویؒ شریعت وطریقت کے مجمع البحرین، جامعِ علم وعرفان اور دینی بصیرت و فقاہت، تقویٰ و طہارت کے درجۂ کمال پر فائز تھے، حضرتِ والا کے علم وفضل اور زُہد وتقویٰ کو دیکھ کر اسلافِ کرام کی یاد تازہ ہوجاتی تھی، حضرتِ والا تھانوی قدس سرہٗ بجا طور پر سلف صالحین کے علوم و فیوض کے امین اور وارث تھے، حضرتؒ کی کیمیا اثر صحبت اور بابرکت تعلیمات سے ہزارہا بندگانِ خدا کو یقین ومعرفت کی لازوال دولت میسر آئی اور بہت سے تشنگانِ معرفت کو اس چشمۂ عرفان سے سیرابی وشادابی ہوئی۔

معاملات و معاشرت و سیاست، عقائد وعبادات غرض کہ دِین کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں حضرتِ والا قدس سرہٗ کی گراں قدر تجدیدی خدمات موجود نہ ہوں، اور دِین کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں حضرتؒ نے تجدید و اصلاح نہ کی ہو اور اپنی تالیفات وملفوظات ومواعظ میں ان کے بارے میں ہدایات نہ دی ہوں، ہر شعبے میں آپؒ کی تصانیف موجود ہیں، تفسیر، حدیث، فقہ، تصوّف وسلوک، قراءت و مجموعہ، منطق وفلسفہ وغیرہ تمام علوم وفنون میں حضرت حکیم الاُمت قدس سرہٗ کی مجدّدانہ اور حکیمانہ تحقیقات عصرِ حاضر کا بے مثال منفردانہ، مصلحانہ، عظیم الشان کارنامہ ہے۔

حضرتِ والا حکیم الاُمت تھانوی قدس سرہٗ کی ذکاوت و ذہانت کے آثار بچپن ہی سے نمایاں تھے۔ حضرتؒ نے ۱۲۹۹ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی تھی اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے حضرتِ والاؒ زیادہ مستفید ہوئے ہیں۔ پھر حضرتِ والاؒ ۱۳۰۱ھ میں مدرسہ فیضِ عام کانپور میں صدر مدرّس مقرّر ہوئے اور پھر مدرسہ جامع العلوم کی مسندِ صدارت کو زینت بخشی۔ کانپور میں حضرتِ والاؒ کے درسِ حدیث کی شہرت سن کر دُور دراز سے طلباء کھنچے چلے آتے تھے۔ ۱۳۱۵ھ میں اپنے شیخ حضرت حاجی امداداللہ تھانوی مہاجر مکی قدس سرہٗ کی خانقاہِ امدادیہ تھانہ بھوَن میں توکلاً علی اللہ قیام فرمایا، جہاں تا دَم واپسی ۴۷ سال تک تبلیغ دِین، تزکیۂ نفس اور تصنیف و تألیف ایسی شاندار اور گراں قدر خدمات انجام دیں جس کی مثال اس دور کی کسی دُوسری شخصیت میں نہیں ملتی۔ علم نہایت وسیع اور گہرا تھا، جس کا ثبوت حضرتؒ کی تصانیف کا ہر ہر صفحہ دے سکتا ہے، حضرتؒ کی تصانیف و مواعظ سے لاکھوں افراد کو علمی و رُوحانی فیض پہنچا۔ اس کے ساتھ ساتھ بیعت و اِرشاد کی راہ سے عوام و خواص کا جتنا بڑا حلقہ حضرتِ والا سے مستفیض ہوا اس کی مثال بھی کم ہی ملے گی۔ حضرت حکیم الاُمتؒ کی رفعت و بلندی کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ہند و پاک کے بڑے بڑے صاحبِ علم وفضل اور اہلِ کمال وتقویٰ حضرتؒ کے حلقۂ بیعت میں شامل تھے۔ حضرتِ والاؒ کی ذاتِ اقدس علم وحکمت اور معرفت وطریقت کا ایک ایسا سرچشمہ تھی جس سے نصف صدی تک برِصغیر کے مسلمان سیراب وشاداب ہوتے رہے، دِین کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں حضرتِ والاؒ کی عظیم خدمات تقریری وتحریری صورت میں نمایاں نہ ہوں۔

حضرت مولانا سیّد سلیمان ندوی کے الفاظ میں: اصلاحِ اُمت کی کوشش میں علمی وعملی زندگی کے ہر گوشے پر حضرتؒ کی نظر تھی۔ بچوں سے لے کر بوڑھوں تک، عورتوں سے لے کر مردوں تک، جاہلوں سے لے کر عالموں تک، عامیوں سے لے کر

صوفیوں تک، درویشوں سے لے کر زاہدوں تک، غریبوں سے لے کر اُمیروں تک، ان کی نظر مصروفِ اصلاح و تربیت رہی۔ پیدائش، شادی بیاہ، غمی اور خوشی اور دُوسری تقریبوں پر اور اجتماعوں تک کے اَحوال پر ان کی نظر پڑی اور شریعت کے معیار پر جانچ کر ہر ایک کھرا کھوٹا الگ کیا۔ رُسوم و بدعات اور مفاسد کے ہر روڑے اور پتھر کو ہٹا کر صراطِ مستقیم کی راہ دِکھائی، تبلیغ، تعلیم، سیاست، معاشرت، اخلاق و عبادات اور عقائد میں دِینِ خالص کے معیار سے جہاں کوتاہی نظر آئی، اس کی اصلاح کی، فقہ کے نئے نئے مسائل اور مسلمانوں کی نئی نئی ضرورتوں کے متعلق اپنے نزدیک پورا سامان مہیا کردیا اور خصوصیت کے ساتھ احسان و سلوک کی جس کا مشہور نام ''تصوّف'' ہے تجدید فرمائی۔ ان کے سامنے دِین کی صحیح تمثال تھی، اسی کے مطابق مسلمانوں کی موجودہ زندگی کی تصویر میں جہاں جہاں نقائص تھے ان کے دُرست کرنے میں عمر بھر مشغول رہے۔ انہوں نے اپنی زندگی اس میں صَرف کردی کہ مسلمانوں کی تصویرِ حیات کو اس شعبے کے مطابق بنادیں جو دِینِ حق کے مرقع میں نظر آتی ہے۔

میری زندگی کی ساخت و پرداخت میں بھی حضرت حکیم الاُمت تھانوی قدس سرہٗ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ احقر کی عمر کا ایک بڑا حصہ حضرتِ والاؒ کے ہاں آتے جاتے گزرا، مسائلِ دِینیّہ میں اس کی فقہ سنجی، بیدار مغزی، حکیمانہ تنقیحات، معاشرتی معاملات میں غیرمعمولی ضبط و نظم، ان کا وسیع و عمیق علم، ان کی سینکڑوں تصانیف، ان کی محبت و برکت اور حکیمانہ اندازِ تربیت نے زندگی کے بہت بڑے بڑے سبق سکھائے۔ حضرتؒ کو اللہ رَبّ العزّت نے مرجعِ خلائق بنایا تھا، آج بھی ان کی تصانیف اور ان کے خلفائے کرام، شریعت و طریقت کے میدان میں ایسی ایسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس دور میں حرام و حلال کا اور جائز و ناجائز کا اہتمام کم ہی ملتا ہے، جتنا کہ حضرتؒ کے یہاں تھا، حضرتؒ کے والد مرحوم کے انتقال کے بعد جائیداد ملی اس کے متعلق حضرتؒ نے سرکاری کاغذات و دستاویزات تک کی اَزسرِنو تحقیقات فرمائیں اور

اپنے شہر اور دُوسرے شہر کے رہنے والے جس شخص کے متعلق ذرا سا بھی معلوم ہوا کہ اس کا ذرا سا بھی کوئی حق اس جائیداد میں ہے، پورے اہتمام کے ساتھ اس کا حق اسے پہنچادیا۔ غرضیکہ حضرتِ والاؒ نے اپنی تحریر، تعلیم و تبلیغ سے لاکھوں مسلمانوں کو علمی و عملی فیض پہنچایا اور ہزاروں مسلمانوں کی باطنی اصلاح فرمائی۔ حضرتِ والاؒ اور ان کے تلامذہ خلفاء ملک کے ہر خطے میں پھیلے اور ہندوستان کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا کہ سفر کرکے وعظ و تبلیغ نہ فرمایا ہو، تصنیف و تألیف کے ذریعے ہر علم وفن میں حضرتؒ نے ہزار سے زائد تصانیف ورثہ میں چھوڑیں اور اصلاح و تربیت کا کام اپنے خلفاء و متوسلین کے حوالے کرکے ۱۶/رجب المرجب ۱۳۶۲ھ کی شب میں تھانہ بھوَن میں اس جہانِ فانی کو خیرباد کہا اور حافظ ضامن تھانوی شہیدؒ کے مزار کے قریب انہی کے باغ میں جسے انہوں نے خانقاہِ امدادیہ کے نام سے وقف کردیا تھا محوِ آرام ہوئے، حق تعالیٰ حضرتؒ کے درجات بلند فرمائے، آمین۔

(تاریخ دارالعلوم دیوبند)

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی
رحمۃ اللہ علیہ

آپؒ دارالعلوم دیوبند کے مایۂ ناز فضلاء میں سے تھے، اور حضرت شیخ الہندؒ کے معتمد علیہ تلامذہ میں سے تھے۔ غیر معمولی ذہانت و ذکاوت کے حامل تھے، علم متحضر تھا اور بڑا منقح علم تھا۔ علومِ عقلیہؒ سے خاص ذوق تھا، منطق و فلسفہ اور علمِ کلام میں غیر معمولی دسترس تھی، حکمتِ قاسمیہ کے بہترین شاعر تھے۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد مسجد فتح پوری دہلی کے مدرسہ میں صدر مدرّس کی حیثیت سے تدریسِ علوم میں مشغول ہوئے، پھر دارالعلوم میں بحیثیت اُستاذِ حدیث بلائے گئے، اُونچے طبقے کے اساتذہ میں آپؒ کا شمار ہوتا تھا، پھر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں ایک عرصہ تک شیخ التفسیر کی حیثیت سے کام کیا اور اپنے آخری دور میں چند سال دارالعلوم دیوبند کے صدر و مہتمم بھی رہے۔ صحیح مسلم کی بہترین شرح متکلمانہ انداز میں لکھی اور حکمتِ قاسمیہ کو اس میں نمایاں رکھا۔ حضرت شیخ الہندؒ کے تفسیری فوائد جو حضرت علامہؒ نے ترجمے کے ساتھ شروع فرمائے تھے، آپؒ نے پایۂ تکمیل کو پہنچائے۔ بے مثال خطیب تھے اور خطابت میں قاسمی علوم بکثرت بیان فرماتے تھے۔ تحریر وتقریر میں ان ہی علوم کا غلبہ تھا، سیاسی شعور اُونچے درجے کا تھا، ملکی معاملات کے اُتار چڑھاؤ کا پورا نقشہ ذہن کے سامنے رہتا تھا اور اس بارے میں نپی تلی رائے قائم کرتے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک ریشمی رُومال میں شریک رہے، جمعیت علمائے ہند کے کاموں میں سرگرمی سے حصہ لیا، آخر میں مسلم لیگ کی تحریک میں شامل ہوگئے اور جمعیت علمائے اسلام کی بنیاد

ڈالی۔ جمعیت علمائے اسلام کے ارکان علمائے کرام نے تحریکِ پاکستان میں عملی حصہ لیا اور سرحد و سلہٹ ریفرنڈم میں اہم کردار ادا کیا۔ تقسیمِ ملک کے بعد آپؒ نے پاکستان پہنچ کر ترکِ وطن کردیا اور پاکستانی پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے، پاکستان میں اسلامی قانون کے نفاذ کی جدوجہد میں نمایاں حصہ لیا، قراردادِ مقاصد پاس کرائی، وہاں کی قوم نے آپ کو ''شیخ الاسلام پاکستان'' کے لقب سے یاد کیا۔

حق تعالیٰ نے حضرت علامہؒ کو علم و فضل کا ایک وافر حصہ عطا فرمایا تھا، لیکن اس کے ساتھ عجز و انکساری اور بزرگوں کا ادب و احترام ان کے خاص اوصاف ہیں۔ اہلِ علم کے قدر دان اور خلوص کا مجسمہ تھے، اور نہایت صاف و شفاف قلب کے مالک تھے۔ غرباء و مساکین سے نہایت شفقت و محبت اور اخلاقِ کریمانہ کا برتاؤ فرماتے تھے، اخلاقی طور پر آپؒ میں ایک خاص وصف یہ تھا کہ جو بہت ہی اُونچا تھا کہ ظاہر و باطن میں یکسانیت تھی اور وہ اپنے قلبی جذبات کے چھپانے یا ان کے برخلاف اظہار پر قدرت نہ رکھتے تھے، اگر کسی سے خوش ہیں تو ظاہر و باطن خوش، اور اگر کسی سے ناراض ہیں تو علانیہ اس کا اظہار ان کے چہرے سے ہوجاتا تھا اور کہہ بھی دیتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے معاملات میں اگر ذمہ داروں سے انہیں کوئی گرانی پیش آتی اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند جو ان کے بڑے بھائی بھی تھے رنجش ہوجاتی تو اکثر رُوٹھ کر بیٹھ جاتے یا سفر میں چلے جاتے، انہیں منانے اور راضی کرکے لانے کے لئے اکثر میں مأمور ہوجاتا تھا کیونکہ آپؒ مجھ پر شفقت زیادہ فرماتے تھے۔ ایک دفعہ خفا ہوکر تھانہ بھون تشریف لے گئے تو یہ احقر وہاں گیا اور راضی کرکے لے آیا۔ ایک دفعہ ناخوش ہوکر گھر بیٹھ رہے اور مدرسہ میں آنا جانا ترک کردیا، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ نے طے فرمایا کہ تو ہی جاکر لاسکتا ہے، میں حاضر ہوا اور عرض معروض کی تو راضی ہوگئے اور دارالعلوم میں چلے آئے۔ طبیعت اس قدر صاف تھی کہ جس وقت بھی بات ان کے ذہن میں آجاتی تھی تو اسی لمحے گرانی

رفع ہوکر حقیقتاً بشاشت چہرے پر نمودار ہوجاتی اور ایسے خوش اور متفرّح ہوجاتے کہ گویا گرانی ہی نہیں۔ ایک عالم دِین کے لئے یہ وصف ایک عظیم مقام ہے کہ اس کا ظاہر و باطن یکساں ہو اور بہ تکلف نہیں بلکہ تصنع و بناوٹ اس کی قلبی رفتار یہی ہو۔

حضرت علامہ کا ایک وصف یہ بھی میں نے بارہا دیکھا کہ ان کے بڑوں نے اگر بھری مجلس میں بھی انہیں تہدید آمیز لہجے سے کوئی بات کہی تو کبھی اُف نہیں کرتے تھے، اگر بات ان کے نزدیک قابلِ تسلیم نہ ہوتی تب بھی اپنے اکابر کے حقوق کی رعایت روا فرماتے تھے، قلبی جذبات کو بالکل صفائی سے کہہ ڈالتے تھے، خواہ وہ اپنی ہی کمزوری ہو۔ ایک بار ناخوش ہوکر گھر بیٹھ گئے، میں حسبِ معمول منانے کے لئے گیا تو غصّے کے لہجے میں فرمایا: بھائی حبیب نے مجھے مردہ سمجھ لیا ہے، جو اس طرح مجھ سے قطع نظر کرلی، تو سن لو کہ اس قطع نظر کرنے پر میرے دِل میں دو طرح کے جذبات پیدا ہوئے، ایک جذبہ نفسانیت سے اور ایک للّٰہیت سے، نفسانیت سے تو یہ کہ اگر انہوں نے مجھے مردہ سمجھ لیا ہے تو انہیں میں اپنی زندگی باور کراؤں اور اس کا یہ طریقہ ہوتا جو انہیں میری زندگی سمجھوادیتا، اور دُوسرا جذبہ للّٰہیت سے پیدا ہوا، وہ یہ کہ میں دیوبند سے کہیں باہر جاکر صحیح مسلم کی شرح لکھنے میں لگ جاؤں۔ میری طرف سے کچھ بھی ہوتا رہے، نہ میں یہاں رہوں گا نہ یہ روز روز کی کوفت اُٹھانا پڑے گی۔ میں نے کہا کہ حضرت! ان دونوں جذبوں میں سے کون سے کو آپ نے ترجیح دی ہے؟ فرمایا: للّٰہیت والے جذبے کو۔ میں نے کہا: الحمدللہ، مگر میں نے پھر کہا کہ: حضرت! آپ کے لئے تو اس میں بلاشبہ اَجر ہے اور یہ نیت یقیناً پاک ہے مگر اس پر تو دھیان دیجئے کہ کیا اس قسم کی چھوٹی چھوٹی طبعی ناگواریوں سے جماعتی کام کا ترک کردیا جانا مناسب ہوگا جبکہ کاموں کا دار و مدار آپ ہی جیسے حضرات کے اُوپر ہے، اگر اسی طرح کل کو جماعت کے دُوسرے بزرگ بھی ایسی ہی وقتی اور ہنگامی ناگواریوں کے سبب جو کبھی نہ کبھی آپ کی طرف سے اس میں پیش آجاتی ہیں، یہی فیصلے کرلیں کہ ہمیں کام

چھوڑ دینا چاہئے تو فرمایئے کہ یہ کام آخر کس طرح چلے اور اسے کون سنبھالے گا؟ میرے نزدیک تو آپ نے یہ اپنے کو یکسو کرنے کا فیصلہ نہیں کیا بلکہ اس جماعتی کام کو ختم کردینے کا فیصلہ فرمایا ہے، کیا یہ مناسب ہے؟

بس اتنا سن کر ایک دم چہرے پر بشاشت آگئی اور فرمایا: ہاں! یہ تو نے صحیح کہا، بس اب میں نے دُوسرا جذبہ بھی دِل سے نکال دیا اور کل سے دارالعلوم پہنچ کر کام کروں گا۔

چنانچہ علی الصباح حسبِ وعدہ تشریف لے آئے اور ایسے انداز سے آئے کہ گویا کوئی بات پیش ہی نہیں آئی تھی۔ یہ درحقیقت وہی ظاہر و باطن کی یکسانیت، قلب کی صفائی اور حق پسندی کا یہ اثر تھا کہ دِل میں کبھی کچھ نہیں رکھتے تھے۔ بہرحال علم کے ساتھ حق تعالیٰ نے یہ خاص وصف عطا فرمایا تھا جس نے ان کی بڑائی دِلوں میں بٹھادی تھی۔ قلبی طور پر استغناء اور ناز کی کیفیت کا غلبہ زیادہ تھا، کام کے سلسلے میں جب تک دُوسروں کی طرف سے طلب اور کافی طلب ظاہر نہ ہوتی تھی متوجہ نہیں ہوتے تھے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مفتیٔ اعظم پاکستان جو میرے رفیقِ قدیم ہیں اور حضرت شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی قدس سرہٗ کے معتمد علیہ تلامذہ اور رفقاء کار میں سے ہیں، فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ الاسلام علامہ عثمانیؒ علم و فضل کے پہاڑ تھے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت سے اوصاف سے نوازا تھا، عرصہ دراز تک آپؒ دارالعلوم دیوبند میں درسِ حدیث کی خدمت انجام دیتے رہے اور آخر میں دارالعلوم کے صدر مہتمم کی حیثیت سے کام کیا اور دارالعلوم نے نمایاں ترقی کی۔ تفسیرِ عثمانی، صحیح مسلم کی شرح "فتح الملھم"، آپؒ کی شہرۂ آفاق تصانیف ہیں جو آپؒ کے علمی کمال کی دلیل ہیں۔ حضرت علامہؒ نے صحیح مسلم پر اپنی شہرۂ آفاق "فتح الملھم" جب تألیف فرمائی تو اس کا مسوّدہ حرمین شریفین لے کر گئے تھے، وہاں روضۂ اقدس کے سامنے بیٹھ کر مسجدِ نبوی میں اس کی ورق گردانی کی اور پھر روضۂ اقدس پر بھی اور حرمِ

مکہ میں ملتزم پر بھی مسوّدہ سر پر رکھ کر حضرت علامہؒ نے دُعا کی تھی کہ یہ مسوّدہ احقر نے بے سروسامانی کے عالم میں مرتب کیا ہے، یا اللہ! اس کو قبول فرمالیجئے اور اس کی اشاعت کا انتظام فرمادیجئے۔ اس کے بعد جب حرمین شریفین سے واپس آئے تو نظام حیدرآباد دکن کی طرف سے پیشکش کی گئی کہ ہم اس کتاب کو اپنے اہتمام سے شائع کرائیں گے، چنانچہ وہ نظام حیدرآباد کے مصارف پر بڑی آب وتاب کے ساتھ شائع ہوئی اور اس عظیم الشان تألیف نے پوری علمی دُنیا سے اپنا لوہا منوالیا۔

الغرض حضرت علامہ مرحوم بغداد الجدید (بہاول پور) میں وزیرِ تعلیمات کی درس کی دعوت پر تشریف لے گئے اور بغرض تبدیلی آب وہوا کچھ روز وہاں قیام فرمایا، مگر قیام کو ابھی تین ہی دن گزرے تھے کہ وقتِ موعود آپہنچا اور ۱۳؍دسمبر ۱۹۴۹ء یومِ شنبہ آپؒ نے داعئ اجل کو لبیک کہا اور ہمیں داغِ مفارقت دے کر راہگیرِ عالَمِ جاودانی ہوگئے۔ یہ خبر مسلمانانِ ہند و پاک عموماً اور متوسلینِ دارالعلوم دیوبند کے حلقوں میں خصوصاً انتہائی رنج وغم کے ساتھ سنی گئی، دارالعلوم کی فضا رنج وغم میں ڈوب گئی اور تمام دفاتر بند کردیئے گئے، علی الصباح نمازِ فجر کے بعد مسجد دارالعلوم میں حضرت علامہؒ کے سانحۂ اِرتحال کا تذکرہ کرکے کلمہ شریف اور قرآنِ کریم ختم کیا گیا جس میں تمام اساتذہ اور طلباء اور کارکنانِ دارالعلوم نے شرکت کی، پھر بعد نمازِ ظہر تعزیتی جلسہ منعقد کیا گیا جس میں حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی نے اپنے تعزیتی کلمات میں ارشاد فرمایا کہ:-

''حضرت علامہ عثمانیؒ کی شخصیت بے مثال تھی، علم وفضل میں آپ کا پایہ بلند تھا اور ہندوستان کے چیدہ علماء میں سے تھے، ہم میں سیاسی اختلاف ضرور پیدا ہوئے مگر وہ اپنی جگہ ہیں، حضرت علامہ مرحوم کے علم وفضل اور بلند پایہ شخصیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، یقیناً ان کی یہ دائمی مفارقت ہم سب کے لئے باعثِ صد رنج و ملال ہے۔ حضرت علامہ مرحوم نے دارالعلوم میں تعلیم پائی اور حضرت شیخ الہندؒ اور بہت

سے اکابر دارالعلوم سے انہیں نسبتی تعلق تھا، اور تقریر وتحریر کا خداداد ملکہ حضرت مولانا مرحوم کا حصہ تھا اور بہت سی خوبیوں کے حامل تھے۔''

حضرت مولانا مدنی کی تقریر کے بعد احقر نے ایک مفصل تقریر کی جس میں شیخ الاسلام علامہ مرحوم کی علمی، دِینی اور سیاسی خدمات وخصوصیات پر روشنی ڈالی اور بتلایا کہ جماعتِ علماء میں حضرت علامہ مرحوم نہ صرف ایک بہترین عالم و فاضل ہی تھے بلکہ ایک صاحب الرائے مفکر بھی تھے، آپؒ کا فہم و فراست اور فقہ نفس بے نظیر تھا، آپؒ اس علمی ذوق کے امین تھے جو اکابرِ دارالعلوم سے بطورِ وراثت آپ کو ملا تھا۔ حضرت قاسم العلوم والخیرات بانئ دارالعلوم دیوبند کے مخصوص علوم پر آپؒ کی گہری نظر تھی اور درسوں میں ان کے علوم کی بہترین تفہیم کے ساتھ تقریر فرماتے تھے۔ علوم میں نظر نہایت گہری اور عمیق تھی۔ علمی لائنوں میں آپؒ کو درس و تدریس اور مختلف مدارس، مدرسہ فتح پوری دہلی، دارالعلوم دیوبند اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے ہزارہا طلباء کو یکے بعد دیگرے افادہ ایک امتیازی شان رکھتا تھا۔ تصنیفی لائنوں میں آپؒ کی متعدّد تصانیف اور قرآنِ کریم کی تفسیر بصورت فوائد اور مسلم شریف کی عربی شرح یادگارِ زمانہ رہیں گی جو پوری دُنیائے اسلام میں نہایت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی گئی ہیں۔ سیاسی لائنوں میں آپؒ نے تقسیمِ ملک سے پہلے اپنی مدبرانہ سیاسی قابلیت سے ریاست حیدرآباد کو ایسے وقت میں بعض مہلک مذہبی فتنوں سے بچانے کی سعیٔ جمیل فرمائی، جبکہ اس کے معاملات بہت زیادہ خطرے میں تھے۔ آزادئ ملک کی جدوجہد میں آپؒ نے کافی حصہ لیا اور آپؒ کی فصیح و بلیغ تقریروں سے لاکھوں باشندگانِ وطن آزادئ وطن کی حقیقت سے آگاہ ہوئے۔ تقسیمِ ملک کے بعد آپؒ نے پاکستان کو اپنا مستقل وطن بنالیا اور کراچی میں مقیم رہ کر پاکستان کی بہت سی دِینی و علمی خدمات انجام دیں۔ پاکستان کے اَربابِ حکومت پر آپؒ کی علمی اور سیاسی خدمات کا خاص اثر تھا، اور وہاں کی گورنمنٹ کے ہائی کمانڈ میں آپؒ کو عالمانہ اور مفکرانہ حیثیت سے خاص عظمت حاصل تھی۔ آپؒ پاکستان کی دستور

ساز اسمبلی کے رکن اور مذہبی قانون کمیٹی کے صدر تھے، بلاشبہ وہاں کی حکومت نے آپؒ کے ساتھ تاحیات اور ممات میں وہ معاملہ کیا جو ایک قدر شناس حکومت کو اپنے مخلص خیر خواہ اور ملک کے ایک ممتاز عالمِ دین کے ساتھ کرنا چاہئے۔

علامہ مرحوم کی ان چند فضیلتوں اور پھر ان مخصوص نسبتوں سے اَوّلاً آپ دارالعلوم کے مایۂ ناز فرزند تھے، پھر اس کے قابلِ قدر مدرّس بنے، اور آخر کار ادارہ کے صدر مہتمم ہوئے، ان کے حقوق ہم پر عائد ہوتے ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ ہم بطور ادائے حق نہیں بلکہ بطور ادائے قرض ان کے لئے دُعائے مغفرت اور اِیصالِ ثواب کریں اور نہ صرف آج ہی بلکہ آئندہ بھی برابر کرتے رہیں۔ علماء وطلباء کے بھرے مجمع نے دُعائے مغفرت اور اِیصالِ ثواب کے لئے ہاتھ اُٹھاکر اور کافی حد تک خشوع و خضوع کے ساتھ دُعا فرمائی اور بڑے رنج واَلم میں ڈُوبی ہوئی یہ مجلس برخاست ہوئی۔ دفاتر بند کردیئے گئے اور حضرتؒ کے اِیصالِ ثواب کے لئے ایک دن کی تعطیل کی گئی۔ احقر مہتمم دارالعلوم اور جماعت کی جانب سے تعزیت کے تار حضرت علامہ مرحوم کے اہلِ بیت اور پاکستان کے گورنر جنرل اور وزیراعظم اور ایسوسی ایٹڈ پریس پاکستان کو روانہ کئے گئے جن کی عبارت حسبِ ذیل ہے:-

''شیخ الاسلام پاکستان علامہ شبیر احمد عثمانی کی وفات نہ صرف پاکستان بلکہ عالَمِ اسلامی کا ایک شدید حادثہ ہے، میں خود اور تمام جماعتِ دارالعلوم دیوبند آپ کے اور تمام ملتِ اسلامیہ پاکستان کے غم میں شریک ہیں اور تعزیت پیش کرتے ہیں، دارالعلوم میں تعطیل کی گئی اور ختمِ قرآن اور دُعا کرائی گئی ہے۔''

(مأخوذ از کتاب ''تذکرہ شیخ الاسلامؒ پاکستان'')

شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی
رحمۃ اللہ علیہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

اُمتِ مرحومہ کا کوئی قرن علمائے ربانی اور رجالِ حقانی سے خالی نہیں گزرا، ہر دور میں بڑے بڑے رجالِ علم موجود رہے ہیں، جنھوں نے آفتاب و ماہتاب بن کر گہری تاریکیوں میں اُمت کو راہِ حق دِکھائی، صراطِ مستقیم پر ڈالا اور اپنی اپنی معنوی روشنی کی قدرِ حق کو کبھی بھی باطل کی اندھیریوں میں چھپنے نہیں دیا، بلکہ شریعتِ اسلام کی سدابہار روشنی کے بارے میں جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سچی خبر کو: ''لیلھا ونھارھا سواء'' سچا کر دِکھلانے میں ان ہی نورانی حضرات کا یدِ بیضاء کام کرتا رہا ہے، مگر پھر بھی ان میں ایسے جامعِ علوم ہی نہیں، بلکہ جامع شئون بھی ہوں، گنے چنے ہی رہے ہیں، جنھوں نے اپنی روشنی سے افرادِ اُمت کو دِین کے ہر ہر جلی اور خفی گوشے کی نشاندہی کی اور علمی طور پر اُمت کو جامعیت کے ان گوشوں پر چلایا ہو، گویا اراءۃِ طریق کے ساتھ من اللہ ایصال الی المطلوب کا وسیلہ بھی ثابت ہوئے۔

الحمدللہ کہ یہ قرن بھی جو باوجود عہدِ نبوّت سے بعید تر اور عہدِ تجدید سے دُور ہوجانے کے سبب صد اَلوان تاریکیوں اور فتنوں کا مجموعہ ہے، ایسے جامع اور رَبانی علماء سے خالی نہیں، جن کو جامعیت، اجتماعیت اور جمعیۃ کی شاخوں سے نوازا گیا ہے، اور ان غیرمعمولی کمالات کے سبب انہیں من جانب اللہ قبولِ عام کی دولت عطا ہوئی ہے۔

ان ہی گنے چنے نفوسِ قدسیہ میں سے حضرتِ اقدس مولانا حافظ الحاج السیّد

حسین احمد المدنیؒ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کی ذاتِ ستودہ صفات بھی ہے، جو اپنے مخصوص فضائل و کمالات کے لحاظ سے بلاشبہ ایک فردِ منفرد ہستی ہے، آپؒ نہ صرف عالمِ دِین ہی ہیں بلکہ عارف باللہ اور مجاہد فی سبیل اللہ بھی ہیں۔ آپؒ کا علم عارفانہ، عمل مجاہدانہ اور اخلاق درویشانہ ہے، متضاد اَحوال و مقامات کو ایک دامن میں لئے ہوئے ہیں، ایک ہی وقت میں آپؒ دارالعلوم دیوبند جیسے مرکزِ علم و دِین کی مسندِ تدریس کے صدر نشین بھی ہیں، جن کے اِردگرد سینکڑوں طلبہ زانوئے اَدب تہہ کئے نظر آتے ہیں، اُسی آن آپؒ جمعیۃ العلماء اور سیاسی اِسٹیج کے مسند نشین بھی ہیں، جن کے دائیں بائیں ہزاروں مجاہد صفت انسانوں کا جمگھٹ لگا ہوا ہے، اور پھر اُسی ایک وقت میں آپؒ اپنے ریاضت کدہ میں خانقاہ نشین بھی ہیں، جن کے چہار طرف سینکڑوں ذاکر و شاغل اور راہِ باطن کے جویا افراد کا ہجوم ہے، اور آپؒ کی جامع ذات ہے کہ ایک طرف آپؒ اپنے عالمانہ وقار و نکتہ سنجی سے، دُوسری طرف مجاہدانہ جوش و اقدام پسندی سے، اور تیسری جانب عابدانہ انکسار و تواضع آفرینی سے ہر دائرے کے طالبوں کی پیاس بجھا رہے ہیں اور ہر میدان میں آپؒ کی ہمتِ مردانہ اس طرح یکسانی کے ساتھ کام کر رہی ہے کہ کسی ایک میدان کی تگ و تاز دُوسرے میدان سے بے اِلتفات نہیں ہونے دیتی۔ غرض شریعت، طریقت اور سیاست جیسے متضاد رُخ مقامات کی سیر اور اُن میں بیک وقت اَن تھک عروج آپؒ کی ہمتِ مردانہ کا ایک عملی شاہکار ہے ؂

یوں بہم کس نے کئے ساغر و سنداں دونوں

آپؒ کی اسی مجاہدانہ رَوِش اور دِین کے عملی شعبوں میں اَن تھک دوڑ کے بارے میں میں نے حکیم الاُمت حضرتِ اقدس مولانا تھانوی قدس سرہٗ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ:-

میں اپنی جماعت میں مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب کے حسنِ تدبر کا اور مولانا حسین احمد صاحب کے جوشِ عمل کا معتقد ہوں۔

ایک موقع پر حضرتِ ممدوح علیہ الرحمۃ کی مجلسِ خیر و برکت میں تحریکاتِ وقت کا ذکر چھڑا، ایک صاحب نے حضرت مدنی کے کسی مجاہدانہ عمل کا حوالہ دیتے ہوئے عرض کیا کہ حضرت! آپ کا اس پر عمل نہیں، فرمایا:-

بھائی! میں اُن جیسی (مولانا مدنیؒ جیسی) ہمتِ مردانہ کہاں سے لاؤں؟

مجھ سے ایک موقع پر ارشاد فرمایا کہ:-

میں مولانا حسین احمد صاحب کو ان کے سیاسی کاموں میں مخلص اور متدین جانتا ہوں، البتہ مجھے ان سے حجت کے ساتھ اختلاف ہے، اگر وہ حجت رفع ہوجائے تو میں ان کے ماتحت ایک ادنیٰ سپاہی بن کر کام کرنے کے لئے تیار ہوں۔

بہرحال یہ ایک مُسَلَّمہ حقیقت ہے کہ دِین کے ہر بنیادی شعبے میں آپؒ کو عمل، جوشِ عمل اور ہمتِ مردانہ کی توفیق عطا ہوئی ہے، اور اس پیرانہ سالی میں یہ عمل، یہ جوش وخروش اور اُمنگ کے ساتھ یہ اَن تھک دوڑ دُھوپ، واقعہ یہ ہے کہ جوانوں کی جوانیوں کو شرمائے ہوئے ہے۔ آپؒ کے یہاں راحت و آرام کا لفظ گویا لغت میں آیا ہی نہیں، اور آیا ہے تو اس کے کوئی معنی نہیں ہیں، یا کم از کم ان کی زندگی کی نسبت سے یہ لفظ مہمل اور بے معنی ہے۔

اس دورِ عجز وکسل میں جو آج مسلمانوں پر چھایا ہوا ہے، آپؒ کی اس ہمت و جوشِ عمل کو سوائے کرامت کے اور کس لفظ سے تعبیر کیا جائے؟ اور اگر اس کا نام اِستقامت ہے تو وہ بلاشبہ فوق الکرامت ہے، جو اِس دورِ قحط الرجال میں ایک غنیمتِ باردہ ہے۔ حضرتِ ممدوح کی مدح سرائی میری تحریر کا موضوع نہیں ہے، اور میں اُن کے فضائل و مدائح کا احاطہ کر بھی کیا سکتا ہوں، تذکرہ آگیا ہے، تو قلم اس سے نہیں رُکتا کہ اُن کی ہزارہا مدائح و فضائل میں سے یہ کوئی منقبت اور تھوڑی فضیلت نہیں ہے

کہ دیوبند سے فارغ ہونے کے بعد ہی جبکہ آپؒ "شابٌ نشأ بعبادة الله" کے مقام پر پہنچ چکے تھے، آپؒ نے ۱۸ برس تو حرمِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں بیٹھ کر اور خود صاحبِ کتاب وسنت اور اُن کے زیرِ نظر رہ کر درسِ کتاب وسنت دیا، جس سے مشرق ومغرب کے ہزارہا عوام وخواص اور علماء وفضلاء مستفید ہوئے اور حجاز وشام، مصر وعراق، ترک وتاتار وغیرہ تک آپؒ کے کمالات کا شہرہ پہنچ گیا۔

اس دوران میں آپؒ دیوبند بھی آتے جاتے رہے اور احاطۂ دارالعلوم میں اپنے فیوض سے طلبہ کو اور اپنے برگزیدہ اُستاذ حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کے فیوض سے خود اپنے آپ کو مستفید فرماتے رہے، مگر مستقل قیام اور مسلسل افادے کا مقام مدینہ منوّرہ ہی رہا۔ قیامِ مدینہ کی انتہاء اس پر ہوئی کہ آپؒ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی اسارتِ مالٹا کے موقع پر اپنے اُستاذ کی معیت میں پانچ برس مالٹا کے اسارت خانے میں رہے، گویا حرمِ نبوی کے اشارہ پر حرمِ شیخ میں مکرّر داخل ہوئے اور اس مسلسل فیضانِ صحبت سے آپؒ کو وہ اخلاقی عروج حاصل ہوتا رہا جو اس مقام پر ہوسکتا تھا۔ رہائی کے بعد ہندوستان تشریف آوری ہوئی تو آپ کو حق تعالیٰ نے آپؒ کے مرکزِ نشوونما (دارالعلوم دیوبند) کے لئے منتخب فرمایا، جو درحقیقت اپنے وقت کے اولیاء و اقطاب کی نسبتوں کا مجموعہ اور مرکز ہے، گویا حرمِ شیخ کے بعد حرمِ شیوخ میں داخلہ ہوا اور اکابر واسلاف کی گدی نے آپؒ کو اپنے لئے چن لیا، تقریباً ۲۶ برس سے مسلسل اس مرکزِ علمی کی صدارتِ تدریس کی مسند آپؒ کے فیوض سے مالامال ہو رہی ہے۔ پس ۱۸ برس مرکزِ اسلام (مدینہ منوّرہ) میں رہ کر افادہ و استفادہ فرمایا، پانچ برس مالٹا کی جہاد پرَوَر خانقاہ میں آپؒ کو وقت کی سب سے بڑی شخصیت سے خصوصی استفادے کا یکسوئی کے ساتھ موقع میسر ہوا، اور ۲۶ برس آپؒ اس علم و مذہب کے ایشائی مرکز (دارالعلوم دیوبند) میں مصروفِ افادہ واستفادہ ہیں۔ حرمِ مدینہ نے آپؒ میں جمعیت کی رُوح پھونکی، مالٹا نے آپؒ میں جامعیت کی لہر دوڑائی اور دارالعلوم دیوبند نے آپؒ

کو اجتماعیت کے مقام پر لا کھڑا کر دیا، اس لئے قدرتی طور پر چند مرکزوں کی بنائی ہوئی شخصیت کو ایک جامع علم و عمل اور جامع اخلاق و شئون شخصیت ہونا ہی چاہئے تھا، جو ہوگئی، وذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

آپؒ کی مرکزی شخصیت اس وقت دارالعلوم دیوبند کے جس عہدے پر فائز ہے، وہ روایتی طور پر محض مدرّسی یا صدر مدرّسی کا عہدہ نہیں، بلکہ ہمیشہ ایک عمومی مقتدائیت کا عہدہ رہا ہے، جس کی طرف رُجوعِ عام ہوتا رہا ہے اور جس کے لئے من جانب اللہ ہمیشہ ایسی ہی ممتاز شخصیتیں منتخب ہوتی رہی ہیں جن کا امتیاز ہمیشہ مناسب وقت فضائل و کمالات کے معیار سے رہتا آیا ہے۔

دارالعلوم کے اوّل صدر مدرّس حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہٗ اپنی جامعیتِ علوم وفنون، جودتِ طبع، ذکاوتِ احساس اور رُموزِ ولایت میں شاہ عبدالعزیز ثانی تسلیم کئے جاتے تھے اور فنِ حدیث میں آپؒ کا اندازِ درس حکیمانہ، عارفانہ اور ساتھ ہی عاشقانہ تھا۔ آپؒ کے بعد ایک قلیل عرصے کے لئے حضرت مولانا سیّد احمد دہلویؒ صدر نشین مسندِ درس ہوئے، آپؒ فنونِ عقلیہ و ریاضیہ میں امامِ وقت سمجھے جاتے تھے، اس لئے دینیات کے درس میں آپؒ کا اندازِ تدریس عاقلانہ، مستدلانہ اور مفکرانہ تھا۔ آپؒ کے بعد حضرت شیخنا شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ اس گدی پر بٹھائے گئے، آپؒ جامعیتِ علوم کے ساتھ شیخِ کامل، عارف باللہ، جامع معقول و منقول اور اخلاقِ فاضلہ میں راسخ القدم تھے، اس لئے آپؒ کا اندازِ درس اپنے اُستاذ حضرت قاسم العلوم قدس سرہٗ کے نقشِ قدم پر عالمانہ، متکلمانہ، فقیہانہ اور فانیانہ تھا۔ ان کے بعد آپؒ کے ارشد تلامذہ آیت من آیات اللہ اُستاذنا حضرتِ اقدس علامۂ دہر مولانا السیّد محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ مسند آرائے درسِ کتاب و سنت ہوئے، آپؒ کا غیر معمولی حافظہ، تبحرِ علمی، حفظِ کتب و سفائن اور علوم وفنون گویا ایک اعجازی شان رکھتا تھا، عقل و نقل کا ہر علم وفن اور اس کے تفصیلی اُصول و فروع آپؒ کو اس طرح

مستحضر تھے کہ آپؒ کو وقت کا چلتا پھرتا کتب خانہ کہا جانے لگا، اس لئے آپؒ کا اندازِ درسِ حدیث حافظانہ، داعیانہ، محدثانہ اور تبحرانہ تھا۔ آپؒ کے بعد حضرتِ اقدس مولانا سیّد حسین احمد مدنی سے اس گدی کو رونق بخشی گئی، تو آپؒ کے جوشِ جہاد، ذوقِ عمل، ہمتِ باطنی اور وسعتِ اخلاق نے علم کو عمل کے ہر ہر گوشے میں دوڑا کر عملی سانچوں میں پیش کیا اور عملی کمالات پر دواعی کو غلبہ پانے کا موقع ملا، اس لئے آپؒ کے درس کا انداز عالمانہ ہونے کے ساتھ مجاہدانہ اسپرٹ سے بھرپور اور جذباتِ عمل سے لبریز ہوتا ہے، جس سے طالبوں کے قوائے عمل کی قوّتیں بیدار ہوجاتی ہیں اور جذباتِ عمل زیادہ سے زیادہ منفعل ہوجاتے ہیں۔

ہندوستان کی تحریکِ جنگِ آزادی میں آپؒ کے علم اور جوشِ عمل نے اہلِ علم کے سیاسی حلقوں کی لاج رکھ لی، اِستخلاصِ ملک وملت کے لئے آپؒ نے جو جو قربانیاں دی ہیں، وہ جریدۂ عالم سے کبھی محو نہیں ہوسکتیں، عموماً سیاسی میدانوں کے شناور اِسٹیج پر پہنچ کر غیرمحتاط اور ذہنی طور پر آزاد و بے باک ہوجاتے ہیں، لیکن حضرتِ ممدوح کا یہ کمالِ استقامت تھا کہ سیاسی اِسٹیج پر بھی آپؒ کا تقشّفِ مذہبی اس حد تک قائم رہا جس حد تک ایک مدرّس کا اپنے حلقۂ درس میں قائم رہ سکتا ہے، گویا آپؒ کا اِسٹیج بھی درسِ کتاب وسنت ہی کا محل و مقام ہوتا تھا، جس سے وہی آثارِ خیر و برکت ہویدا ہوتے تھے جو کتاب وسنت کے خصوصی آثار ہوسکتے ہیں۔

ساتھ اس عامۃ الورود مقام پر جو حقیقتاً مزلتِ اقدام ہے، آپ کی اخلاقی قوّتیں اس حد تک بیدار اور ہموار رہیں کہ یہ سیاسی اقدامات بجائے خود ایک اخلاقی درس کی شان سے نمایاں ہوتے رہے، ہر خدمت بے لوث، ہر عمل بے لاگ اور ہر اقدام خلوص وایثار سے پُر، نہ کسی عہدے کا سوال، نہ جاہ کی طلب، نہ مال کی طرف ادنیٰ اِلتفات، نہ اقتدار کی ذرّہ بھر خواہش، ہندوستان کے آزاد کرانے اور انگریزوں کو نکالنے میں سر اور دھڑ کی بازی لگادی، لیکن کیا کسی وقتی صلے کے لئے؟ کسی عہدے کے

لئے؟ یا قومی اسٹیج پر عہدے داروں کی کسی سرگروہی کے لئے؟ معاذ اللہ، بلکہ ہر خدمت میں مخلصانہ جذبات، بے غرضانہ داعی، بے لوث ارادے، سادگیٔ ضمیر اور محض اپنے بزرگوں کے نصب العین کی تکمیل اور اپنے سلف کے نقشِ قدم کے اقتضاء و اقتداء کے ساتھ اسے باقی رکھنے کے لئے اور بس۔

آپ اس وقت بھی جوشِ عمل کے ساتھ قائدِ میدان تھے جبکہ نعرہ ہائے تہنیت کے ساتھ پھولوں کے ہار پیش کئے جا رہے تھے، اور اس وقت بھی اسی اندازِ فنائیت کے ساتھ مصروفِ عمل رہے جبکہ افراد و جماعات نے مخالف بن کر بے حرمتی اور بدگوئی کی ٹھان لی تھی، کیونکہ یہ خدمت، نہ خواہشِ صلہ پر مبنی تھی، نہ نعرہ ہائے تحسین و آفرین پر، بلکہ صرف: اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ پر۔

آپؒ کی رایوں اور افکار سے افراد و جماعت کو نیک نیتی کے ساتھ اختلافات بھی رہے اور آئندہ بھی رہ سکتے ہیں، لیکن اس میں موافق و مخالف کی دو رائیں کبھی نہیں ہوئیں کہ آپؒ اپنی رایوں میں مخلص، جذبات میں صادق، نیّات میں بلند مقام، عمل میں صاحبِ عزم اور اخلاق میں صاحبِ حال ہیں۔ اختلافِ رائے سے نیچے اُتر کر یہ بھی ممکن ہے کہ آپؒ کے مجاہدانہ مزاج سے، جس میں سیاسی رنگ اور انتہاپسندانہ عزائم و جذبات بطورِ جوہرِ مزاج کھپے ہوئے ہیں، کسی اعتدال پسند اہلِ معاملہ کے دِل میں کچھ خلش بھی ہو اور بعض اہلِ معاملہ کے نفوس کچھ گھائل بھی ہوں۔ یہ بھی ضرور عرض کروں گا کہ جو اکابرِ دین تکوینی طور پر من اللہ کسی خاص خدمت کے لئے مقرّر اور مامور کئے گئے ہوں، ان کی طبائع اور خصوصیاتِ مزاج کے لحاظ سے ان پر اسی وصف کا غلبہ ہوتا ہے، جو اس خدمتِ خاص اور وقتِ خاص کا مقتضا ہو اور وہی وصفِ غالب اُن کے کاموں کا قدرتی معیار بن جاتا ہے، گویا ان کی طبیعتیں غیر اختیاری بلکہ غیر شعوری طور پر ادھر ہی چلتی ہیں، جدھر یہ وصف اور وقت انہیں لے چلتا ہے، اس لئے بظاہر تو معاملات میں اُن کی طبیعت اور مزاج کارفرما نظر آتا ہے، لیکن فی الحقیقت

منشائے خداوندی ان حضرات کی طبیعتوں کے راستے سے اپنا کام کرتی ہے۔

مولانا مدنیؒ کی شخصیت جس اِسٹیج کے لئے منتخب کی گئی، وہ بلاشبہ ایک طاقتور دُشمن کے مقابلے اور اُس کے پنجۂ استبداد سے ایک پسماندہ اور محرومِ آزادی ملک کے چھڑانے کا اِسٹیج تھا، تاکہ اس راہ سے کسی وقت شعائرِ الٰہیہ بلند کئے جاسکیں، ظاہر ہے یہ کٹھن نصب العین رحم و کرم، عفو و درگزر اور مسامحت کے جذبات سے آگے نہیں بڑھ سکتا تھا، بلکہ جوش و جذبۂ فرق بین الناس اور تمیزِ قائم و قائد کے دواعی ہی اسے آگے بڑھا سکتے تھے، بالفاظِ دیگر اس طرح کے فی سبیل اللہ تصادم اور تقابل کے لئے بعض اوقات بغض فی اللہ کے غلبے کی ضرورت تھی، نہ کہ حب فی اللہ کے آگے رکھنے کی، اور اس کے لئے طبیعت گرم اور جہاد آگیں درکار تھی، جس کے ذاتی رُجحانات ہی خلقی طور پر بغض فی اللہ کے اخلاق کے لئے صالح اور مستعد ہوں، نہ کہ نرم اور حلم و صبر پیشہ طبیعت، جس کا وصفِ غالب حب فی اللہ اس کے تحت بڑے سے بڑے دُشمن سے درگزر اور عفو و مسامحت ہو، پھر یہ گرم طبیعت بھی ایسی کہ یہ وصفِ بغض فی اللہ اس کے حق میں استدلالی نہ ہو بلکہ حالی ہو اور خود طبیعت ہی اپنی افتاد سے اس طرف دوڑتی ہو، حضرتِ ممدوح کے طرز و انداز اور رفتارِ کار سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپؒ پر بغض فی اللہ کا غلبہ ہے جو آپؒ کے عام معاملات کے لئے و منصبی مقام کے لحاظ سے معیار کی صورت اختیار کئے ہوئے ہے۔

بلاشبہ ایسے حضرات جو بغض فی اللہ کے مقام پر ہوں، اللہ کی ایک تلوار ہوتے ہیں کہ جو بھی معاندانہ رویے سے اس کی دھار کے نیچے آجاتا ہے، صاف ہوجاتا ہے ؎

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات

با درد کشاں ہر کہ در افتاد بر افتاد

ظاہر میں وہ مغلوب الغضب نظر آتے ہیں، لیکن وہ خود ان کا غضب و بغض نہیں ہوتا، بلکہ بغضِ الٰہی ہوتا ہے جو ان کے اخلاق میں سے ہوکر گزرتا ہے اور انہیں

جارحۂ الٰہیہ بنا کر ان کے راستے سے اپنا کام کرتا رہتا ہے۔

اہل اللہ کی یہ مزاجی اور طبعی خصوصیات نہ صرف یہ کہ بندگی کے منافی نہیں ہوتیں، بلکہ نوعِ بزرگی کا مورد اور مظہر ہوتی ہیں، جن میں شئونِ الٰہیہ گزر کر اپنا کام کرتی ہیں، گویا جن حضرات پر حب فی اللہ کے غلبے سے عفو و درگزر، مسامحت اور چشم پوشی وغیرہ کے جذبات چھائے ہوئے ہوتے ہیں، وہ حق تعالیٰ کے حلم وعفو، رحم و کرم اور فضلِ عظیم کا بغض فی اللہ کے تحت ترکِ دار و گیر، مؤاخذہ، مطالبہ اور تفریقِ حق و باطل کے جذبات غالب ہوتے ہیں، وہ حق تعالیٰ کے جبر و قہر، مؤاخذہ و انتقام اور عدل کا مظہر ہوتے ہیں، پس ایسے حضرات اگر کسی پر رحم کھائیں یا کسی پر غضبناک ہوں تو وہ درحقیقت رحمت اور غضبِ الٰہی ہوتا ہے جو ان کی طبعی خصوصیات مزاج کو راہِ حق کا خادم اور کلیۃً حق کا آلۂ کار بنا لیتے ہیں۔ بہرحال اس قسم کے مقبول افراد کو جس میدان میں بھی کام کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے تو ان کی طبائع کو اس میدان کی رہنمائی دے دی جاتی ہے اور اس میں ان کی یہ طبعی خصوصیات شئونِ الٰہیہ سے مربوط ہو کر اپنا مفروضہ کام غیر شعوری طور پر کرنے لگتی ہیں۔

دائرۂ نبوّت ہو یا دائرۂ ولایت، متعلقہ افراد کی طبعی خصوصیات اور مزاجی امتیازات سے الگ نہیں رہ سکتا، موسیٰ علیہ السلام کی طبعی خصوصیات جلال آگیں تھیں، تو اُن کی نبوّت اور شریعت میں بھی وہی شدّت فی اَمر اللہ اور جلالی شان غالب ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کی طبعِ مبارک جمال آفرین تھی تو ان کی نبوّت اور شریعت میں بھی حب فی اللہ اور تسامح کی شانوں کا غلبہ ہے۔ نبوّت سے اُتر کر دائرۂ ولایت میں مثلاً صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ پر طبعاً رحم و کرم غالب ہے، تو اُن کے عام معاملات اور کاروبار میں بھی رحمت ہی چھائی ہوئی نظر آتی ہے، فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ طبعاً متشدّد اور جبار ہیں، تو اُن کے عامۂ اُمور سے وہی سخت گیری، جلال اور تشدّد فی اَمر اللہ نمایاں ہے۔ غرض انبیاء کی نبوّت اور اولیاء کی ولایت ان کے خلقی مزاجوں اور طبعی خصوصیات ہی

کے ڈھانچوں ہی میں اُترتی ہے، جبکہ وہ طبائع وہبی یا کسبی طور پر نفسانی رذائل سے پاک کر کے وابستۂ حق بنادی جاتی ہیں اور قبول کر لی جاتی ہیں۔

پس ان وابستۂ حق طبائع سے جو اُمور سرزد ہوتے ہیں، وہ بظاہر تو طبعی جذبات نظر آتے ہیں، لیکن حقیقتاً ان میں منشائے الٰہی کام کرتا ہے اور وہ جوارحِ الٰہیہ ہوتے ہیں، جو اپنی طبعی رفتار سے منشائے الٰہی کو پورا کرتے رہتے ہیں، گویا اس غبارے میں ہوا مرضئ الٰہی کی بھری ہوتی ہے جس سے وہ اُڑتا ہے، پس بظاہر تو غبارہ اُڑتا نظر آتا ہے لیکن حقیقتاً اُڑنے والی چیز ہوا ہوتی ہے، جس کی اُڑان کا مظہر یہ غبار ہوتا ہے۔

انت کالریح ونحن کالغبار — یختفی الریح وغباره جهار

اسی طرح مولانا مدنیؒ کے معاملات کی نوعیت اور افتادِ طبع سے واضح ہے کہ اُن پر بغض فی اللہ کا غلبہ ہے، اور ان کی خصوصیاتِ طبع سے ہر اس دائرے میں جس میں ان کا دخل ہو، ایک خاص معیار کے تحت فصل اور فرق کا کام لیا گیا ہے، جسے زد میں آئے ہوئے افراد طبعی جذبات سے تعبیر کرتے ہیں اور بابصر لوگ اسے منشائے حق سے تعبیر کرتے ہیں، جو مولاناؒ کے مقام کے لحاظ سے تکمیلِ فرائض کے وقت ان کے طبعی جذبات سے سرایت کئے ہوئے ہوتا ہے، اور اس لئے عموماً مخالف پر بھی اس کا اثر بُرا نہیں ہوتا، بنابریں ایسے حضرات کے معاملات میں محض جذبات سے صرف سطح ہی کو نہ دیکھ لینا چاہئے، بلکہ اس کی مخفی رُوح کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہئے۔ یہ ان کی عصمت یا خطا ونسیان سے بالاتر ہونے کا دعویٰ نہیں، بلکہ عامۃً منشائے خطا کے صواب ہونے کا دعویٰ ہے۔ یعنی ان کی خطا اِن شاء اللہ ایک عاصی کی سی خطا نہیں بلکہ ایک مجتہد کی خطا ہوسکتی ہے، جو اپنے فکر میں مُصِیب بھی ہوتا ہے اور خاطی بھی، بس اُن کی خطا سے صاحبِ معاملہ کی کلفت اور شکایت اپنی جگہ کتنی ہی دُرست اور صحیح کیوں نہ ہو، مگر وہ پھر بھی اپنی خطا پر مستحقِ اَجر ومقبولیت ہی رہتے ہیں، کیونکہ اس میں طلبِ حق اور استرضاءِ حق کے سوا نفسانی جذبات آگے نہیں ہوتے اور اَحیاناً بمقتضائے بشریت

ہوں بھی تو ایسے حضرات کی کثرتِ حسنات کے مقابلے میں ان کی یہ اَحیانی لغزشیں شاذ اور کالعدم ہوتی ہیں، جن سے ان کی مقبولیت کے مقام میں فرق نہیں پڑتا۔ اندریں صورت اس سے اختلافِ رائے بھی نیک نیتی سے ممکن ہے اور معاملات کے سلسلے میں ان کا کسی غلط فہمی یا خطاءِ اجتہادی سے کلفت و اذیت ہوجانا بھی ممکن ہے، لیکن ایسے صاحبِ مقام افراد سے نفسانی جذبات کے تحت کسی کی آزار رسانی عادۃً ناممکن ہے۔

اس سے میری غرض، نہ ان کے تمام معمولات اور منصوبات کی حمایت ہے اور نہ ان سے اختلاف رکھنے والوں کی مخالفت ہے، بلکہ ان کے باطنی رُتبے کی بلند مقامی اور ان بلند پایہ عزائم و جذبات پر روشنی ڈالنا ہے جو فکری اور عملی لغزشوں کو بھی مقبول اور ''ایں خطا از صد صواب اَوْلیٰ تر است'' کا مصداق بنادیتی ہے، اور یہ کہ وہ موافقت اور مخالفت ہر حال میں یکساں بلند مقام ہیں جیسا کہ قلوب بھی عامۃً اسے تسلیم ہی کئے ہوتے ہیں۔

بہرحال حضرتِ ممدوح کی کچھ خصوصیات ہیں، جن کے جامع لون سے من جانب اللہ کچھ خدمات ہی لی جارہی ہیں اور متوسلین کی تربیت بھی ہو رہی ہے، جو بھی سچی طلب اور حقیقی استفادے کا جذبہ لے کر آتا ہے وہ بلاشبہ اس جامع لون سے بقدرِ استعداد حصہ لے کر لوٹتا ہے، ہاں! اگر طلب ہی صادق نہ ہو یا سلسلے میں شامل ہونے کی غرض ہی فاسد ہو تو ان جذبات سے آنے والے انبیاء کے حلقوں سے بھی محروم ہی اُٹھے ہیں، تا با اولیاء چہ رسد۔

حضرتِ ممدوح کی ان خصوصیات کے پیشِ نظر یہ افسوس تھا کہ ان خصوصیات سے تربیت پا کر گو ایک حلقہ ضرور تیار ہوگیا، مگر علمی طور پر ان کا کوئی ذخیرہ سطحِ کاغذ پر جمع نہیں ہوا، جس سے موجودہ نسل کی طرح آئندہ نسل بھی فائدہ اُٹھاسکتی، خود حضرت مولاناؒ کو بھی اپنی غیر معمولی مصروفیات، مشاغلِ درس و تدریس، کثرتِ اَسفار، واردین و

صادرین کے ہمہ وقت ہجوم، سیاسی خدمات اور ان کے ذیل میں اربابِ معاملہ کے شبانہ روز رُجوع و زحام کے سبب اتنا موقع نہیں ملتا کہ آپ جتنی خدمات زبان اور دست و بازو سے انجام دیتے ہیں اتنی ہی قلم کے واسطے سے بھی انجام دیں، جس سے آپ کی یہ خصوصیات میدانِ عمل سے گزر کر میدانِ تصنیف میں آجائیں اور یہ لوگ معنوی دولتیں، جس طرح زبان فیض ترجمان سے سینوں میں بھر کر لے جاتے ہیں، اسی طرح قلم کی بدولت سفینوں میں بھی محفوظ کرلیں، تاکہ آج کی دُنیا کے ساتھ آنے والی دُنیا بھی اس سے مستفید ہوسکے، گو بعض اوقات مختلف علمی اور سیاسی مضامین، خطباتِ صدارت وغیرہ کی صورت میں خاص دواعی کے ماتحت قلم بند بھی فرمائے، لیکن وہ وقتی اور ہنگامی حالات سے تعلق رکھنے کے سبب صرف ان ہی حالات میں فیض رساں بن گئے جس سے لوگوں نے فائدہ اُٹھایا مگر وقت کی قید سے آزاد ہوکر کوئی مستقل علمی ذخیرہ غیر معمولی مشاغل و شواغل کے ہوتے ہوئے تصنیفی صورت میں اَب تک سامنے نہیں آسکا۔

پھر بھی اسے غیبی امداد سمجھنا چاہئے کہ حضرتؒ کے متوسلین نے وقتاً فوقتاً خطوط کے ذریعہ اپنے مختلف احوال پیش کرکے شفائے نفوس کی جو تدبیریں پوچھیں، تو ان کے جواب میں کچھ علمی، سیاسی اور عرفانی جواہر پارے کاغذ کی سطح پر جمع ہوگئے، جس سے فی الجملہ پیاسوں کی سیرابی کا کچھ مستقل سامان فراہم ہوگیا۔

ان مکاتیب اور ان کے مکنون وعلوم و احوال کی فہرست پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے ہی سے اس جامعیت کا اندازہ لگالینا مشکل نہیں رہتا، جو حضرتِ ممدوح کی ذات میں ودیعت کی گئی ہے، اور تمام ہی دِینی طبقوں میں یکساں شفاء بخش ہے۔ حال و قال والے حضرات ہوں یا براہین و استدلال والے ہوں، طالبانِ مسائل ہوں یا عاشقانِ دلائل سب ہی کے لئے اس مختصر مگر جامع ذخیرے میں سامانِ سیرابی موجود ہے۔

(مأخوذ از مقدمہ کتاب ''سوانح حضرت مدنی رحمہ اللہ'')

تعزیتی کلماتِ طیبات بر وفات
حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ

یہ جو بھائی ادریس کا حادثہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ کسی ایک گھرانے کا صدمہ نہیں، بلکہ تمام علمی حلقوں کا صدمہ ہے، ہر ایک نے اسے محسوس کیا، دارالعلوم میں جب اس کی اطلاع پہنچی تو تمام طلبہ اور اساتذہ پر غم کا ایک اثر ہوا، اسی وقت سب جمع ہوئے، جلسہ کیا، ایصالِ ثواب بھی کیا، جہاں تک میرا تعلق ہے یہ واقعہ ہے کہ طالب علمی کے زمانے سے میرا ان سے جو ربط تھا اور ان کا میرے ساتھ، وہ بہت غیر معمولی تھا، بہت ہی زیادہ محبت، خلوص اور تعلق، ان کے یہاں آنے کے بعد بھی وہی تعلق باقی رہا، بلکہ پاکستان آنے میں ایک مستقل خوشی کا پہلو ہوتا تھا کہ بھائی ادریس سے ملاقات ہوگی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ موت تمام غموں اور اَلموں کا نچوڑ ہے، اگر ہمارے تمام غموں کو یکجا جمع کیا جائے تو ان کی شکل موت ہی کی ہوگی، بہرحال موت ایک عظیم چیز ہے لیکن جہاں موت عظیم چیز ہے، اور دِلوں کو دُکھا دینے والی ہے وہیں اس میں نعمت کے پہلو بھی ہیں، حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے: ''الموت تحفة المؤمن'' موت مؤمن کا تحفہ ہے، تو تحفہ اور وہ بھی من اللہ تحفہ، ظاہر ہے کہ اس کی عظمت میں کس کو کلام ہوسکتا ہے، اور وہ صرف ایک تحفہ ہی نہیں بلکہ ولایت کی بھی علامت ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں یہود کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے:-

قُلْ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِیَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ

النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ. (الجمعہ:۶)

تو تمنائے موت حقیقت میں ولایت کی علامت ہے، اور اس لئے ہے کہ حق تعالیٰ نے ایک تحفہ بنایا ہے، اور ولایتِ کاملہ والے زندگی کے بجائے موت کو زیادہ پسند کرتے ہیں، جس کی وجہ دُوسری حدیث میں یہ بیان کی گئی: "ان الموت جسر یَصِلُ الحبیبَ الی الحبیبِ" موت ایک پُل ہے جو محبوب کو محبوب تک پہنچادیتا ہے، تو جہاں موت میں غم و اَلم کے پہلو ہیں، وہاں اس میں خوشی کا پہلو بھی ہوتا ہے کہ مرنے والا اپنے محبوبِ حقیقی کے پاس چلا جاتا ہے، اس لحاظ سے موت، خوشی کی بھی چیز ہوئی۔

ہر چیز میں اس کی ابتداء بھی قابلِ مسرّت ہوتی ہے، اور انتہاء بھی قابلِ مسرّت ہوتی ہے، ولادت پر خوشیاں مناتے ہیں کہ یہ آغاز ہوتا ہے زندگی کا، موت بھی خوشی کی چیز ہے کہ اس سے اِتمام ہوتا ہے نعمتوں کا، اس لئے کہ موت قاطع نہیں ہے بلکہ متمم ہے، جس حالت پر موت آتی ہے وہ حدِ کمال ہوتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ پھر موت کا غم کیوں کرتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ موت پر کسی کو غم نہیں ہوتا، موت اگر اچھی ہو تو عام طور پر کہا کرتے ہیں کہ خدا سب کو ایسی موت نصیب کرے، اگر موت غمی کی چیز ہوتی تو اس کی دُعا کیسے کرتے؟ کسی کا انتقال ہوگیا جمعہ کے دن، ماہِ رمضان میں، شبِ قدر میں، تو خوشی کا اظہار کرتے ہیں کہ بڑی اچھی موت ہے، موت کی جستجو کوئی غم کی چیز نہیں، اس لئے کہ اگر بندہ اللہ سے جاملے تو یہ کون سی غم کی بات ہے جس پر آدمی رنجیدہ ہو۔ اگر آدمی دُنیا کے غموں سے آزاد ہوجائے تو خوشی کی بات ہے کہ وہ تمام خرخشوں سے چھوٹ کر پاکیزہ زندگی میں پہنچ گیا۔

موت سے اصل میں غم ہوتا ہے اس بات کا کہ ایک عزیز ہم سے جدا ہوگیا، اس کا رشتہ ہم سے کٹ گیا، ایک فیض ہم سے منقطع ہوگیا، یہ موت کا غم نہیں، ایک عزیز کی مفارقت کا غم ہے۔

آج بھی جو ہم اپنے بھائی کا غم کر رہے ہیں وہ درحقیقت ان کی جدائی کا غم ہے، موت نے تو اُن کو بہت اُونچے مقام پر پہنچادیا، دُنیا سے کہیں زیادہ بلند مقامات اُنہیں ملیں گے۔

عالم، عالم ہونے کے ساتھ تقی، نقی، محدّث، مفسر، جتنے علوم دِینیہ ہیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں اس میں کمال عطا کیا تھا، اور وہ کمال رات دن کی مزاولت سے ان کی رُوح میں پیوست ہوچکا تھا، خود ان کی رُوح باکمال تھی، اور پاکیزہ رُوح کا وہاں بھی خیر مقدم کیا جاتا ہے، ہر مؤمن کو کہا جاتا ہے: ''أخرجي أيتها النفس الطّيبة كانت في الجسد الطّيب أخرجي الى رَوحٍ وريحان وربٍّ غير غضبان''۔

تو جب عامۂ مؤمنین کے لئے یہ بشارت ہے تو خاصۂ مؤمنین کے لئے کتنی عظیم بشارت ہوگی۔

خدا نے اُنہیں دُنیا میں بھی مقبولیت دی تھی، اور اپنے ہاں بھی اِن شاء اللہ مقبولیت ہی سے نوازے گا، غم ہے ہمارا کہ ہم سے بڑا فیض منقطع ہوگیا، ایک بڑی شخصیت ہم سے جدا ہوگئی، اور ہمارا یہ غم و اَلم ہماری خودغرضی پر مبنی ہے، وہ غرض خواہ محمود ہی کیوں نہ ہو، تو درحقیقت ہمیں ایک عزیز کے جدا ہونے اور اپنے اغراض و مقاصد کے فوت ہونے کا صدمہ ہے۔

امام محمد رحمہ اللہ کو ان کی وفات کے بعد کسی عارف باللہ نے خواب میں دیکھا، پوچھا: حضرت! مرنے کے بعد کیا گزری؟

فرمایا: دُنیا میں علماء موت سے ڈراتے رہتے تھے کہ بڑی سخت چیز ہے، بڑی سخت چیز ہے، میں تو فقہ کا ایک مسئلہ سوچ رہا تھا، سوچتے سوچتے یہاں آپہنچا، کچھ خبر نہیں موت کیسے آئی؟ دُوسری بات یہ فرمائی کہ: حق تعالیٰ نے مجھے بخش دیا، اور فرمایا: اے محمد! اگر مجھے بخشنا نہ ہوتا تو اپنا علم تیرے سینے میں کیوں ڈالتا۔

گویا علم ڈالنا علامت ہے اس کی کہ اُسے بخش دیا جائے گا۔

حق تعالیٰ شانہ نے اُن کے سینے میں اپنا علم ڈالا، اور علم کے ساتھ آثارِ خشیت، تقویٰ، طہارت عطا کیے، تو ایسا علم جو عمل کے ساتھ مقرون ہو، یہ ذریعہ ہے مقبولیت کا کہ اللہ تعالیٰ وہاں بھی مقبولیت سے نوازیں گے۔ لیکن جتنا بڑا ان کا علم و کمال تھا، اتنا ہی ہم لوگوں کو غم ہے کہ اس کمال سے محروم ہوگئے، یہ جدائی کا صدمہ ہے اور رہے گا، جب کوئی بڑی شخصیت اُٹھتی ہے تو برسہا برس تک ہر موقع پر یاد آتی ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اہلِ علم اہلِ کمال مرتے نہیں، جب ان کے آثار موجود، ان کا علم موجود، ان کا کمال سامنے، وہ درحقیقت ایک دُوسرے رُوپ میں زندہ ہیں اور ہماری تربیت اور رہنمائی کررہے ہیں، اہل اللہ مرتے نہیں اوجھل ہوجاتے ہیں۔

میں نے طالب علمی کے زمانے میں حضرت نانوتویؒ کا مرثیہ کہا تھا، اس کے دو اشعار یاد ہیں:-

نہ موت است ایں کہ دانی، بل وصال است
کہ نزدِ عاشقاں افزوں کمال است
وگر نہ موتِ کامل ارتحال است
کہ از حالے بحالے انتقال است
کہ خورشیدے است زیر ابر پیدا
بگیتی روز روشن جاں بہ ہر جا

ان کے علم کی روشنی آج بھی موجود ہے، انہوں نے اپنے ورثے میں جہاں بحمداللہ سعادت مند اولاد چھوڑی ہے، وہاں ان کا سب سے بڑا ترکہ ان کی کتابیں اور اُن کی تصانیف ہیں، جن کی روشنی دُنیا کو ہمیشہ منوّر کرتی رہے گی، حق تعالیٰ نے ان کو توفیق بخشی تھی ان کو موفق بنایا تھا، ان کی تمام تصانیف میں آثارِ توفیق نمایاں ہیں، تفسیر لکھی تو وہ بہترین، حدیث کی شرح لکھی تو وہ بہترین، باطل کا ردّ کیا تو وہ بہترین، غرض دین کے جتنے شعبے ہیں، ان میں اللہ تعالیٰ نے ان سے خوب کام لیا، ان کو موفق

بنایا، میسر بنایا، توفیق بھی دی اور کام بھی آسان کر دیا۔

جب میں یہاں ان کے پاس حاضر ہوتا، غالبًا یہی کمرہ تھا، میں دیکھتا دو دو، تین تین ڈیسک رکھے ہوئے ہیں، ہر طرف کتابیں پھیلی پڑی ہیں، میں کہتا: ارے بھائی ادریس! یہ تم نے کیا کر رکھا ہے؟ کہنے لگے: ''کُلّ جدید لذیذ'' ایک ڈیسک پر بیٹھتا ہوں، اتنے میں پہلے کی طرف رغبت ہو جاتی ہے۔ میں نے کہا: رات دن تم اِسی چکر میں رہتے ہو، اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر۔ میری اُن سے بہت بے تکلفی تھی، وہاں دارالعلوم کے زمانے میں بھی میرا یہ معمول تھا کہ ہر جمعرات کو مغرب کے بعد ان کے مکان پر جاتا، میرے لئے خاص طور پر چائے بنواتے، کئی کئی گھنٹے مجلس رہتی، باتیں یہی ہوتیں علمی۔

بہرحال قدرتی طور پر اس دیرینہ رفاقت کی وجہ سے جتنا صدمہ دِل پر ہوا وہ بہت ہے، سبھی اہلِ علم نے اُسے محسوس کیا، حق تعالیٰ ان کے درجے بلند فرمائے آمین۔

حضرت قاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم، مورخہ ۲۸ /جنوری ۱۹۷۵ء کو لاہور تشریف لائے، جس کمرے میں قبلہ والد صاحب مطالعے میں مصروف رہتے تھے، اسی کمرے میں قاری صاحب نے یہ انٹرویو ریکارڈ کرایا جسے ناچیز راقم بطور مقدمہ شامل کر رہا ہے۔

(مقدمہ کتاب ''تذکرہ مولانا ادریس کاندھلویؒ، مرتبہ ڈاکٹر محمد میاں صدیقی)

میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ، وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا، اَمَّا بَعْدُ:

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ، بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ، وَکَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا. الٰی قولہ: وَکَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیْلًا. (الاحزاب) صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ.

بزرگانِ محترم! یہ جلسہ جیسا کہ آپ کے علم میں ہے، جلسہ میلاد النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام سے منعقد کیا گیا ہے، گویا اس کا موضوع یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کا ذکر کیا جائے، اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ طیبہ کا ذکر حقیقۃً عین عبادت ہے، اور اللہ کے نزدیک بڑی بھاری طاعت اور قربت ہے اور سارے کمالات و برکات کا سرچشمہ ہے، اس لئے میلاد النبیؐ کا تذکرہ ایک عظیم نعمت ہے، جو مسلمانوں کو عطا کی گئی۔ تو میں اس وقت میلادِ نبوی ہی کے

بارے میں چند کلمات آپ حضرات کی خدمت میں گزارش کروں گا، اور اسی مناسبت سے یہ چند آیتیں میں نے تلاوت کی ہیں جو آپ کے سامنے ابھی پڑھی گئیں۔

میں چاہتا ہوں کہ میلاد کے سلسلے میں آپ بھی چونکہ ولادت کا ذکر سننے کے لئے آئے ہیں، ولادت کا ذکر بھی کروں لیکن میں ایک ولادت کے بجائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دو ولادتوں کا ذکر کروں گا۔

ولادتِ نبوی جسمانی و رُوحانی

ممکن ہے کہ آپ کو یہ سن کر حیرت ہو کہ ولادت تو ایک ہی ہوتی ہے، پیدائش ایک ہی مرتبہ ہوتی ہے تو دو ولادتیں کیسی؟ لیکن میری گزارشات کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ حقیقۃً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو ہی ولادتیں ہوئیں، ایک ولادت باسعادت تو ۱۲ یا ۸/ربیع الاوّل کو علی اختلاف الاقوال ہوئیں، اور ایک ولادت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چالیس برس کے بعد ہوئی، یعنی رُوحانی ولادت، جب سے آپ نبی اور پیغمبر کی حیثیت سے دُنیا میں ظاہر ہوئے۔ ۱۲/ربیع الاوّل کو ولادتِ جسمانی ہوئی اور چالیس برس بعد ولادتِ رُوحانی ہوئی جس کو ہم نبوّت سے تعبیر کریں گے۔

۱۲/ربیع الاوّل کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جمال دُنیا میں ظاہر ہوا اور چالیس برس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال دُنیا میں ظاہر ہوا۔ تو ایک جمال کی حیثیت سے ولادت ہے اور ایک کمال کی حیثیت سے ولادت ہے، دونوں ولادتوں میں ہمارے لئے ان کا ذکر عبادت اور طاعت ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دُنیا میں جمال ظاہر ہونا یہ بھی عالَم کے لئے عظیم ترین نعمت ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال دُنیا میں ظاہر ہونا یہ اس سے بھی بڑی نعمت ہے جو اللہ نے ہمیں عطا فرمائی ہے۔ تو جمالِ محمدی وہ بھی ایک ایسی امتیازی شان رکھتے ہیں کہ دُنیا میں اتنا بڑا جمیل اور صاحبِ جمال پیدا نہیں ہوا جتنا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جمال والے تھے، اور اتنا بڑا با کمال

بھی کوئی پیدا نہیں ہوا جتنا کہ کمال والے آپ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، تو دونوں ولادتیں امتیازی شان رکھتی ہیں، نہ ولادت، جسمانی کی نظیر ہے، نہ ولادتِ رُوحانی کی نظیر ہے، فرق اتنا ہے کہ ۱۲/ربیع الاوّل کو ہمارے سامنے ظہور ہوا محمد بن عبداللہ کا اور چالیس برس کے بعد ظہور ہوا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا، اس وقت آپ ابنِ عبداللہ کی حیثیت سے دُنیا میں آئے اور چالیس برس کے بعد رسول اللہ کی حیثیت سے دُنیا میں تشریف لائے۔

نوٹ:- اس کے بعد حضرت قاری صاحبؒ کی بڑی مفصل اور پُر مغز تقریر ہے جو پچاس صفحات پر مشتمل ہے، ختمِ نبوّت سے متعلق حصہ پیشِ خدمت ہے۔

آپؐ فقط نبی نہیں بلکہ خاتم النبیّین بھی ہیں

تو اسلام خُلقِ عظیم سے پھیلا ہے کہ تلوار کے زور سے، آپؐ کا صبر، آپؐ کی رحمت، آپؐ کی شجاعت، آپؐ کی سخاوت یہ اخلاقِ ربانی تھے کہ جنھوں نے واضح کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے پیغمبر اور اس کے رسول ہیں، اور اس کے ساتھ ساتھ معجزات، پھر وحی کے ذریعہ علوم یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ جن کے ذریعہ قلوب کے اندر ایمان پیدا ہوتا ہے، لوگ دِین کی طرف آتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: کسی نبی کو وہ اَذیتیں نہیں اُٹھانی پڑیں کسی قوم سے، جتنی سختیاں مجھے جھیلنی پڑیں، جتنی تکلیف مجھے پہنچی۔ حالانکہ بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ نوح علیہ السلام کو زیادہ تکلیف پہنچائی گئی، ساڑھے نو سو برس تبلیغ فرمائی اور قوم ان کا مذاق اُڑاتی رہی، موسیٰ علیہ السلام کو فرعون سے تکلیفیں پہنچیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنی نہیں پہنچیں۔ پھر کیوں فرمارہے ہیں کہ جتنی اَذیتیں مجھے پہنچیں، وہ کسی کو نہیں پہنچیں؟

اس کی بناء یہ ہے کہ اَذیت تب زیادہ پہنچتی ہے جب شفقت زیادہ ہوتی ہے، جتنی آپ کو کسی سے محبت ہوگی، اس سے اگر آپ کو تھوڑی بھی تکلیف پہنچے گی تو زیادہ محسوس ہوگی کہ اسے تکلیف پہنچانے کا حق نہیں تھا، میں تو اتنی محبت کروں اور یہ

ایذاء پہنچائے؟ اگر دُشمن آپ کو گالیاں بھی دے آپ خیال بھی نہیں کرتے، لیکن اگر آپ کا بیٹا ترچھی نگاہ سے دیکھ لے تو گھر سے نکال دیں گے، انتہائی صدمہ پہنچے گا، کیونکہ اس سے یہ توقع نہیں تھی کہ جس پر اتنی شفقت اور رحمت ہو، وہ تکلیف پہنچائے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو چونکہ اُمت کے حق میں بے حد شفقت تھی، بے حد رحمت تھی، اس لئے ان کی اذیت دُگنی اور تگنی ہوکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو لگتی تھی، کہ میں تو اتنا شفیق اور یہ میرے ساتھ یہ برتاؤ کریں؟ تو شدتِ شفقت کی وجہ سے اذیت زیادہ محسوس ہوتی تھی، اسی لئے حق تعالیٰ کو روکنا پڑا کہ ذرا سی اس شفقت میں کمی کریں، اتنی زیادہ شفقت نہ کریں کہ اَخیر میں خود آپ کو ہی بھگتنا پڑے، فرمایا: ''لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ أَلَّا یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ'' شاید آپ اپنے آپ کو اس غم میں ہلاک کرڈالیں گے کہ یہ کیوں نہ مسلمان بن جائیں۔ آپ ان کو چھوڑیئے، تبلیغ کردیجئے، نہیں مانتے تو جائیں جہنم میں، آپ ان کا کیوں دُکھ اُٹھاتے ہیں؟ لیکن غایت رحمت کی وجہ سے دُکھ اُٹھاتے تھے، انتہائی شفقت اور خُلقِ عظیم کی وجہ سے اس درجہ رحیمانہ اخلاق تھے کہ حق تعالیٰ کو روکنا پڑا کہ اتنی شفقت بھی نہ کریں کہ خود آپ کو تکلیف پہنچے۔ تو حاصل یہ نکلا کہ صبر ہو، سخاوت ہو، شجاعت ہو، چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں اس واسطے اخلاق میں بھی خاتم الاخلاق ہیں کہ اخلاق کا وہ درجہ دُوسرے انبیاء علیہم السلام کو نہیں دیا گیا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا، علم کا جو درجہ انبیاء کو دیا گیا اس سے دوگنا چوگنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو مقامِ علم ہے وہ مقام دُوسرے انبیاء علیہم السلام کو نہیں دیا گیا، جو مقام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اَحوال کا ہے وہ دُوسرے انبیاء علیہم السلام کو نہیں دیا گیا، اس لئے اور انبیاء نبی تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فقط نبی نہیں تھے بلکہ خاتم النبیّین تھے۔

خاتم النبیّین کا مطلب

اور خاتم النبیّین کا مطلب یہ ہے کہ نبوّت، علم اور اَخلاق کے جتنے مراتب

ہیں وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات کے اُوپر ختم ہو چکے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سارے کمالات کے منتہی ہیں، سب کمالات کی انتہاء آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر آ کر ہوگئی تھی۔ گویا اب کوئی درجہ نبوّت کا باقی نہیں رہا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی آئے اور اس درجے کو لے کر چلائے اور تبلیغ کرے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات کے اُوپر سارے مراتب ختم کردیئے گئے، اس سے آگے نہ نبوّت کی ضرورت تھی، نہ شریعت کی ضرورت تھی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دِین خاتم الادیان تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی کتاب خاتم الکتب تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت خاتم الشرائع تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات خاتم الانبیاء تھی تو ہر چیز کا انتہائی مقام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا گیا تھا، علم کا، اَخلاق کا، کمالات کا، ختمِ نبوّت کی وجہ سے، کیونکہ نبوّت ختم ہوچکی تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں تھا۔

ممکن ہے کوئی شخص یہاں شبہ کرے کہ ''ختمِ نبوّت'' نبوّت ختم ہوچکی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُوپر، آگے کوئی نبی نہیں تو نبوّت تو سب سے بڑی رحمت ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمت بنا کر بھیجا گیا تھا تو ہزاروں نبی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آنے چاہئیں تھے، مگر معاذ اللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو رحمت نہیں، زحمت بن گئے کہ نبوّت جیسی رحمت کا دروازہ ہی بند ہوگیا کہ نبی آنے ختم ہوگئے، تو یہ رحمت کہاں ہوئی؟ معاذ اللہ یہ تو زحمت ہوگئی، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رحیم ہونے کا تقاضا ہے کہ نبوّت کا دروازہ کھلا رہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہزاروں نبی آنے چاہئیں۔ بعض ایسے لوگوں نے جو خود چاہتے تھے کہ ہم نبی بن جائیں مگر بن نہیں سکے، اتفاق سے دعوے بھی بہت کچھ کئے مگر نبوّت پھبی نہیں، قطع نظر اس کے کہ ختم ہوچکی تھی، مل نہیں سکتی تھی، وہ ان کی ذات پر پھبی ہی نہیں۔

جیسے بعض لوگ ٹوپی اوڑھ لیتے ہیں اور ان کو اچھی نہیں لگتی تو بعض مرتبہ چہرہ

تو اتنا خوبصورت ہوتا ہے کہ کوئی لباس پہن لیں پھب جاتا ہے اور بعض مرتبہ ایسا بھدا ہوتا ہے کہ لباس بھی اس کے اُوپر بھدا ہوجاتا ہے۔ تو قطع نظر ختم ہونے یا نہ ہونے کے ان کی ذات پر پھبی نہیں اور چسپاں نہ ہوسکی، مگر انہوں نے نبوّت کے دعوے کرنے کے لئے یہ شبہ پیدا کیا کہ نبوّت عظیم رحمت ہے اور جو نبوّت کا دروازہ بند کرے وہ رحمت کہاں رہا؟ وہ تو زحمت بن گیا، تو دروازہ کھلا رہنا چاہئے، نبی آتے رہنے چاہئیں۔ یہ شبہ ممکن ہے کسی کے ذہن میں ہو یا ڈالا جائے، اس کے لئے جواب عرض کرتا ہوں۔

جواب کا حاصل یہ ہے کہ ختمِ نبوّت کا معنی قطع نبوّت کا نہیں کہ نبوّت قطع ہوگئی، دُنیا سے منقطع ہوگئی، ختمِ نبوّت کے معنی تکمیلِ نبوّت کے ہیں، یعنی نبوّت کامل ہوگئی، اور چیز کے کامل ہونے کے بعد کوئی درجہ باقی نہیں رہتا ہے کہ وہ آئے۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے رات کا وقت ہے اور ستارے چمکنے شروع ہوئے، غروب کے بعد ایک چمکا، دُوسرا، تیسرا، ہزار، لاکھ، کروڑ، دس کروڑ، سارا آسمان جگمگا اُٹھا، آسمان ستاروں سے بھرا ہوا ہے اور چاند بھی نکلا ہوا ہے تو چاند ستارے نور پھیلا رہے ہیں، لیکن رات نہیں جاتی، دن نہیں ہوتا، رات کی رات، سب نے مل کر کتنی روشنی دی مگر رات موجود ہے، رات نہیں جاتی۔

آفتاب کے آنے کا جب وقت ہوا تو نکلا نہیں، پو پھٹی تھی، بس صبحِ صادق نے اطلاع دی کہ آفتاب آرہا ہے، بس خبر آنی تھی کہ اندھیرا غائب ہونا شروع ہوا اور دُنیا میں چاندنا ہوا، ایک ہی ستارے نے آکے سارے جہان کو چمکا دیا۔ یعنی وہ تو لاکھوں کروڑوں مل کر روشنی ڈال رہے تھے مگر رات کو زائل نہیں کرسکے، دھکا نہیں دے سکے رہی رات کی رات، اور ایک ستارہ نکلا اس نے آکے ساری رات کو دھکیل دیا پورے عالم میں چاندنا ہوگیا۔ اگر آفتاب یوں کہے کہ: ''أنـا خـاتم الأنوار'' میں نے سارے انوار کو ختم کردیا، سارے انوار میری ذات پر ختم ہیں، میرے آنے کے بعد

اب کسی ستارے کی ضرورت نہیں اور نہ اب کوئی نیا ستارہ آنے والا ہے، اس لئے کہ میں اتنا کامل نور لے کر آیا ہوں کہ اب کسی ستارے کی حاجت نہیں، جو موجود تھے بھی ان کا نور بھی ماند پڑ گیا، ان کے نور بھی غائب ہوگئے، اب وہ نمایاں ہونے کے قابل نہیں ہیں، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آفتاب نے ستاروں کا نور چھین لیا ہے، وہ تو منوّر ہیں، مگر آفتاب کی تیزی اور چمک کے سامنے ان کی چمک ماند ہے، وہ نظر بھی نہیں آتے، ایسے وقت میں آفتاب یوں کہے کہ: "أنا خاتم الأنوار" میں ہوں خاتم الانوار، سارے انوار اور چمکیں مجھ پر ختم ہوگئیں، اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اب نور کا کوئی ایسا درجہ باقی نہیں ہے کہ اب کوئی اور ستارہ آئے اور نور پھیلائے، اب مغرب کے وقت تک میں اکیلا ہی کافی ہوں، کسی ستارے کے آنے کی ضرورت نہیں ہے، ہاں! یہ دن ہی ختم ہوجائے، یہ جہان ہی ختم ہوجائے یہ بات الگ ہے، لیکن جب تک یہ دن موجود ہے کسی ستارے کی حاجت نہیں ہے، اس لئے کہ انوار میری ذات کے اُوپر ختم ہوگئے، تو کیا آفتاب کے "خاتم الانوار" کہنے کا یہ مطلب ہوگا کہ نور ختم ہوگیا، نور مٹ گیا دُنیا سے، اندھیرا چھا گیا، یا یہ مطلب ہوگا نور کے ختم ہونے کا کہ نور کے مراتب ختم ہوئے، کامل ہوئے اب کسی دُوسرے ستارے کے آنے کی ضرورت نہیں، دُوسری چمک کی حاجت نہیں ہے، تو ختمِ انوار کے معنی قطعِ انوار کے نہیں، بلکہ تکمیلِ اَنوار کے ہیں کہ نور کامل ہوگیا اب کسی اور نور کی ضرورت نہیں ہے۔

یہی دو بنیادیں ہیں نبوّت کی، تو نبوّت بھی انتہائی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیّین ہیں، تو ختمِ نبوّت میں ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پوشیدہ ہے۔

ابتدائی درجہ عصمت اور معصومیت کا ہے، اس کے بعد اخلاق کا ہے، اس کے بعد اعمال کا ہے، اور اس کے بعد احوال کا ہے، تو میں نے کچھ روشنی ڈالی عصمت کے اُوپر، کچھ روشنی ڈالی اخلاق کے اُوپر، اعمال اور احوال کا باب بہت وسیع ہے اس کے لئے وقت درکار ہے، اتنا وقت نہیں ہے، وقت تنگ ہوگیا ہے، اخیر ہوگیا ہے، اس لئے

مناسب یہ ہے کہ اب اس تقریر کو ختم کیا جائے اور کون ہے جو وہ سیرت کی ساری چیزیں بیان کرسکے۔

سیرتِ نبوی کیا ہے؟

اس واسطے کہ سیرت کے بارے میں صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیا تھے؟ تو فرماتی ہیں کہ جو قرآن ہے یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق ہے، جسے اخلاق دیکھنے ہوں قرآن دیکھ لے، تو قرآن کے عجائبات قیامت تک تمام نہیں ہوں گے تو سیرت کے عجائبات کہاں سے تمام ہوسکتے ہیں؟ قیامت تک لاکھوں بیان کرنے والے بیان کرتے جائیں پھر بھی سیرت مکمل بیان نہیں ہوسکتی۔

اس واسطے میں چاہتا ہوں کہ اب ختم کروں، میں نے یہ آیت پڑھی تھی کہ: ''مَاکَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّنَ'' محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم میں سے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں، یعنی نسبی رشتہ نہیں ہے لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں، یعنی رُوحانی رشتے کے باپ ہیں، مادّی اور نسبی رشتے کے باپ نہیں ہیں، جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں حدیث میں: ''أنا لکم بمنزلة الوالد'' میں تمہارے حق میں بمنزلہ باپ کے ہوں، یعنی رُوحانی باپ، تو جیسے اولاد ماں باپ سے تربیت پاتی ہے، تو رُوحانی اولاد رُوحانی ماں باپ سے تربیت پاتی ہے، تو میں رُوحانی باپ ہوں اور سارا عالَم میرے زیرِ تربیت ہے، اور ساتھ یہ بھی فرمایا کہ رُوحانی باپ ہو یا مادّی، وہ ایک ہی ہوا کرتا ہے، دو دو باپ کسی کے نہیں ہوا کرتے، تو میں چونکہ رُوحانی باپ ہوں اس لئے ایک ہوں، تو میرے بعد کوئی اور باپ آنے والا نہیں ہے، میری اُبوّت اتنی مکمل ہے کہ وہ تربیت کے لئے کافی ہے۔ ''وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّنَ'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول اور خاتم النبیّین ہیں، اب نبوت کا

یا باپ ہونے کا کوئی درجہ باقی نہیں ہے کہ نبوّت کے درجے میں کوئی رُوحانی باپ بن جائے، نبوّت ختم ہوچکی، جس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ نبوّت کو ایک محل سمجھو جس کی تعمیر ہو رہی تھی، جس کی آخری اینٹ میں ہوں، میں نے قصرِ نبوّت کو مکمل کردیا، اب کوئی انتظار کی حالت باقی نہیں ہے، اب نہ باہر سے کوئی چیز آئے گی نہ اندر سے باہر جائے گی۔

بہرحال چونکہ جلسے کا موضوع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی میلا د مبارک تھا، تو ایک میلادِ جسمانی کا ذکر کیا اور زیادہ تفصیل میلادِ رُوحانی کی کی، کیونکہ ہماری سعادت کا تعلق میلادِ رُوحانی سے ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت و رسالت اور رسالت کے اخلاق، اعمال اور احوال سے ہے، اس لئے اس کی تفصیل میں نے زیادہ کی اور اسی لئے یہ آیت پڑھی تھی کہ وہ ساری تفصیلات اس میں تھیں جو چھپی ہوئی تھیں۔ ختمِ نبوّت کے اندر تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتہائی کمالات اس لئے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت انتہائی تھی تو اس واسطے علم و اخلاق کا ذکر آیا اور وہ چونکہ انتہائی تھے اس لئے ختمِ نبوّت کا ذکر آیا، اور چونکہ ختمِ نبوّت کا ذکر کرنا تھا تو آیت وہ پڑھی جس میں ختمِ نبوّت کا تذکرہ کیا گیا ہے اور اسی سے یہ سیرت شروع کی۔ دُعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اس پاک اور عظیم الشان پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور نقشِ قدم پر چلنا نصیب فرمائے، اور اللہ تعالیٰ ہم کو اپنی مرضیات پر چلائے اور اپنے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں پر چلنے کی توفیق نصیب فرمائے اور ہم کو سچا اور سیدھا مسلمان بنائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

(مأخوذ از ''خطباتِ اکابر'' جلد اوّل)

آفتابِ نبوّت اور ختمِ نبوّت

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ، أَمَّا بَعْدُ:

ختمِ نبوّت کی مثال یوں سمجھئے کہ جس طرح آفتاب کی سب سے بڑی امتیازی شان اور سب سے اُونچی خصوصیت فقط یہی نہیں کہ وہ بڑی روشنی والا ہے جو اور ستاروں میں نہیں پائی جاتی، بلکہ یہ ہے کہ وہ روشنیوں کا منتہا اور دُوسرے ستاروں کے حق میں روشنی بخش ہے، جس سے اور ستاروں میں روشنی آتی ہے اور اسی کے دَم سے قائم رہتی ہے، یعنی آفتاب کا کمال محض روشن ہونا یا سب ستاروں سے زیادہ نورانی ہونا نہیں بلکہ ان سب نور کی اصل ہونا ہے، کہ وہ سب اپنے نور میں آفتاب کے محتاج ہیں اور خود آفتاب اپنے نور میں کسی کا محتاج نہیں کہ اس کا نور اپنا ہے، اور باقی ستاروں کا نور خود ان کا اپنا نہیں بلکہ آفتاب سے مأخوذ ہے۔ چنانچہ ماہرینِ ہیئت اور فلاسفہ کے نزدیک آفتاب کے سوا تمام ستاروں کا بڑا کمال صرف جسم کی صفائی اور شفافی ہے کہ نور قبول کرسکیں، اس کے فیض سے یہ سارے ستارے بھی اس کی محاذات میں آکر نورانی ہوجاتے ہیں، خواہ حجم وضخامت میں کوئی ستارہ آفتاب سے بڑا بھی ہو، جیسا کہ موجودہ سائنس دانوں کا دعویٰ بھی ہے کہ بے شمار ستارے ہیں جو حجم وضخامت میں آفتاب سے کہیں بڑے ہیں، مگر نور میں بڑا کوئی نہیں، جبکہ کسی ستارے کا نور ہی خود اپنا نہیں بلکہ آفتاب سے لیا ہوا ہے۔ پس آفتاب تمام ستاروں کے حق میں مربی اور مصدرِ فیض نکلتا ہے، اس لئے آفتاب کا امتیاز محض نورانی ہونا نہیں بلکہ نورانیت کی اصل ہونا نکلتا ہے۔

بنابریں یہ سمجھنا غیر معقول نہ ہوگا کہ سب انوار کی انتہاء آفتاب پر ہوجاتی ہے، وہیں سے نور سب ستاروں کے لئے چلتا ہے، جبکہ وہ اس کے سامنے ہوں، خواہ اُوپر ہوں یا نیچے اور حجم وضخامت میں بڑے ہوں یا چھوٹے اور سب میں ہوتا ہوا اسی طرف لوٹ آتا ہے۔

یہی شان کسی وصف کے خاتم کی ہوتی ہے کہ وہ وصف اسی سے چلے اور اسی پر لوٹ آئے، وہی فاتح ہو اور وہی خاتم ہو، وہی اس وصف کا مبدا ہو اور وہی منتہا ہو، وہی اوّل ہو اور وہی آخر ہو، اس لئے اب ہم سورج کو محض نورانی نہیں کہیں گے بلکہ نور بخش اور نور آفریں کہیں گے، اور محض صاحبِ انوار نہیں کہیں گے بلکہ خاتم الانوار کہیں گے، جبکہ سب ستاروں کو نور اس سے ملتا ہے اور اس نوری حرکت میں پھر اسی کی طرف عود کر آتا ہے، پس سورج کی یہ خاتمیّتِ انوار ہی درحقیقت اس کے سارے کمالات کا ممتاز عنوان ہوگا جو اس کی امتیازی شان کو نمایاں کر سکے گا، نہ کہ مطلقاً نورانی ہونا کہ وہ قدرِ مشترک کے طور پر سب ستاروں میں درجہ بدرجہ پایا جاتا ہے۔ نیز محض ستارہ دُوسرے ستاروں سے نور میں زیادہ ہونا بھی اس کی کوئی آخری امتیازی شان نہ ہوگی کہ یہ نسبتی کمی بیشی بھی ستاروں میں موجود ہے، جبکہ ہر ستارہ روشنی میں کسی ستارے سے بڑا اور کسی ستارے سے چھوٹا ہے، بلکہ اصل امتیازی خصوصیت وہی نور بخشی اور سب ستاروں کے نور کی اصل ہوتا ہے۔

ٹھیک اسی طرح آفتابِ نبوّت (جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان صرف نبی ہونا نہیں کہ یہ شان قدرِ مشترک کے طور پر ہر نبی میں موجود ہے، نیز ان تمام نجومِ ہدایت (انبیاء علیہم السلام) سے کمالاتِ نبوّت میں محض اضافی طور پر کچھ زائد یا فائق ہونا بھی نہیں کہ یہ تفاضل اور فرقِ مراتب اور انبیاء میں بھی قائم ہے:۔

تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ.

ترجمہ:۔ یہ رسول ہیں جن کو ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل امتیازی وصف یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نورِ نبوّت میں سب انبیاء کے مربی، ان کے حق میں مصدرِ فیض اور ان کے انوارِ کمال کی اصل ہیں۔ اس لئے اصل میں نبی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور دُوسرے انبیاء علیہم السلام اصل میں نبی نہیں، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض سے نبی ہوئے ہیں، ان مقدسینِ سابقین کا کمال درحقیقت ان کے جوہروں کی صفائی اور شفائی اور استعداد اور ان کی باطنی استعدادوں کا فطری کمال ہے کہ جوں ہی ان کے قلوبِ صافی اور اَرواحِ طاہرہ کے سامنے آفتابِ نبوّت کا نورانی چہرہ آیا، انہوں نے اس کی ساری شعاعیں قبول کرلیں اور خود منوّر ہوکر دُوسروں کو وہ روشنی پہنچانی شروع کردی۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سب حضراتِ انبیاء علیہم السلام کے حق میں مربی اور اصل نور ثابت ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کو نبی الاُمت ہی نہیں بلکہ نبی الانبیاء بھی فرمایا ہے، جیسا کہ روایاتِ حدیث میں مصرّح ہے، پس جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُمت کے حق میں نبیٔ اُمت ہونے کی وجہ سے مربی ہیں، ویسے ہی نبیوں کے حق میں بوجہ نبی الانبیاء ہونے کے مربی ہیں، اب اگر جسم یا قد و قامت اور بدن کے ڈھانچے میں کوئی نجم ہدایت بڑا ہو یا چھوٹا تو اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مربیٔ عام ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑے گا، آخر عالمِ بشریت کے ابتدائی دور میں تمام انسان جن میں انبیائے کرام علیہم السلام بھی شامل ہیں، جسم و ضخامت اور قد و قامت میں مابعد کے زمانوں کے لحاظ سے یقیناً بڑے اور طویل و عریض ہوتے تھے، آدم علیہ السلام کا قد و قامت اپنے ہاتھ کی پیمائش سے سات ہاتھ لمبا اور سات ہاتھ چوڑا تھا، یہی حال نوح علیہ السلام اور حضرت ہود و صالح علیہما السلام کے قد و قامت کا تھا، سیر کی روایتوں میں ہے کہ اس دور کے بعض انبیاء کا جسم مبارک قبر کھلنے سے کھل گیا تو ان کی ناک کی پیمائش ایک گز نکلی۔ جیسے حسبِ تصریح اہلِ نجوم بہت سے ستارے حجم و ضخامت میں آفتاب سے بڑے ہیں، مگر فیضِ نور میں سب اس کے محتاج

ہیں، ایسے ہی اگر بہت سے انبیاء علیہم السلام قد و قامت میں یا اپنی کسی جزوی خصوصیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ہوں تو اس سے نورِ نبوّت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا استغنا یا ان کی بڑائی حضور پر ثابت نہیں ہوسکتی، اور جب یہ صورت ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان محض نبوّت ہی نہیں نکلتی بلکہ نبوّت بخش بھی نکلتی ہے کہ جو بھی نبوّت کی استعداد پایا ہوا فرد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آ گیا نبی ہوگیا، اور اس طرح نورِ نبوّت آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے چلا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی پر لوٹ کر ختم ہوگیا اور یہی شان خاتم کی ہوتی ہے کہ اسی سے اس کے وصفِ خاص کی ابتداء بھی ہوتی ہے اور اسی پر انتہاء بھی ہوجاتی ہے۔ اس لئے ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وصفِ نبوّت کے لحاظ سے صرف نبی ہی نہیں کہیں گے، بلکہ خاتم النبیّین کہیں گے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی پر تمام انوارِ نبوّت کی انتہاء ہے، جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم منتہائے نبوّت ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے نبوّت چلتی ہے اور آخرکار آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی پر عود کر آتی ہے۔ پس آفتاب کی تمثیل سے آفتابِ نبوّت، نبوّت کا مبدا بھی ثابت ہوتا ہے اور منتہا بھی، نبوّت میں اوّل بھی نکلتا ہے اور آخر بھی، فاتح بھی ثابت ہوتا ہے اور خاتم بھی، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوّت کی اوّلیت کا تو ان الفاظ میں اعلان فرمایا کہ:-

كنت نبيًّا وادم بين الروح والجسد.

ترجمہ:- میں نبی بن چکا تھا جبکہ آدم ابھی رُوح و جسد کے درمیان ہی میں تھے (یعنی ان کا خمیر ہی تیار کیا جارہا تھا اور ان کی تخلیق مکمل بھی نہیں ہوئی تھی)۔

اور ادھر اپنی نبوّت کی آخریت اور خاتمیّت کا اس عنوان سے اعلان فرمایا کہ نبوّت کو ایک قصر دِکھلا کر اس کی آخری اِینٹ اپنے کو ظاہر فرمایا، ارشاد ہے: "وأنا اللبنة وأنا خاتم النبيين"۔

آفتابِ نبوّت کا طلوع

اسی طرح سمجھ لیجئے کہ نبوّت ایک آسمان ہے، سب سے پہلے نور کا ستارہ حضرت آدم علیہ السلام کا چمکا اور اس نے آ کے نور پھیلایا، اس کے بعد نوح علیہ السلام کے نور کا ستارہ چمکا، پھر حضرت ہود علیہ السلام کا، پھر حضرت صالح علیہ السلام کا، اور "ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرًا" پھر پے بہ پے انبیاء علیہم السلام آنے شروع ہوئے، ابراہیم علیہ السلام آرہے ہیں، موسیٰ علیہ السلام آرہے ہیں، پھر موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہزاروں پیغمبر بنی اسرائیل میں آرہے ہیں، گویا آسمانِ نبوّت ستاروں سے بھر گیا مگر دُنیا میں چاندنا نہ ہوا، یعنی دن نہ نکلا، رہی رات کی رات۔ پھر فاران کی چوٹیوں سے صبحِ صادق کا طلوع ہوا اس نے خبر دی کہ آفتابِ نبوّت آنے والا ہے، ابھی آیا نہیں تھا، خبر آئی تھی کہ دُنیا میں چاندنا پھیلنا شروع ہوا، ستارے گل ہونا شروع ہوگئے اور آفتاب نے نکلتے ہی اعلان کیا کہ اب میں آچکا ہوں، اب کسی ستارے کی حاجت نہیں ہے، میرا نکلنا ہی کافی ہوگا، پوری دُنیا کے لئے اب میں کافی ہوں، نبوّت ختم ہوگئی یعنی مراتبِ نبوّت میری ذات پر منتہی ہوگئے، کامل ہوگئے، اس کو پھیلانے کی اب کوئی وجہ باقی نہیں، اب کسی کو نبی بنا کر نہیں لایا جائے گا، اب میری نبوّت غروبِ آفتاب تک کام کرے گی، یہاں تک کہ صبحِ قیامت کا طلوع ہوجائے اور یہ دن ختم ہوجائے۔ اس کے بعد اللہ کو اختیار ہے دُنیا بنائے یا نہ بنائے، یا سب کو جنت میں رکھے، مگر جب تک یہ دُنیا قائم ہے میں آفتاب ہوں، میرا نور کافی ہے، میرے بعد بڑے بڑے لوگ آئیں گے مگر میری نبوّت کا ہی نور ان کے راستے سے چمکے گا۔

انوارِ نبوی کے ظہور کی صورتیں

محدثین آئیں گے تو ان کے راستے سے میری نبوّت کا نور ظاہر ہوگا، فقہاء آئیں گے، ابوحنیفہؒ، مالکؒ، شافعیؒ ان کے اندر سے میرے انوار ظاہر ہوں گے، خود

ان کا کوئی نور نہیں ہوگا، صوفیائے کرام آئیں گے، جنیدؒ، شبلیؒ اور بایزید بسطامیؒ ان کی ذات کا کوئی نور نہیں ہوگا، میری ہی نبوّت کا نور چمکے گا، کسی طبقے سے میرے علم کا نور نمایاں ہوگا، کسی طبقے سے میرے اخلاق کا نور نمایاں ہوگا، کسی طبقے سے میرے زُہد و قناعت کا نور نمایاں ہوگا، سب میرے انوار کو ظاہر کریں گے اور ایک میری نبوّت قیامت تک کافی ہوگی، اس کے لئے آئینے آتے رہیں گے، اس میں سے وہ نور چھنتا رہے گا، چمکتا رہے گا، دُنیا کو روشنی ملتی رہے گی، نبوّت کی اس لئے ضرورت نہیں کہ نبوّت کے سارے درجات میرے اُوپر ختم ہوگئے۔ تو یہاں ختمِ نبوّت کا یہ معنی لینا کہ نبوّت کا دروازہ بند ہوگیا یہ دُنیا کو دھوکہ دینا ہے، نبوّت مکمل ہوگئی، وہی کام دے گی قیامت تک، نہ یہ کہ منقطع ہوگئی، دُنیا میں اندھیرا پھیل گیا، نہ علم رہا، نہ اخلاق رہے تو یہ معنی نہیں کیا، اس لئے دھوکے میں نہ پڑا جائے۔ ختمِ نبوّت کے معنی قطعِ نبوّت کے نہیں بلکہ کمالِ نبوّت اور تکمیلِ نبوّت کے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیّین ہیں، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر مراتبِ نبوّت ختم ہوگئے، اب جتنے بھی مجدّد آئیں گے، محدّث آئیں گے، ائمہ آئیں گے، صلحاء وشہداء آئیں گے، مجاہدین آئیں گے، سب کے اندر ایک ہی نور کام کرے گا، سب پیکر ہوں گے، ان پیکروں سے نور ظاہر ہوگا، ہوں گے وہ کمالاتِ نبوّت۔ تو گویا ''ایک ذات'' اللہ نے ایسی پیدا کی کہ اس کے انوار و برکات سے پچھلوں کو نبوّتیں ملتی چلی گئیں، اگلوں کو ولایتیں ملتی چلی گئیں، پہلے نبی بنتے گئے، بعد والے ولی بنتے چلے گئے تو ولایت بھی وہیں سے چلی، نبوّت بھی وہیں سے چلی تو اللہ کی طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک نقطۂ خیر ہیں کہ پچھلے انبیاء کی نبوّتیں درحقیقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت سے مستفیض ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت سے فائدہ اُٹھاتے رہے اور اگلے آنے والے لوگ ولی، مجدّد اور محدّث آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات سے بنتے گئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت میں درجہ کمال کیوں ہے؟

یہ کیسے؟ فلاسفہ کہتے ہیں کہ آفتاب کا ہی نور درحقیقت ستاروں میں کام کرتا ہے، چاند میں اپنا ذاتی نور نہیں ہے، ستاروں میں اپنا نور نہیں ہے، ان کا کمال یہ ہے کہ وہ اس ذات سے صیقل شدہ ہیں، آفتاب کا جہاں مقابلہ ہوا ان میں چمک پیدا ہوگئی تو درحقیقت اولیاء اللہ اور صحابہؓ آئینوں کی مانند تھے، وہ چمک لیتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کی۔ نبوّت آج بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی کام کر رہی ہے، کوئی اور نبوّت نہیں ہے، وہی نبوّت ہے جو چل رہی ہے، تو حاصل یہ نکلا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فقط نبی نہیں بلکہ خاتم النبیّین ہیں اور ختم نبوّت کے معنی کمالاتِ نبوّت کی انتہاء اور تکمیلِ نبوّت کے ہیں۔تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو لاکر نبوّت کے تمام مراتب ختم کردیئے گئے، اور نبوّت کی دو ہی بنیادیں ہیں، ایک کمالِ علم، ایک کمالِ اخلاق، تو علم بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اعلیٰ اور اخلاق بھی اعلیٰ۔علم تو وہ کہ جس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "اُوتیت علم الأوّلین والاٰخرین" اَگلوں اور پچھلوں کے تمام علوم مجھے عطا کردیئے گئے ہیں، میرے سینے میں بھر دیئے گئے ہیں۔ جس کو قرآنِ کریم نے فرمایا ہے: "وَعَلَّمَکَ مَا لَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ، وَکَانَ فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکَ عَظِیْمًا" اے نبی! ہم نے آپ کو ان چیزوں کی تعلیم دی جو آپ پہلے سے نہیں جانتے تھے اور آپ پر اللہ کا فضلِ عظیم ہے۔اور اخلاق کے بارے میں فرمایا: "وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ" آپ خُلُقِ عظیم کے اُوپر ہیں، جو انتہائی مرتبہ ہے اخلاق کا وہ آپ کو دیا گیا۔تو جب علم بھی انتہائی اور اخلاق بھی انتہائی بس پس میں ہی وہ (آخری) اینٹ ہوں اور میں ہی خاتم النبیّین ہوں۔

اور پھر نبوّت کی اس اَوّلیت وآخریت وخاتمیّت کے ان دو متضاد پہلوؤں کو ایک ذات میں جمع کرنے کی صورت یہ فرمائی:۔

أنا أوّلهم خلقا وآخرهم بعثًا.

ترجمہ:- میں خلقت کے لحاظ سے سب سے پہلا ہوں اور بعثت کے لحاظ سے سب پچھلا۔

قرآنِ حکیم نے اس حقیقت کی تصدیق کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خَاتَمَ النَّبِیِّنَ فرمایا، جس سے آپ کا منتہائے کمالاتِ نبوّت ہونا واضح ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مصدرِ نبوّت ہونے کی کھلی دلیل ہے، ارشادِ ربانی ہے:-

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَآ أَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّنَ.

ترجمہ:- محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں تھے، لیکن وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیّین تھے۔

جس سے واضح ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء علیہم السلام کے حق میں بمنزلہ اصل کے ہیں اور انبیاء علیہم السلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے بمنزلہ فرع کے ہیں کہ ان کا علم اور خُلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض سے ظہور پذیر ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ فیض رسانی اور سرچشمۂ کمالاتِ نبوّت ہونے کی امتیازی شان آغازِ بشریت سے شروع ہوئی تو انتہائے کائنات تک جا پہنچی۔

چنانچہ عہدِ الست میں جبکہ ساری نوعِ بشری سے سوال کیا گیا کہ: "اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ" کیا میں تمہارا رَبّ نہیں ہوں؟ تو سب ایک دُوسرے کا منہ تکنے لگے، سب سے پہلے جس نے "بَلٰى" کہہ کر اقرارِ رُبوبیت کیا وہ آنحضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذاتِ بابرکات تھی جن کی صدائے حق سن کر سب نے "بَلٰى" کی آوازیں لگائیں کہ کیوں نہیں بیشک آپ ہمارے رَبّ ہیں۔ جس سے واضح ہے کہ آغازِ بشریت کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی عالَمِ بشریت کے معلّمِ اوّل اور اس کی معرفتِ رُبوبیت کے مربی تھے۔ بالفاظِ دیگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی عملی رہنمائی سے

سارے اوّلین و آخرین کی ایمانی استعدادیں کھل سکیں اور بروئے کار آ گئیں، جن میں انبیاء علیہم السلام بھی شامل ہیں۔ پس یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی تربیت اور بہ عنوانِ مختصر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی شانِ قیادت و سیادت ہے، جو تعلیم و تربیت کے دائرے میں کھلی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ خاتمیّت کا پہلا ظہور ہوا، ورنہ اگر یہ محض نبوّت کا اثر ہوتا تو سارے انبیاء علیہم السلام اِک دَم "بَلیٰ" کے کلمہ سے بول اُٹھتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلمہ کا انتظار نہ کرتے، لیکن سب کا سکوت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نطق، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معلّمِ اوّل اور مربیِّ اوّل ہونے کی کھلی دلیل ہے جو محض نبوّت کا اثر نہیں بلکہ ختمِ نبوّت کا اثر ہے۔

یہ اثر پھر عہدِ الست تک ہی محدود نہیں، بلکہ عالمِ دُنیا، پھر عالمِ برزخ، پھر عالَمِ حشر و نشر اور پھر عالَمِ جنت تک خاتمیّت کی یہ شان مختلف پیرایوں میں نمایاں کی جاتی رہی، تاکہ تمام انبیائے کرام علیہم السلام پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت و سیادت کھل کھل کر انبیاء و اُمم کے سامنے آتی رہے، چنانچہ شبِ معراج میں جو خود بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امتیازی شان کا ایک عظیم الشان ظہور ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سارے انبیاء علیہم السلام سے آگے بڑھا کر اور امامِ صلوٰۃ بنا کر تمام جماعتِ انبیاء کو مقتدی بنایا گیا، تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا افضل الانبیاء اور منتہائے کمالاتِ نبوّت ہونا انبیاء علیہم السلام اور اُن کی اُمتوں پر کھل جائے، کیونکہ بنصِ قرآن عالَم کی تخلیق کی غرض و غایت عبادت ہے اور نماز افضل العبادات بلکہ جس سے عبد و معبود کے درمیان علاقہ قائم ہوتا ہے اور انسان کو حقیقی عبودیت نصیب ہوتی ہے، اس لئے جو ذاتِ اقدس نماز میں سب کی امام اور سب پر ممتاز ہوگی وہی مقصدِ تخلیق کو سب سے زیادہ پورا کرنے والی بھی ثابت ہوگی، جس کے یہ معنی ہوئے کہ کمالاتِ بشریت میں وہی سب سے فائق ہوگی جو نماز میں سب پر فائق اور سب سے زیادہ ممتاز ہوگی۔ اس لئے شبِ معراج میں نماز میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فوقیت دِکھلانے کے لئے آپ

صلی اللہ علیہ وسلم کو امام بنایا گیا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے منتہائے کمالاتِ نبوّت ہونے کی دلیل ہے اور ختمِ نبوّت کا حاصل ہے۔ نیز اسی لئے معراج میں آپ کو ساتوں آسمانوں سے گزار کر اور مستویٰ تک پہنچا کر نمایاں کیا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سارے انبیائے کرام اور ملائکۂ مقرّبین علیہم السلام کے مقامات سے گزر کر اس مقام تک جا پہنچے جہاں تک نہ کوئی نبیٔ مرسَل پہنچا، نہ فرشتۂ مقرَّب پہنچ سکا۔ پس حسّی طور پر تو یہ آسمانوں سے گزارنا تھا اور معنوی طور پر مقاماتِ انبیاء سے گزار کر اس انتہائی قرب کے مقام پر پہنچانا تھا جہاں تک کسی کی رسائی نہ تھی، کیونکہ انبیاء علیہم السلام جب ان آسمانوں میں اپنے اپنے مقامات پر ملتے گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے آگے گزرتے گئے تو اس سے مقاماتِ نبوّت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تقدّم اور فضل و امتیاز ثابت ہو جاتا ہے۔

پھر اسی لئے یومِ قیامت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مقامِ محمود پر پہنچایا جائے گا، جہاں تک کوئی نہ پہنچ سکے گا اور اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شفاعتِ کبریٰ کے مقام پر لایا جائے گا، جہاں تک آنے سے سب انبیاء علیہم السلام رُک جائیں گے اور اپنی کوئی زَلت ولغزش ظاہر کر کے اس مقام کی طرف بڑھنے سے عذر کریں گے، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان سب مقدسین پر فائق اور محتاج الیہ ہونے کی دلیل ہے، اور پھر اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وجہِ تخلیقِ کائنات بتایا گیا اور یہ ظاہر کر کے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر ساری کائنات کا یہ خیمہ کھڑا کیا گیا ہے، یہ بتلانا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی اس عالَمِ خلق کا پھل اور مقصودِ اصلی ہیں، جن کے لئے یہ کائناتِ عالَم کا عظیم الشان شجر بویا گیا تھا، اور ظاہر ہے کہ درخت میں پھل ہی مقصود اور اصل ہوتا ہے جس کے لئے درخت لگایا جاتا ہے، باقی ساری شاخیں اور پھول پتیاں اس کی تمہید ہوتی ہیں، جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساری کائنات کی نسبت مقصودِ اصلی ہونا ظاہر ہوتا ہے اور جبکہ پھل ہی میں وہ ساری قوتیں جمع ہوتی ہیں

جو درخت کے لمبے چوڑے پھیلاؤ میں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ یعنی ثمر جامع قوائے شجر ہوتا ہے تو اسی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جامعِ کمالاتِ بشر اور جامعِ کمالاتِ جمیع انبیاء ہونا بھی نمایاں ہوجاتا ہے، جو اس کائناتی درخت کے شگوفے اور گلِ سرسبز ہیں۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی کمالاتِ انبیاء کا اپنے کو جامع فرمایا، کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے کمالاتِ نبوّت کی بنیاد دو ہی چیزوں پر ہے، ایک کمالِ علمی، ایک کمالِ اخلاقی۔ سو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نسبت تمام انبیاء و اولیاء کے سارے علمی کمالات کا جامع ہونا تو ان الفاظ میں ارشاد فرمایا:-

اُوتیت علم الأوّلین والآخرین.

ترجمہ:- مجھے اَگلوں اور پچھلوں کے تمام علوم دیئے گئے (جن کا مظہرِ اَتم قرآنِ حکیم ہے)۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کمالاتِ اخلاق کی جامعیت اس سے واضح ہے کہ صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا:-

وکان خُلُقه القراٰن.

اور آپ کا خُلُق یہ قرآن ہی تو ہے۔ (رُوح المعانی)

کہ جو کچھ قرآن میں علم کی شکل میں ہے، وہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں اخلاق و ملکات کی شکل میں ہے اور جو قلبی مقامات اس میں رُسوم و دال کی شکل میں ہیں وہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں خُلق وعمل کے درجے میں ہیں۔

اور ظاہر ہے کہ جب قرآن جامعِ کتبِ سابقین ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کا مجموعہ ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق بھی جامع اخلاقِ سابقین ثابت ہوگئے، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم کمالاتِ اخلاق اور منتہائے کمالِ خلق ہونے کی واضح دلیل ہے۔ اس سے خود بخود واضح ہوجاتا ہے کہ جو ذاتِ بابرکات

نبوّت کی بنیادوں میں سب کی جامع اور سب پر فائق ہے وہی ان بنیادوں میں سب کی اصل بھی ہوسکتی ہے۔

چنانچہ اسی اصل ہونے کی بناء پر تمام انبیائے کرام علیہم السلام سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی و نصرت کرنے کا عہد و میثاق لیا گیا، جیسا کہ آیتِ قرآنی: "وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ" سے واضح ہے، اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی آیت کی روشنی میں انبیائے سابقین علیہم السلام کے تابع خاتم ہونے کی مثال یہ ارشاد فرمائی کہ:-

لو کان موسیٰ حیًا لما وسعه الا اتباعی

ترجمہ:- اگر آج موسیٰ بھی زندہ ہوں تو انہیں بھی میری اطاعت کے سوا چارہ کار نہیں ہے۔

اس کا حاصل اس کے سوا اور کیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جیسے اُولوالعزم اور صاحبِ شریعت پیغمبر بھی بصورت عدمِ موجودگی خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تو واجب الاطاعت ہیں، مگر بصورت موجودگیٔ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم مطاع ہونے کے بجائے مطیع کی حیثیت میں آجاتے ہیں، اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ ان کا عہدہ ماتحت خاتم ہو، کیونکہ ماتحت کے سارے اختیارات و اقتدارات درحقیقت مافوق اور اَفسرِ اعلیٰ ہی کے ہوتے ہیں، جو اس کے دیئے سے ماتحت میں آتے ہیں، اس لئے اصل کے موجود ہوتے ہوئے فرع کا حکم نہیں چلتا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ وزیراعظم تمام وزراء سے یوں کہے کہ میرے سامنے آپ لوگوں کا حکم نہیں چلے گا، صرف میری عدم موجودگی میں آپ لوگوں کی آمریت بحال رہ سکتی ہے۔ جس سے صاف نمایاں ہے کہ ماتحت کے اختیارات مافوق کے سامنے کالعدم ہوجاتے ہیں، خواہ عہدہ بدستور باقی بھی رہے۔ یہ ایک اُصول ہے جو اسی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر دائرے کے اصل وظل کا یہی حال ہے کہ اصل کے ہوتے ہوئے فرع کا اختیار نہیں چلتا۔ باپ سامنے آجائے

تو صاحبِ اولاد بیٹا اپنے کو باپ کہتے ہوئے بھی شرمائے گا، چہ جائیکہ اپنی اُبوّت کے حق کو جتائے اور استعمال کرے۔ کیونکہ پانی کہیں بھی ہو، واسطہ بلاواسطہ سمندر ہی کا فیض ہے، اس لئے یہ سارے بڑے بڑے دریا، سمندر کے سامنے پہنچ کر سمندر ہی کے بہاؤ کے ساتھ ہو لیتے ہیں، خود ان کی اپنی رفتار باقی نہیں رہتی۔ سورج سامنے ہو تو ستارے اپنے کو نورانی کہتے ہوئے بھی شرمائیں گے، ان کی اصل سامنے ہے اور اصل کے ہوتے ہوئے فرع اپنے وجود سے بھی شرمانے لگتی ہے، چہ جائیکہ وجود کی مدعی بنے۔ ٹھیک اسی طرح تمام ہدایت (انبیاء علیہم السلام) کا آفتابِ نبوّت کے آجانے پر اپنی اپنی نبوتوں کا حکم چلانے یا چلانے کا حکم دینے کی بجائے خاتمِ نبوّت ہی کے دھارے ہو لینا ایک قدرتی اور طبعی بات ہے نہ کہ اپنا حکم جاری کرنا۔ یہی حقیقت ہے جسے حدیثِ مذکورہ میں نمایاں کیا گیا ہے کہ اگر بالفرض کوئی سابقہ نبی خاتم النبیّین کا دور پا جائے تو اس پر اور اس کی اُمت پر خاتمِ نبوّت کا حکم چلے گا نہ کہ اس کا، اور وہ بھی خاتم پر جو درحقیقت خاتم کے اصلِ کمال ہونے اور تمام غیر خاتم انبیاء کے فروعِ کمال ہونے کی واضح دلیل ہے۔ پھر حدیثِ مذکورہ میں تو علیٰ سبیل الفرض ہی کو واقعہ کر کے دِکھلایا گیا ہے کہ دورۂ محمدی میں جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے اُتار کر زمین پر لائے جائیں گے تو وہ النبی الخاتم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے دِین کی پیروی کریں گے، بلکہ شاید اسی حقیقت کو دِکھلانے کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر زندہ اُٹھا کر دُنیا کے آخری دور میں آسمان سے زمین پر اُتارا جائے گا تاکہ وہ اپنی نبوّت کی ساری قوّتوں کے ساتھ اس فتنہ زاد دور میں شریعتِ محمدی کی تجدید بھی کریں گے اور اس کی اطاعت بھی کریں گے اور اس طرح دورۂ محمدی میں سابق نبی کی اطاعتِ محمدی محض عقیدہ ہی نہ رہے بلکہ عملی صورت بھی سامنے آجائے، بلکہ اس ایک واقعاتی مثال ہی سے عقیدے کے طور پر یہ بھی ثابت ہوجاتا ہے کہ یہ ایک ہی اسرائیلی پیغمبر کا واقعہ نہیں بلکہ سارے اسرائیلی انبیاء کی تابعیت کا عملی ثبوت ہے، کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام

خاتم الانبیاء بنی اسرائیل اور اسرائیلی نبوّت کی آخری کڑی ہیں، ظاہر ہے کہ کسی مسلسل زنجیر کی آخری کڑی کو اگر کسی جانب کھینچا جائے گا تو قدرتاً پوری زنجیر ادھر ہی کی جانب کھنچ جائے گی، اور جو آخر کا حکم ہوگا وہی پورے سلسلے کا حکم شمار ہوگا۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا جو اسرائیلی نبوتوں کی آخری کڑی ہیں، بعد از نزول تابع فرمانِ محمدی ہوکر آنا اس سارے سلسلے کے تابعِ فرمان ہونے کی دلیل نہ سمجھا جائے، بالخصوص جبکہ توراۃ کی تصریح کے مطابق (جس کو احادیث میں ذکر کیا گیا ہے) موسیٰ علیہ السلام کی یہ دُعا بھی تھی کہ اگر اُمتِ محمدیہ جیسی اُمتِ مرحومہ مجھے بطور اُمت کے نہیں دی جاسکتی کہ وہ اُمتِ اَحمد ہے، تو پھر مجھی کو اس اُمت میں شامل کرلیا جائے، تو ان کے سلسلے کے خاتم (حضرت مسیح علیہ السلام) کو اس اُمت مین بطور مجدّدِ اسلام اور بحیثیت ایک تابعِ شریعتِ محمدی لاکر موسیٰ علیہ السلام کی مقدس خواہش حضرت مسیح علیہ السلام کو داخلِ اُمت کرکے پوری کردی گئی۔ چونکہ جب وہ نبی ہوتے ہوئے اُمتِ محمدیہ کے فرد بن گئے جو اِسرائیلیت کا نچوڑ ہیں تو پوری اِسرائیلیت اَز موسیٰ تا عیسیٰ علیہما السلام بحیثیت ایک تابع اور پیروکار کے شاملِ اُمت ہوگئی، گویا اوّلین اسرائیلی پیغمبر (موسیٰ علیہ السلام) اور آخرین اسرائیلی نبی (حضرت مسیح علیہ السلام) کے اِتباعِ محمدی کو اپنی اپنی نوعیت سے ظاہر فرماکر سارے ہی اسرائیلی پیغمبروں کو (جو اپنے دور میں دُنیا کی سب سے افضل ترین نبوّت تھی، ان کے اوّل و آخر کے واسطے سے) آفتابِ نبوّت کا پیروکار ثابت کردیا گیا ہے۔ ساتھ ہی جن نبوتوں کے نتیجے میں اِسرائیلیت کا مقام پیدا ہوا، وہ بھی اِسرائیلیت کے مبادی کی حیثیت سے اس پیروکاری میں اس کی شریکِ حال مانی جائیں گی اور اس طرح سارے انبیاء علیہم السلام کے لئے یہی حکم نکل آتا ہے کہ ان کی نبوّتیں ختمِ نبوّت کے تابع اور ظل کی حیثیت رکھتی ہیں، جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نبی الانبیاء ہونا کھلے طور پر سامنے آجاتا ہے۔

اس سے یہ مسئلہ بھی صاف ہوجاتا ہے کہ دورۂ محمدی میں جو دُنیا کا آخری دورہ ہے، جبکہ نبیوں کو بھی اِتباعِ محمدی کے بغیر چارہ نہیں تو یہ اس کا کھلا اعلان ہے کہ ان کی اَقوام و اُمم کو بھی اس دور میں اِتباعِ خاتم کے بغیر چارہ کار نہیں، بلکہ نجات کا انحصار ہی دِینِ خاتم میں ہے:-

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ، وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ. (آل عمران:۸۵)

ترجمہ:- اور جو بھی (اسلام کے دور میں) سوائے اسلام کے کسی دُوسرے دِین کے پیچھے جائے گا تو وہ اس سے قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں گھاٹے والوں میں سے ہوگا۔

پس حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی اس متبوعیتِ عامہ اور نبوّت کے اصلی ہونے کو خاتم النبیّین کے عنوان سے نمایاں کیا گیا ہے۔

نورِ آفتاب سارے ستاروں کے نور کی اصل ہے

کیونکہ اس عنوان کے سوا کوئی دُوسرا جامع عنوان تھا ہی نہیں، جس سے آخرالانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے سرچشمۂ نبوّت ہونے کو نمایاں کیا جاتا، جیسے آفتابِ مادّی سارے ستاروں کے نور کی اصل ہونے کی وجہ سے خاتم الانوار ہے اور ہر ستارہ نور میں اسی کا پیرو اور متبع ہے، ایسے ہی آفتابِ رُوحانی (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذاتِ بابرکات تمام انبیاء کی نبوتوں کی اصل ہونے کی وجہ سے خاتم النبیّین ہے کہ ہر نجمِ ہدایت اور نبی نورِ نبوّت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مستفید اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع ہے۔

سرچشمۂ نور کا حجم میں بڑا ہونا ضروری نہیں

پھر جیسے آفتاب تمام ستاروں کے نور میں ان کا مربی ہے، خواہ کوئی ستارہ قد وقامت میں اس سے بڑا ہو یا چھوٹا، ایسے ہی آفتابِ نبوّت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم

تمام نجومِ ہدایت (انبیاء علیہم السلام) کے انوارِ نبوّت میں ان کے مربی اور فیض بخش ہیں، خواہ کسی نبی کا قد و قامت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑا ہو یا چھوٹا۔

نجومِ ہدایت کے مخصوص رنگ آفتابِ نبوّت ہی کا فیض ہیں

اور جیسا کہ تمام ستاروں کا نور آفتاب ہی کے فیض سے قائم ہے، گو ہر ستارے کے ظرف کی خاصیت الگ الگ ہے، جس سے ان ستاروں کے نور کا رنگ بھی الگ الگ ہے اور تاثیر بھی الگ الگ، مگر نور سب میں آفتاب ہی کا کام کرتا ہے، ایسے ہی تمام نجومِ ہدایت انبیاء علیہم السلام کا نورِ نبوّت بھی خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے فیض سے ہے، گو ان کی تعلیم اور تربیت کے رنگ الگ الگ اور اقوام میں آثارِ تربیت مختلف ہیں، مگر نور سب میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا کام کرتا رہا ہے کہ اس کے نور ڈالے بغیر انبیاء علیہم السلام کے پاک قلوب کے متفاوت انوار کا ظہور نہیں ہوسکتا تھا اور نہ علومِ نبوّت کی یہ نوع بہ نوع خاصیتیں ان ظروف سے گزر گزر کر کھل سکتی تھیں۔

آفتاب کے اصلی نور آجانے پر فروعی انوار کی حاجت نہیں رہتی

اور جیسا کہ طلوعِ آفتاب کے بعد ستاروں کے ظلّی اور فروعی نور کی کوئی حاجت باقی نہیں رہتی کہ بلاواسطہ نور آجانے کے بعد بالواسطہ نور کی قدرتاً کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی، ایسے خاتم النبیّین صلی اللہ علیہ وسلم کے آجانے کے بعد کسی بھی نجمِ ہدایت (پیغمبر) کے نور کی حاجت نہیں رہتی، جبکہ ان انوار کا اصل اُصول نور بلاواسطہ ختمِ نبوّت کے ذریعہ سامنے آجائے کہ اب تنہا سورج ہی کی روشنی سارے عالَم کے لئے کافی ہے۔

پس جیسے طلوعِ آفتاب کے بعد سب ستارے ماند ہوکر اسی کے نور میں گم ہوجاتے ہیں کہ ان کا نور باقی رہنے کے باوجود بھی مشخص ہوکر سامنے نہیں آسکتا، ایسے

خاتم النبیّین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اور انبیاء علیہم السلام کے انوار بھی نورِ خاتم میں گم ہوکر لاشئ ہوگئے، اور اب وہ متشخص ہوکر اپنی اپنی شریعتوں کی صورت میں سامنے نہیں رہ سکتے، اسی کے معنی نسخِ شرائع کے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت سابقہ شریعتوں کے لئے تو ناسخ ہوگی، مگر قصہ برعکس نہ ہوگا۔

آفتابِ نبوّت صرف خاتم النبیّین ہی نہیں آخر النبیّین بھی ہیں

اور جیسے آفتاب سب ستاروں کے طلوع کے بعد آخر میں طلوع کرتا ہے، تاکہ نورانیت کی ہر پچھلی کمی کو پورا کردے، ایسے ہی حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو آخرالانبیاء بھی بنایا گیا تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ بھی سب نبیوں کے آخر میں رہے، تاکہ آخری عدالت کا فیصلہ ہر ابتدائی عدالت کے فیصلوں کے لئے حرفِ آخر اور ان کے حق میں ناسخ ثابت ہوسکے۔

آفتابِ نبوّت ہی مصدرِ انوار ہے

اور جیسے آفتاب کے لئے محض نور ہی ہونا اصل کمال نہیں بلکہ مصدرِ نور اور اصلِ نور ہونا کمال ہے، ایسے ہی آفتابِ نبوّت، ذاتِ بابرکات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے محض نبی ہونا امتیازی کمال نہیں کہ یہ کمال سارے انبیاء علیہم السلام میں مشترک ہے، بلکہ مصدرِ نبوّت اور سرچشمۂ نبوّت ہونا کمال ہے، کہ یہ کمال اور انبیاء میں نہیں، اس لئے اس کے مخصوص آثار بھی اور انبیاء میں نہیں کہ وہ خاتم بھی نہیں۔

آفتابِ نبوّت اگلوں اور پچھلوں سب کے لئے مصدرِ فیض ہے

اور ظاہر ہے کہ جب انبیاء علیہم السلام کی نبوّتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت سے ماخوذ اور اس کی تربیت یافتہ ہیں تو ولایت و امامت بہ طریق اَولیٰ ختمِ نبوّت کا فیض ہوگی، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نبوتوں کا سرچشمہ بھی ہیں اور ولایتوں کا بھی، انبیائے سابقین ہوں یا اولیائے لاحقین، سب کو نور اس ایک آفتاب سے ملا ہوا ہے، فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ اگلوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ نور بصورتِ نبوّت

پہنچا اور پچھلوں کو بصورتِ ولایت۔ پس انبیائے اُمم بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے مستفید ہیں اور اولیائے اُمت بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے دریوزہ گر ہیں، نور سب میں ایک اسی آفتابِ نبوّت کا کارفرما ہے۔ البتہ یہ تفاوت ضرور ہے کہ اگر آئینہ سورج کے سامنے رکھا جائے تو وہ چمک اُٹھے گا، مگر اس کی یہ چمک دمک جب ہی تک قائم رہے گی جب تک آئینہ سورج کے سامنے حاضر ہے، لیکن اگر آئینہ منہ پھیر لے یا اس پر حجاب ڈال دیا جائے تو آئینے کی چمک دمک اسی وقت ختم ہوجائے گی، لیکن اگر آفتاب کی منوّر شعاعوں سے بیٹری بھرلی جائے جو سورج کی کرنوں کی روشنی اور گرمی دونوں جذب کرلے تو سورج اگر اوٹ میں بھی آجائے گا تب بھی بیٹری اپنا کام کرتی رہے گی، خواہ اس سے روشنی کا کام لیا جائے یا حرارت ڈالنے کی۔ پہلی مثال اولیائے اُمت کی ہے، اور دُوسری انبیاء علیہم السلام کی، پس انبیاء علیہم السلام کی نبوّت اپنے حدوث میں تو خاتم النبیّین صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع ہے، لیکن بقاء میں مستقل ہے۔ مگر اولیائے اُمت کی ولایت حدوث و بقاء دونوں میں آفتابِ نبوّت کی محتاج اور دریوزہ گر ہے۔ اس لئے انبیائے سابقین کی نبوتیں جہاں آفتاب کا ظلِ محض ہیں، وہیں ایک گونہ استقلال بھی رکھتی ہے، لیکن ولایتِ اولیاء حدوث و بقاء دونوں میں تابعِ محض ہے اور آفتابِ نبوّت سے ہٹ کر کسی درجے میں باقی نہیں رہ سکتی۔

اب خاتم النبیّین کے اس جامع فرائض و رہنمائی کے حاوی نقشے پر اس تمثیل کی روشنی میں غور کیجئے کہ اس نے عالَم میں طلوع ہوکر اس دُنیائے دنی کی خدمت کیا کی؟ اور کس طرح اس ظلماتی دُنیا کو نورانی سطح کے سب سے اُوپر کے حصے پر لے جاکر کھڑا کردیا جس سے ہر قوم اس کے نور کا اقتباس کرنے پر مجبور ہے اور اس نورانیت کے تدریجی مراتب چونکہ خاتم النبیّین صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہی سے شروع ہوجاتے ہیں، اس لئے سراجِ منیر کی اس بلیغ شبیہ میں ولادت و بعثت اور کارہائے بعثت کا نقشہ دیکھئے۔ (بحوالہ خطباتِ ختمِ نبوّت)

حضور ﷺ کے جبہ اقدس کا غلاف مبارک

دارالعلوم دیوبند کی عمارت میں یہ سعادت محفوظ ہے

قسطنطنیہ میں دولتِ عثمانیہ کے زمانے سے شاہی خزانے میں بعض آثارِ نبویہ مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار، جھنڈا اور جبہ مبارک محفوظ ہیں۔ یہ آثار دسویں صدی ہجری کے اوائل میں آخری عباسی خلیفہ المتوکل علی اللہ نے سلطان سلیم اوّل کو تفویضِ خلافت کے وقت سپرد کئے۔ سلاطینِ عثمانیہ ان آثارِ نبویہ کو بطور سندِ استحقاقِ خلافت اپنے پاس محفوظ رکھتے تھے، جبہ مبارک پر حفاظت کی غرض سے مہین کپڑے کا غلاف رکھ دیا جاتا ہے، جس میں سے جبہ مبارک صاف نظر آتا ہے۔ دولتِ عثمانیہ کے سفیر کا بیان ہے کہ زیارت کے وقت جبہ مبارک کی عظمت کا بڑا خیال رکھا جاتا ہے اور کوئی شخص خواہ وہ کسی درجے کا ہو یہ جرأت نہیں کرسکتا کہ خاص جبہ مبارک کو ہاتھ لگائے یا بوسہ دے۔ جو لوگ زیارت کرتے یا بوسہ دیتے ہیں ان کا عمل اسی باریک غلاف تک محدود رہتا ہے۔ عثمانی سلاطین کا سقوطِ خلافت تک یہ معمول تھا کہ وہ اعیان و ارکانِ دولت کے ساتھ سال بھر میں ایک مرتبہ ۱۵ رمضان المبارک کو آثارِ نبویہ کی زیارت کیا کرتے تھے، جبہ مبارک پر جو غلاف رکھا جاتا تھا وہ کبھی کبھی خاص خاص لوگوں کو سلطان المعظم کی طرف سے ہدیہ کردیا جاتا تھا۔ یہ غلاف اس وجہ سے کہ جبہ مبارک کو مس کئے ہوئے رہا ہے جس قدر متبرک اور موجبِ خیر و برکت ہے، وہ ظاہر ہے۔ اب یہ جبہ مبارک استنبول کے ایک شاہی قصر ''طوب قاپی'' میں رکھا ہوا ہے، اس قصر میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدّد یادگاریں محفوظ ہیں۔ اس قصر کو سلطان محمد فاتح

نے ۸۶۳ھ مطابق ۱۴۵۸ء میں تعمیر کرایا تھا، ایک عرصے تک یہ محل ترک سلاطین کا قصرِ خلافت رہا، بعد میں اسے میوزیم کی شکل دے دی گئی۔ ''طوب قاپی'' (Top Kapi) ترکی زبان کا لفظ ہے، اس کا معنی ہے ''توپ کا دروازہ''۔

طوب قاپی کے میوزیم میں کئی ہال ہیں، ایک ہال میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دو تلواریں چاندی کے ایک صندوق میں رکھی ہوئی ہیں، یہیں سونے کے دو صندوق ہیں، ایک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا موئے مبارک اور مہر ہے جو عقیق کو تراش کر بنائی گئی ہے، مہر گلابی رنگ کے عقیق کی ہے اور بیضوی شکل کی ہے اور دُوسرے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک جھنڈا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جبہ مبارک اور مکتوب گرامی سونے کے فریم میں لگا ہوا ہے، یہ وہ نامہ مبارک ہے جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مصر کے حاکم مقوقس کے نام ارسال فرمایا تھا، یہ نامہ مبارک آثارِ قدیمہ کے ایک فرانسیسی ماہر بارتھل می (Borthalmy) کو مصر میں ۱۲۵۰ء میں دستیاب ہوا تھا، فرانسیسی عالم نے اس مکتوبِ گرامی کو سلطان عبدالمجید خان (۱۲۵۵ھ - ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۴۹ء - ۱۸۷۱ء) کی خدمت میں پیش کیا، سلطان معظم نے اسے طلائی صندوق میں محفوظ کرا کے طوب قاپی میں رکھوا دیا تھا۔ طوب قاپی کے اس حصے میں جہاں یہ تبرکات رکھے ہوئے ہیں، دروازے پر چار زبانوں ترکی، جرمنی، انگریزی اور فرانسیسی میں مندرجہ ذیل عبارت لکھی ہوئی ہے:-

> گزشتہ سینکڑوں برسوں سے مسلمانوں کے نزدیک اس مقام کی مذہبی اہمیت اور بڑی قدر ہے، اس میں جتنے بھی آثار رکھے ہوئے ہیں سب مقدس اور قابلِ احترام ہیں۔ آپ سے اُمید ہے کہ آپ اس مقدس جگہ پر خاموشی، متانت اور سنجیدگی کو ملحوظ رکھیں گے اور اس بابرکت جگہ پر کوئی نامناسب بات نہ کریں گے۔

دارالعلوم دیوبند نے جنگِ بلقان کے زمانے میں ترک مجروحین و مہاجرین

کی انجمن ہلالِ احمر کے ذریعہ ہندوستان میں قابلِ قدر خدمات انجام دی تھیں، ان سے سلطان محمد پنجم (۱۳۲۴ھ تا ۱۳۳۶ھ مطابق ۱۹۰۸ء تا ۱۹۱۸ء) بہت متأثر ہوئے، چنانچہ سلطان المعظم نے اپنے اس تأثر کا اظہار اس طرح فرمایا کہ دولتِ عثمانیہ کا سب سے بڑا متبرک ہدیہ یعنی جبہ مبارک کا غلاف دارالعلوم کو عطا فرمایا۔ خالد خلیل بک دولتِ عثمانیہ کے سفیر مقیم بمبئی ۱۶؍ربیع الاوّل ۱۳۳۲ھ کو دیوبند تشریف لائے اور سلطان المعظم کی طرف سے یہ متبرک ہدیہ پیش کیا۔

یہ ہدیہ خیر و برکت دارالعلوم کے موجودہ کتب خانے کی عمارت میں خلیل بک نے میرے والد ماجدؒ کے سامنے بہت ادب کے ساتھ پیش کیا، یہ احقر بھی وہیں موجود تھا، اس وقت کلکتہ کے ایک بڑے تاجر حاجی محمد یعقوب صاحب بھی سفیرِ ترکی کے ساتھ معائنہ دارالعلوم میں موجود تھے، انہوں نے والد ماجدؒ سے فرمایا کہ اس مقدس ہدیہ کے لئے ایک قیمتی بکس بنوا کر بھیجنے کی مجھے اجازت مرحمت فرمائی جائے، جو بہت خوشی سے دے دی گئی۔ چنانچہ اسی بکس میں جس کا ڈھکن بلوری شیشے کا ہے ہدیہ مبارک رکھا ہوا ہے اور وقتاً فوقتاً اہم مواقع پر اس کی زیارت کرائی جاتی ہے۔

یہ غلاف رُومال کی شکل میں ہے، کپڑا سفید، نہایت مہین اور خوش وضع ہے، اور وسط میں جلی قلم سے سیاہ حروف میں یہ شعر لکھا ہوا ہے:

نُوْرُ الْھُدٰی نِلْنَا بِہٖ تَکْرِیْمًا

صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا

اور کناروں پر ترکی زبان کے شعر لکھے ہوئے ہیں۔

یہ ذخیرۂ خیر و برکت دارالعلوم کے خزانے میں ایک نہایت خوبصورت چوبی بکس میں رکھا ہوا ہے اور جس روز سے دارالعلوم میں آیا ہے اکثر و بیشتر اس کی برکات کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے۔

(بحوالہ ''علمائے دیوبند عہد ساز شخصیات'' مرتبہ مولانا مجاہد الحسینی ص:۴،۵)

قاسمی اور قدوسی خاندان

مولانا قاری محمد طیب قاسمی کے مکتوب کی روشنی میں!

دارالعلوم دیوبند کے مہتمم مولانا قاری محمد طیب صاحب نے یہ مکتوب مولانا پروفیسر انوارالحسن شیرکوٹی کے نام تحریر کیا تھا جس میں انہوں نے قاری صاحب سے کچھ معلومات دریافت کی تھیں۔

سلامِ مسنون، نیازِ مقرون، مزاجِ گرامی!

گرامی نامہ ۳؍رجب کا لکھا ہوا اَواخرِ رجب میں پہنچ گیا تھا، لیکن یہی زمانہ میرے ایک طویل سفر کا تھا، واپسی شعبان میں ہوئی تو مجلسِ شوریٰ کا ہنگامہ خیز اجلاس آگیا، اجلاس سے ۲۶؍شعبان کو فراغت ہوئی اور پھر ایک سفر پیش آگیا، اور پھر ماہِ مبارک کے مشاغل شروع ہوگئے، غرض تأخیرِ جواب کی یہ وجوہ پیش آئیں، زحمتِ انتظار کی معافی چاہتا ہوں، وجوہ ساری غیر اختیاری تھیں۔

''یادگارِ قاسم'' کی طباعت کے مژدہ سے رُوح تازہ ہے، خدا کرے کہ جلد ہی نورافزائے بصر و بصیرت بنے، اب سوالات کا نمبروار جواب عرض ہے۔

۱- میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دو شادیاں ہوئیں، ایک شادی حضرت نانوتویؒ کی حیات میں ہوئی، وہ دیوان محمد یاسین صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی جن کا نام سکینت تھا، ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی، اس لااولادی کو دیکھ کر متوسلانِ قاسمی بالخصوص حضرت شیخ الہندؒ کے دِلوں میں یہ تڑپ پیدا ہوئی کہ قاسمی نسل

چلے، تو دیوبند میں جناب حافظ عبدالکریم صاحب کی صاحبزادی (میری والدہ ماجدہ) سے پیام دیا گیا، میری والدہ کا نام اَمۃ الرحیم تھا، حافظ عبدالکریم صاحب فارسی کے اچھے ماہر اور اُردو کے شاعر تھے، فروغؔ تخلص تھا، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے بیعت تھے، ان کی ایک مثنوی بنام ''مثنوی فروغ'' طبع شدہ ہے، میرے پاس بھی تھی، عرصے سے نظر نہیں پڑی، یا تو کتابوں میں رلی ہوئی ہے یا کوئی لے گیا ہے۔ میرے والد صاحب کے اولاد انہی دُوسری بیوی سے ہوئی ہے، مجھ سے پہلے میرے دو بھائی پیدا ہوئے جو خورد سالی میں انتقال کر گئے، ان کے بعد میری پیدائش ۱۳۱۵ھ میں ہوئی، میرے بعد ایک لڑکی ہوئی فاطمہ نام تھا، وہ خورد سالی میں گزر گئی، اس کے بعد مولوی طاہر مرحوم پیدا ہوئے اور ان کے بعد طیبہ مرحومہ۔

۲- مولانا فخرالحسن صاحب گنگوہیؒ خاندانِ قدوسیہ سے تعلق رکھتے تھے، حضرت قطبِ عالَم شیخ عبدالقدوسؒ کی اولاد میں سے تھے، جہاں تک میرا علم ہے اور شاہ عزیزحسن صاحب گنگوہی سے تحقیق بھی کی انہوں نے تدریس کا سلسلہ مستقلاً کہیں اختیار نہیں کیا، یوں ممکن ہے کہ عارضی طور پر کہیں کسی کو کچھ پڑھا دیا ہو، ان کے انتقال پر ۵۷ سال گزر چکے ہیں، جیسا کہ حاجی عزیزحسن صاحب گنگوہی سے معلوم ہوا، تاریخِ انتقال معلوم نہیں ہوسکی۔

۳- مولانا عبدالعلی صاحبؒ کا سنِ وفات معلوم نہیں ہوسکا، اتنا محفوظ ہے کہ دو تین سال کے اندر اندر حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ، حضرت مولانا مفتی عزیزالرحمٰن صاحبؒ، میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا عبدالعلیؒ کی وفاتیں ہوئی ہیں۔ میرے والد صاحب کی وفات ۱۳۴۷ھ میں ہوئی، اس لئے ان بزرگوں کی وفاتیں کسی کی اس سے ایک سال قبل، کسی کی ایک سال بعد ہے، اس سے زیادہ کچھ پتہ نہیں چلا۔ مولانا عبدالعلی صاحبؒ کا انتقال بہرحال میرے والد صاحب سے پہلے ہوا ہے، تو اندازہ ہے کہ سنِ وفات ۲۴-۲۵ھ ہوگا۔ تبرکاتِ اکابر کے سلسلے میں رائے

بالکل صحیح ہے، ذاتی طور پر میرے پاس اپنے اکابر کے بعض تبرکات ہیں (از قسم پارچہ) وہ محفوظ ہیں۔ دارالعلوم میں حضرت نانوتویؒ کے تحریر فرمودہ اُصول ہشت گانہ حضرتؒ کے قلم کے لکھے ہوئے محفوظ ہیں، اور چیزیں اس سے زائد میسر نہیں ہوئیں، کہیں سے ملیں تو یقیناً ان کی حفاظت کی جائے گی۔

۴- ''قاسم العلوم'' نادر ہو چکا ہے، لیکن آپ کے ارشاد پر میں اپنا ذاتی نسخہ بھیج رہا ہوں، آپ کام لے کر اسے واپس فرمادیں۔

۵- آپ کے کارڈ پر حضرت نانوتویؒ کی تصانیف کی تعداد ۲۳ دی گئی ہے، لیکن حضرتؒ کی تصانیف کی مجموعی تعداد ۵۷ ہے، اس کی فہرست اِرسال ہے۔ ''قاسم العلوم'' کا ہر مکتوب ایک مستقل رسالہ ہے جو خاص موضوع پر مشتمل ہے، اس موضوع کے مناسب اس رسالے کا نام تجویز کر دیا گیا ہے، جیسا کہ حضرتؒ کی تمام تصانیف تقریباً خطوط ہی ہیں، نام بعد کے لوگوں نے حسبِ موضوع تجویز کر دیئے ہیں۔ اسی طرح ان غیر طبع شدہ مکتوبات کے سلسلے میں بھی ہر مکتوب کا نام الگ الگ تجویز شدہ ہے، جو اس کے موضوع کے حسبِ حال ہے، جیسا کہ اس منسلکہ فہرستِ تصانیف سے واضح ہو جائے گا۔

میری ایک ذہنی بات یہ ہے کہ حضرتؒ کی تمام تصانیف کا جنسی اور عمومی نام ''قاسم العلوم'' رکھا جائے، اس کے تین سلسلے ہوں، پہلا سلسلہ ان تصانیف کا جو مطبوعہ اور عموماً متداول ہیں، جیسے آپ نے بھی ان کے اسماء لکھے ہیں۔ دُوسرا سلسلہ ''قاسم العلوم'' کے رسائل کا ہو یعنی یہ مکاتیب جو ''قاسم العلوم'' کے نام سے چار جلدوں میں شائع ہوئے ہیں اور بہرشتہ ارسال ہیں۔ اور تیسرا سلسلہ ''قاسم العلوم'' یہ مکاتیب ہوں (جو بجائے خود مستقل رسائل) اور غیر مطبوعہ ہی نہیں بلکہ مفقود ہیں، اس طرح ساری تصانیف ''قاسم العلوم'' کے تحت آ جائیں گی، بہرحال حضرتؒ کی تصنیفات کی فہرست ارسال ہے۔

تصانیف مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ

بانیٔ دارالعلوم دیوبند، یوپی، انڈیا

نمبر	نام کتاب	نام علم	نمبر	نام کتاب	نام علم
۱	اسرارِ قرآنی	تفسیر	۲۴	اجوبہ اربعین	
۲	مصابیح التراویح	تفسیر	۲۵	گفتگوئے مذہبی	واقعہ میلہ خداشناسی
۳	الدلیل المحکم	تفسیر	۲۶	الخط المقسوم من قاسم العلوم	فلسفہ
۴	تحفہ لحمیہ	تفسیر	۲۷	رسائل مشمولات قاسم العلوم (جلد۴)	
۵	توثیق الکلام	تفسیر	۲۸	قصائد قاسمیہ	ادب
۶	الحق الصریح	تفسیر	۲۹	میراث فدک (جلد۱)	حدیث
۷	حجۃ الاسلام	اسرارِ دین	۳۰	حدیث العلماء (جلد۱)	حدیث
۸	تقریر دِل پذیر	اسرارِ دین	۳۱	مااہل بہ لغیر اللہ (جلد۲)	حدیث
۹	قبلہ نما	کلام	۳۲	عصمتِ انبیاء (جلد۲)	کلام
۱۰	آبِ حیات	کلام	۳۳	حدیث المکاتب (جلد۲)	فقہ
۱۱	تصفیۃ العقائد	کلام	۳۴	حجیتِ معجزہ (جلد۳)	کلام
۱۲	تحذیر الناس	کلام	۳۵	سودمند (جلد۳)	فقہ
۱۳	لطائفِ قاسمیہ	تصوّف	۳۶	شہادتِ حسین (جلد۴)	تاریخ
۱۴	فیوضِ قاسمیہ	تصوّف	۳۷	اختلاف الامہ (جلد۴)	کلام
۱۵	مکتوباتِ قاسمیہ	تصوّف	۳۸	معرفت الامام (جلد۴)	کلام
۱۶	جمالِ قاسمی	تصوّف	۳۹	حکم روافض وخوارج	
۱۷	تحقیق السماع والغناء	تصوّف	۴۰	ردالاکابر ارفع المکابر، کیفیت مباحثہ حامد حسن شمسی	
۱۸	انتباہ المؤمنین	مناظرہ (ردّ شیعہ)	۴۱	ردّ الشیعہ نمبر۱	
۱۹	ہدیۃ الشیعہ	مناظرہ	۴۲	ردّ الشیعہ نمبر۲	
۲۰	مباحثہ شاہجہان پور	مناظرہ (ردِ عیسائیت)	۴۳	وراثت انبیاء	
۲۱	جواب ترکی بترکی	مناظرہ (ردِ آریہ)	۴۴	وجوبِ جمعہ	
۲۲	انتصار الاسلام	مناظرہ (ردِ آریہ)	۴۵	تصورِ شیخ نمبر۱	
۲۳	مناظرہ عجیبہ	تتمہ تحذیر الناس	۴۶	کنہ بعض مسائل باختصار	

نمبر	نام کتاب	نام علم
٤٧	ایمان وکفرِ یزید	
٤٨	نذرِ بتاں	
٤٩	حکمۃ الجبر والسر فی الصلوٰۃ	
٥٠	معنی سنت و بدعت	
٥١	الغیب للہ	
٥٢	تصوّرِ شیخ نمبر٣	
٥٣	صفاتِ نفس	
٥٤	تنبیہ متعلق مسئلہ تقدیر	
٥٥	مسئلہ ضاد وظاء ومعنی تقلید	
٥٦	اثبات بست رکعت تراویح	
٥٧	معراج اور دیدارِ الٰہی (عروج معراج)	
٥٨	امکان نظیر	
٥٩	الدفاع عن تحذیر الناس	
٦٠	تفسیر	
٦١	فضل العالم علی العابد	

نمبر	نام کتاب	نام علم
٦٢	جواب بعض شبہات پادریان (حصہ اوّل)	
٦٣	جواب بعض شبہات پادریان (حصہ دوم)	
٦٤	احوال مباحثہ روڑکی	
٦٥	تفسیر آیۃ وانا اوّل المسلمین	
٦٦	تحقیق صفۃ وموصوف	
٦٧	وحدۃ الوجود	
٦٨	سماع موتیٰ	
٦٩	خلاصہ وحدۃ الوجود	
٧٠	تلقین معمولات و وظائف	
٧١	الارشاد علی الاسترشاد	
٧٢	ایورد المورود (تعلیم وظائف)	
٧٣	مسئلہ طلاق وتعلیم وظائف	
٧٤	لطائفِ ستہ	
٧٥	تعبیرِ خواب	

مکتوباتِ قاسمیہ:- یہ ضخیم مجموعہ ٣٧ مکتوبات پر مشتمل ہے، یہ مکتوبات طبع نہیں ہوئے اور افسوس کہ ان کا کچھ پتہ بھی نہیں چلا، صرف ایک مطبوعہ اشتہار سے جو نومبر ١٨٩٠ء مطابق جمادی الاولیٰ ١٣١٣ھ کو منجانب قاضی محمد عبدالہادی بن قاضی عبدالباری مطبع مجتبائی سے شائع ہوا ان مکتوبات اور ان کے مشتملات کا کچھ پتہ چلا ہے، اشتہار کے سرنامہ پر جلی حروف میں عنوان یہ دیا گیا ہے:

''اعلان بطبع مکتوبات افضل علماء الاعلام''

اور نیچے کی عبارت میں وعدہ کیا گیا ہے کہ اگر دو سو خریداروں کی درخواستیں موصول ہوجائیں گی تو یہ مکتوبات شائع کردیئے جائیں گے۔ آگے بعنوان ''مکتوباتِ طیبات''

ان مکتوبات کی فہرست درج ہے اور مکتوب کا موضوعِ بحث مختصر الفاظ میں تعین کر کے لکھا گیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرتِ والاؒ کے مطبوعہ مکاتیب کی طرح اس مجموعے کا ہر مکتوب بھی ایک مستقل رسالہ اور مختلف علوم و معارف کا خزانہ ہے۔ احقر نے اشتہار کے متعین کردہ موضوع اور مضمون کا مرقومہ خلاصہ سامنے رکھ کر ہر مکتوب کا ایک نام یا مختصر عنوان متعین کردیا ہے کہ اگر ان مکاتیب کے علوم سامنے نہ آئے تو کم از کم عنوانِ مکتوب ہی سامنے آجائے، گو وہ اور زیادہ حسرت و تأسف کا باعث ہوگا، جبکہ عنوان دے کر اصل مضمون کی تو پیاس بھڑک اُٹھے گی اور آبِ حیات تک پہنچنے کی کوئی صورت ہوگی نہیں، تاہم تاریخی حیثیت سے حضرتِ والاؒ کے علمی افادات کا ایک باب ضرور سامنے آجائے گا، اس طرح حضرتِ والاؒ کے رسائل کی تعداد ۵۷ ہوجاتی ہے۔

قصبۂ دیوبند کی تاریخ

قدیم تاریخ کے روزن سے جھانک کر دیکھئے تو یہ بہت پرانی اور قدیم الایام بستی ہے، اڑھائی تین ہزار سال تک اس کی آبادی کا پتہ چلتا ہے، اس زمانے میں ہندوؤں کا ایک اہم مذہبی تیرتھ تھا جو ''دیوکنڈ'' کے نام سے معروف تھا، اس بستی کا قدیم نام ''دیوی بند'' تھا، جو کثرتِ استعمال سے ''دیوبند'' کے نام پر مشہور ہوگیا۔

آج اس بستی میں مسلمانوں کی تعداد ہزاروں ہے، شاہی زمانے کی یادگار مساجد آج بھی اس شہر میں دِکھائی دیتی ہیں، شہر کی جامع مسجد سو سال اور ایک روایت کے مطابق آٹھ سو سال پُرانی ہے، جس کے کتبے پر بہول شاہ کا نام ثبت ہے۔

یہ بستی دہلی سے بانوے میل شمال جانب سے صوبہ یوپی میں واقع ہے، شیر شاہی شاہراہ جو پشاور سے کلکتہ تک چلی گئی ہے، اس بستی سے ہوکر گزرتی ہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں شکست کھانے کے بعد مسلمانانِ ہندوستان

نے اپنی فلاح کے لئے اور مذہبی رسم و رواج کی گرتی دیواروں کے بچاؤ کے لئے جس پر برطانوی پرچم کے سائے پھیل رہے تھے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے محسوس کیا کہ فرنگی اقتدار کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ مسلمانانِ ہند کو اسلام سے آشنا کیا جائے، تاکہ وہ غیرملکی اقتدار کے فریب سے محفوظ رہ سکیں۔ چنانچہ ۱۵رمحرّم الحرام ۱۲۸۳ھ بروز پنجشنبہ (جمعرات) مطابق ۳۰رمئی ۱۸۶۶ء کو قصبہ دیوبند کی ویران سی مسجد (چھتہ) میں ایک دِینی مدرسہ قائم کیا اور اس مسجد میں اَنار کے درخت کے سائے میں درس و تدریس کا آغاز ہوا، اس مدرسہ کے اوّل طالبِ علم محمود حسن تھے جو آگے چل کر ''شیخ الہند'' کے نام سے معروف ہوئے، وہ آخر میں مدرسہ دیوبند کے اوّل مدرّس بھی مقرّر ہوئے، ان کا انتقال ۱۹۲۰ء میں ہوا اور یہیں انہیں دفن کیا گیا۔

(بحوالہ کتاب ''علمائے دیوبند عہد ساز شخصیات'' ص:۱۷ تا ص:۲۱)

کتاب ''مذہب منصور'' میں
حضرت نانوتویؒ کا تذکرہ
ایک تاریخی مقالے میں معلومات افزا مندرجات

مقالے کے تعارفی کلمات میں مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے لکھا ہے کہ: ''مذہب منصور'' کے حصہ دوم کا مقالہ جسے صاحبِ ''مذہب منصور'' حضرت مولانا منصور علی خان تلمیذِ خاص حضرت نانوتویؒ نے قلم بند فرما کر اپنی کتاب مذہب منصور کا جزو بنایا، یہ کتاب فنِ طب میں ہے اور یہ حصہ حضرت نانوتویؒ کی سوانح سے متعلق ہے۔ (محمد طیب)

ہندوستان میں اکثر مقامات پر مدارسِ دینی جناب مولانا محمد قاسم صاحب کی رائے اور مشورہ سے جاری ہیں، خصوصاً مدرسہ دیوبند میں اکثر طلبہ علمِ دین کی تحصیل کر کے اشاعتِ اسلام میں سعی کیا کرتے ہیں۔ اوّل مولانا مرحوم نے اس مدرسہ کو چندہ سے قائم کیا تھا اور اب بھی بفضلہٖ تعالیٰ خوب ترقی کر رہا ہے۔ مولانا مرحوم کے رگ و ریشے میں علم وتقویٰ سرایت کر گیا تھا، بلکہ ان کا ذہن بھی علم کے رگ و ریشے میں ساری تھا۔ تمام اَحکامِ شرعی کو معقولات کر دیا، ان کا مقولہ تھا کہ تمام اَحکامِ الٰہی و رسالت پناہی عقلی ہیں مگر ہر عقل کو وہاں تک رسائی نہیں، اور فی الواقع وہ جب کسی مسئلے کو دلائلِ عقلی سے ثابت کرتے تھے تو اہلِ علم بھی حیران رہ جاتے تھے۔ ظاہر میں کوئی حکم اگرچہ خلافِ قیاس معلوم ہوتا تو مولانا کی تقریر سے بالکل عقل کے مطابق

معلوم ہوتا تھا۔ اُصولِ فلسفہ کو جو شرع شریف کے خلاف ہیں جب دلائلِ عقلیہ سے رَدّ کرنا شروع کرتے تھے تو ایسا یقین ہوتا تھا کہ ارسطو و افلاطون ان کے مقابلے میں طفلِ مکتب تھے۔ بارہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہوگئے تھے، ریاضت کر کے سلوک کو طے کیا تھا، لیکن علم ان کا خداداد وہبی تھا۔ مشکلاتِ تصوّف کو ایسا حل کرتے تھے کہ سننے والے کا جی چاہتا تھا کہ صوفی بن جاوے۔ اَحکامِ شرعیہ میں اگر کوئی شخص اعتراض کرتا تو ایسی معقول تقریر فرماتے کہ معترضین کو اطمینان نصیب ہوجاتا تھا۔ فرمایا کرتے تھے کہ مجھ کو اعتراض کا جواب دینے میں تأمل نہیں ہوتا، بلکہ جواب میں اس قدر دلائلِ عقلی پیش نظر آتے ہیں کہ ان کو انتخاب کرنے میں ذرا تأمل کرنا پڑتا ہے۔ اور جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ بیتؓ اور صحابہ کرامؓ سے اس قدر محبت اور اعتقاد رکھتے تھے کہ مدعیوں میں اس قدر نہیں پایا جاتا بلکہ جملہ سادات کی نہایت تعظیم و توقیر کیا کرتے تھے۔ نانوتہ ضلع سہارنپور انہی کی وجہ سے مشہور ہوگیا، ان کے مورثِ اعلیٰ مولوی محمد ہاشم صاحب مرحوم حضرت محمد بن ابوبکرؓ کی اولاد میں سے تھے، دہلی میں جناب مولوی مملوک علی صاحب سے جو ان کے ہم جد تھے، تحصیلِ علم کئے تھے۔ ۱۲۹۷ھ کی جمادی الثانی میں بمقام دیوبند انتقال فرمایا۔ تاریخی نام خورشید حسین تھا۔ ۱۲۹۴ھ میں اخیر حج اپنے والد ماجد کی طرف سے کیا تھا، میں بھی مولانا صاحب کے ہمراہ علی گڑھ سے بیت اللہ شریف گیا تھا، جدہ میں پہنچ کر چند روز قیام کرنا پڑا، سواری نہیں ملی، اس وقت یہ شعر زبان فیض ترجمان پر جاری تھا ؎

مانگا کریں گے ہم بھی دُعا ہجرِ یار کی!
آخر تو ضد ہوئی ہے اثر کو دُعا کے ساتھ

حرمِ مکہ کا ادب و احترام

مکہ شریف جب قریب آیا، غسل فرمایا اور قریب صبحِ صادق کے وہاں داخل

ہوئے، جناب حاجی امداداللہ مہاجرِ مکی بطور استقبال تشریف لائے تھے، انہوں نے اپنے مکان میں جو دو منزلہ تھا، ٹھہرایا، دروازے کے اُوپر کے مکان پر مولانا صاحب اور مولانا رشید احمد گنگوہی نے قیام کیا، مکان بہت وسیع تھا، سب ہمراہی اس میں جا بجا ٹھہر گئے۔ جب حضرت حاجی صاحب تشریف لاتے، دونوں بزرگ کھڑے ہوکر تعظیم دیا کرتے تھے اور نہایت مؤدّب دو زانو ہوکر ان کے رُوبرو بیٹھ جایا کرتے۔ دونوں صاحبان میں کبھی کبھی خوش طبعی اور مذاق ہوا کرتا تھا، اتفاق سے مولانا صاحب اس درجہ میں موجود نہ تھے، صرف میں مولانا رشید احمد صاحب کے پاس بیٹھا تھا اور ان کا رُخ دیوار کی جانب تھا، اس کمرے کے دروازے پر کسی کے آنے کی آہٹ معلوم ہوئی اور نیچے دروازے پر فقیروں نے ڈھول بجاکر سوال کرنا شروع کیا، مولانا رشید احمد صاحب سمجھے کہ مولانا مرحوم تشریف لائے ہیں، خوش طبعی سے فرمایا کہ اپنے یاروں کو بھی ہمراہ لائے ہیں۔ حضرت حاجی صاحب نے فرمایا کہ سائل ہیں، مولانا رشید احمد صاحب تعظیم کے واسطے کھڑے ہوگئے اور حضرت حاجی صاحب کے رُوبرو مؤدّب بیٹھ گئے۔ میں نے یہ واقعہ مولانا مرحوم سے عرض کیا تو مسکرانے لگے۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا محمد قاسم صاحب کو عجیب قوتِ علمیہ عطا کی تھی، تمام نظریات ان کے نزدیک بدیہیات تھے، مگر جب حضرت حاجی امداداللہ مہاجرِ مکی وحدۃ الوجود میں کچھ تقریر فرماتے تو خاموش ہوکر سنا کرتے تھے، جناب مولوی محمد مظہر صاحب اس تقریر پر کچھ شبہات پیش کرتے اور ان کا جواب بھی حضرت حاجی صاحب نہایت متانت اور آسان طریقے سے ادا کرتے، مگر مولانا مرحوم کبھی کوئی شبہ بھی بیان نہ کرتے، اسی طرح مولانا رشید احمد صاحب بھی خاموش بیٹھے سنا کرتے اور کچھ چون و چرا نہ کرتے۔ مولانا مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ بعض آدمی حضرت حاجی صاحب کا تقویٰ دیکھ کر معتقد ہوئے، اور بعض عبادت اور ریاضت دیکھ کر، اور بعض کرامات دیکھ کر معتقد ہوئے، میں صرف حضرت حاجی صاحب کی قوتِ علمیہ کا معتقد ہوں۔ جب منزل

بمنزل مدینہ شریف کے قریب ہمارا قافلہ پہنچا جہاں سے روضۂ پاک صاحبِ لولاک صلی اللہ علیہ وسلم نظر آتا تو فوراً جناب مولانا مرحوم نے اپنی نعلین اُتار کر بغل میں دبالیں اور پابرہنہ چلنا شروع کیا، میں نے ان کی دیکھا دیکھی اپنی جوتیاں اُتار کر ننگے پاؤں ہمراہ مولانا مرحوم کے چلنا شروع کیا، اس قدر پتھریاں پیر میں چبھنے لگیں کہ متحمل نہ ہوسکا، آخر پھر جوتا پہن کر چلنے لگا، مگر مولانا مرحوم مدینہ منوّرہ تک کئی میل آخر شب تاریک میں اسی طرح چل کر پابرہنہ پہنچ گئے، مجھ کو سخت تعجب تھا کہ ننگے پیر کیونکر آدمی ان خاردار پتھریوں میں چل سکتا ہے، حالانکہ مولانا مرحوم از فرق تا قدم نہایت نازک و نرم تھے، مگر قوّتِ عشق کے نزدیک سنگ وگل برابر ہیں۔ میں بیان نہیں کرسکتا کہ مولانا مرحوم کو جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کس قدر محبت اور عشق تھا حتیٰ کہ اسمِ گرامی جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا سن کر لرزہ بدن پر پڑ جاتا تھا اور چہرے کا رنگ متغیر ہوجاتا تھا اور ایک عجیب حالت نمایاں ہوجاتی تھی جو معرضِ وجود میں نہیں آسکتی۔ مدینہ شریف میں جناب شاہ عبدالغنی صاحب کے مکان پر قیام کیا جو مولانا مرحوم کے اُستاذِ حدیث تھے، سوائے ابوداؤد کے صحیحین اور سننِ ثلاثہ ان سے پڑھے تھے، اور ابوداؤد جو باقی تھی اس کو اپنی شہرت کے زمانے میں بغل میں دبا کر جناب مولوی احمد علی صاحب محدّث سہارنپوری کی خدمت میں جا کر پڑھ لیا اور ایسے نکاتِ حدیث وقتِ درس بیان کئے۔ مولانا احمد علی صاحب مرحوم مجمعِ عام طلبہ فارغ التحصیل کے رُوبرو ان توجیہات مولانا مرحوم کو بیان فرما کر مولانا صاحب کی بڑی تعریف کیا کرتے تھے۔

توجیہ حدیث

چنانچہ ان میں سے ایک توجیہ بیان کرتا ہوں، وہ اس شبہ کا جواب ہے جو حدیث شریف میں آیا ہے کہ لفظ "غَیرُ اُولِی الضَّرَرِ" اس وقت نازل ہوا جبکہ عبداللہ

ابنِ مکتومؓ نے شکایت کی کہ اس آیت میں جہاد کے واسطے حکم ہے، میں اندھا کس طرح جہاد کرسکتا ہوں؟ اس پر شبہ وارد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ ایسی شکایت ہوگی، پس پہلے ہی آیتِ سابق کے ہمراہ یہ لفظ کیوں نہیں فرمایا۔ مولانا مرحوم نے اس شبہ کا جواب یہ دیا کہ اللہ تعالیٰ نے: ''لَا یَسۡتَوِی الۡقَاعِدُوۡنَ'' فرمایا ہے، ''المقعدون'' نہیں فرمایا، عذر والے ''مقعدون'' میں داخل ہیں اور بلاعذر بیٹھنے والے ''قاعدین'' کہلاتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی بیان فرمادیا، جب نہ سمجھے تو یہ لفظ بڑھانے کی اجازت دے دی گئی۔ کیا عمدہ توجیہ ہے!

بے خوفی اور توکل

واپسی کے وقت جدہ میں کشتیوں پر سوار ہوکر سب قافلہ جہاز پر سوار ہونے کو جاتا تھا، اس قدر تیز وتند ہوا چلنے لگی کہ کشتیاں قریب غرق ہونے کو جھک جاتی تھیں، ہر ایک کا رنگ زرد ہوجاتا تھا، مگر مولانا مرحوم اپنے حال پر رہے اور مولانا رشید احمد صاحب جب کشتی قریب ڈوبنے کے ہوجاتی، مسکراتے تھے، باقی سب بدحواس ہوگئے تھے۔ غرض صحیح وسالم جاکر جہاز پر سوار ہوگئے۔ ہاں! خوب یاد آیا، سوار ہونے سے قبل دو دن سمندر کے کنارے پر بطور سیر کے یہ کاتبِ حروف پھرتا تھا کہ ناگاہ جناب ظفر احمد طرف شیر شاہ ساکن رام پور ضلع سہارنپور مرید بااخلاص حضرت حاجی صاحب موصوف کو کنارۂ سمندر پر پھرتا ہوا دیکھا، پہلی ملاقات تھی، بڑے تپاک سے بغل گیر ہوئے اور فوراً بیسؔ روپیہ جیب میں سے نکال کر مجھ کو عنایت کرنے لگے کہ ان کو لے لو، تمہارے پاس خرچ نہ ہوگا، اور فی الواقع بجز پانچ روپیہ کے میرے پاس کچھ باقی نہ تھا۔ میں نے نہیں لئے اور ان سے دریافت کیا کہ آپ یہاں کیسے پہنچے؟ فرمایا کہ بمبئی میں وقت پر جہاز نہ ملا، اب ایک جہاز آتا تھا اس نے مجھے بٹھالیا، اس لئے دیر ہوگئی، اب مدینہ شریف میں رہوں گا، سالِ آئندہ میں حج کرلوں گا۔ شاہ جی شیر شاہ

صاحب ریاست رام پور میں صاحبِ خدمت تھے، تمام شہر کی گلی کوچے میں پہرہ دیتے، جو بیمار یا محتاج پاتے، اس کی غم خواری اور خدمت کرتے، جہاں شب ہوئی وہیں لیٹ جاتے، بالکل متوکل بھوکے پیاسے خدمتِ خلق میں مشغول رہا کرتے۔ اگر کسی نے کھانے کے واسطے اصرار کیا، کھالیتے ورنہ کچھ پروا نہ کرتے، اور جب تک بیمار اچھا نہ ہوجاتا اس کی دوا دارو و تیمارداری بڑی خوشی سے کرتے تھے، جب وہ اچھا ہوجاتا تب دُوسری جگہ چلے جاتے، اَحکامِ شرع کے بے حد پابند تھے، ایک دن زمانہ طالب علمی میں جامع مسجد کے اندر عصر کی نماز صحنِ مسجد میں یہ کاتب الحروف پڑھتا تھا، یکا یک بہت زور سے پانی برسنے لگا، مجھ کو فکر ہوئی کہ رُوبرو میرے تین کتابیں رکھی ہیں، خراب ہوجائیں گی، اس وقت کوئی آدمی مسجد میں نہ تھا، ناگاہ سیڑھیوں پر دھم دھم کی آواز سنی جیسے کوئی دوڑا چلا آتا ہے اور فوراً وہ تین کتابیں اُٹھا کر مسجد کے اندر لے گیا، جب میں نماز سے فارغ ہوا دیکھا کیا ہوں کہ وہ شخص شیر شاہ صاحب ہیں، میں نے پوچھا کہ آپ اس وقت کیسے پہنچ گئے؟ فرمایا کہ مسجد میں آتا تھا، تمہاری کتابیں دیکھ کر اُٹھا لایا، حالانکہ وہ وقت ایسا نہ تھا کہ مسجد میں آنے کی ضرورت ہو۔

ایک دن آدھی رات کے وقت میری آنکھ کھل گئی، ایک مسجد میں چارپائی پر سورہا تھا، طبیعت میں بے اختیار پلاؤ کی طرف رغبت ہوئی، حالانکہ کبھی ایسی عادت نہ تھی، اس وقت مجھ کو تعجب ہوا کہ بھلا اس وقت ایسی شے کا بہم پہنچنا دُشوار ہے، اسی خیال میں آنکھ کھل گئی، ایک شخص کو دیکھا کہ پیر پکڑ کر جگاتا ہے، غور کیا تو شیر شاہ صاحب ہیں، فرمایا: ذرا اُٹھ کر یہ پلاؤ گرم ہے کھالو! میری دعوت تھی، تمہارے واسطے صاحبِ خانہ سے مانگ کر لایا ہوں۔ مجھ کو زیادہ تعجب ہوا اور ان کے فرمانے سے حسب خواہش نفس کے کھالیا لیکن کئی دن تک حیرت طاری رہی۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا مرحوم کو تقویٰ، زُہد، معرفت، تصوّف، سخاوت، شجاعت، حسنِ اخلاق اور ذہنِ سلیم ایسا عنایت فرمایا تھا کہ جس کی کچھ انتہاء نہیں معلوم ہوتی

تھی۔ واپسی میں جہاز کے اندر ایسے بیمار ہوگئے کہ اُٹھنے بیٹھنے کی بالکل طاقت نہ رہی۔ بمبئ سے ریل میں اٹاوہ تک لیٹے ہوئے تشریف لائے، میری رانوں پر قدم مبارک رکھ لیا کرتے تھے، اٹاوہ سے مجھ کو وطن جانے کی اجازت فرمائی اور چار روپیہ اپنے پاس سے عنایت کئے اور پانچ روپیہ مکہ شریف میں مسجد ابراہیم علیہ السلام کی حد میں مجھ کو لے جا کر عطا فرمائے تھے۔

وطن واپسی

میں جب وطن آیا، چند روز قیام کر کے نانوتہ پہنچا، اس وقت مولانا صاحب کو اچھا تندرست پایا، بلکہ مجھ کو مُلّا جلال اوّل سے آخر تک پڑھایا، لیکن پہلی سی قوت نہ تھی، اس وقت مولانا صاحب کی خدمت میں تحصیلِ علم کے واسطے مولوی محی الدین احمد خان صاحب مرادآبادی اور مولوی عبدالعلی میرٹھی اور مولوی رحیم اللہ بجنوری حاضر تھے۔ میں ان کے اسباق کی بھی سماعت کرتا تھا، لیکن ان کے فضل و کمال کو کہاں پہنچتا، اور ان سے پہلے جناب مولانا مرحوم کی خدمتِ بابرکت میں مولوی احمد صاحب امروہی اور مولوی محمود حسن صاحب دیوبندی اور مولوی فخرالدین گنگوہی وغیرہ میرٹھ میں فارغ التحصیل ہو چکے تھے اور کبھی کبھی نانوتہ میں بھی مولانا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ مولانا صاحب اور مولانا رشید احمد صاحب میں نہایت محبت اور اتحاد تھا۔ کبھی گنگوہ کو، کبھی رام پور ضلع سہارنپور میں جناب حکیم ضیاء الدین خلیفہ مجاز حافظ ضامن صاحب اپنے پیر بھائی کے ساتھ جناب حاجی صاحب کے ملنے کے لئے تشریف لے جاتے، ایک بار میں بھی ہمرکاب تھا، واپسی میں جب نانوتہ ایک میل رہا، مولانا صاحب کا حجام نانوتہ سے آتا ہوا ملا، دریافت فرمایا تو عرض کیا کہ میں آپ ہی کے پاس جا رہا تھا، فرمایا کہ کیوں؟ عرض کیا کہ تھانہ دار نانوتہ نے ایک عورت کے بھگانے کا جرم مجھ پر لگا کر چالان کا حکم دیا ہے، میں بالکل بے قصور ہوں، خدا کے واسطے مجھ کو

بچائیے۔ جس وقت مسجد نانوتہ میں پہنچے تو بیٹھتے ہی مجھ سے فرمایا کہ منشی محمد یٰسین کو بلا لاؤ، میں ان کو بلالیا، ان سے عجیب شانِ جلالی سے فرمایا کہ اس غریب کو تھانہ دار نے بے قصور پکڑا ہے، تم اس سے کہہ دو کہ یہ ہمارا آدمی ہے، اس کو چھوڑ دو ورنہ تم بھی نہ بچوگے، اگر اس کے ہاتھ میں ہتھ کڑی ڈالو گے تو تمہارے ہاتھ میں بھی ہتھ کڑی پڑے گی۔ انہوں نے تھانہ دار کے پاس جاکر مولانا صاحب کا ارشاد ہو بہو کہلایا، اس نے کہا کہ اب کیا ہوسکتا ہے؟ روزنامچہ میں اس کا نام لکھ دیا گیا ہے۔ جب انہوں نے مولانا صاحب سے تھانہ دار کا یہ جواب کہا تو فرمایا کہ پھر جاکر کہہ دو کہ اس کا نام روزنامچہ سے نکال دو۔ منشی صاحب نے تھانہ دار سے جاکر یہی کہہ دیا، اس نے کہا کہ لکھا ہوا نام کاٹنا بڑا جرم ہے، چلو میں بھی تمہارے ساتھ ہی مولانا صاحب کے پاس چلتا ہوں۔ وہ حاضر ہوکر مولانا صاحب سے عرض کرنے لگا کہ حضرت! نام نکالنا بڑا جرم ہے، اگر نام اس کا نکالا تو نوکری میری جاتی رہے گی، فرمایا کہ اس کا نام کاٹ دو تمہاری نوکری ہرگز نہیں جائے گی۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو کچھ مولانا صاحب فرماتے ہیں ایسا ہی ہوگا، جس نے وہ حالت دیکھی ہے اس کے یقین میں ذرا شک نہیں، چنانچہ اس حجام کو چھوڑ دیا گیا اور تھانہ دار بھی قائم رہا۔

قربانی کی رقم کا غیبی انتظام

عیدالاضحیٰ میں مولانا صاحب کا دستور تھا کہ سالم جانور کی قربانی کیا کرتے تھے، صبح کے وقت میں بھی حاضر تھا، منشی محمد یٰسین صاحب تشریف لائے اور عرض کیا کہ گائے کی قیمت سات روپیہ ٹھہر گئی ہے۔ فرمایا کہ اچھا! وہ اُٹھ کر چلے گئے، ایک گھنٹے میں ایک مسافر آدمی جو غریب مسکین معلوم ہوتا تھا، آیا اور مصافحہ کرکے بیٹھ کر جیب میں سے کچھ روپے نکال کر مولانا صاحب کی نذر کیے، مولانا صاحب نے وہ روپیہ مجھ کو دیئے کہ منشی یٰسین صاحب کو دے دو، میں نے دیکھا تو سات ہی روپیہ تھے۔ حیران

رہ گیا کہ خداوند! یہ کیا اسرار اور راز و نیاز ہے۔ ایک دفعہ میں نے مولانا صاحب سے برسبیل تذکرہ شکایت کی کہ مجھ کو کبھی رونا نہیں آیا، اسی دوپہر کو جب سوکر اُٹھا تو اس قدر رویا کہ ہر چند چاہتا تھا کہ موقوف کردُوں لیکن آنسو نہیں تھمتے تھے، اور کوئی رونے کی وجہ بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ پھر بہت دیر سے خیال آیا کہ صبح میں نے مولانا صاحب سے درخواست کی تھی، یہ اسی کا ثمرہ ہے۔ مولانا صاحب کی عادت تھی کہ مسجد کے سہ دری میں بیٹھا کرتے تھے اور وہیں مہمانوں کا قیام ہوتا تھا، اگر زیادہ مہمان آئے تو اپنے ماموں کے مکان پر ٹھہرادیا کرتے تھے، میں سب مہمانوں کا بستر بچھایا کرتا تھا۔ ایک دن چند مہمان کھانا کھانے کے واسطے ہاتھ دھونے کو اُٹھے، میں اور دُوسرے صاحب نے ان کے ہاتھ دُھلوائے مگر ایک بڈھا مسکین شکستہ حال رہ گیا، اس کے کسی نے ہاتھ نہ دُھلوائے، آخر وہ خود ہی لوٹے کے واسطے جھکا ہی تھا کہ مولانا صاحب نے اس سہ دری سے جھپٹ کر اس قدر جلد وہ لوٹا اُٹھایا کہ میں حیران رہ گیا اور دونوں ہاتھوں میں نہایت ادب سے لوٹا پکڑ کر اس بڈھے کے ہاتھ دُھلا دیئے، اس وقت کی ندامت جس قدر مجھ کو ہوئی ہے بیان نہیں کرسکتا۔

منگلور کی مدرّسی کے واسطے مہتمم صاحب نے مولانا صاحب سے مشورہ لیا تو فرمایا کہ پوڑ سے منصور علی کو بلالو، اس کو ضرورت ہے۔ جب خط طلبی کہ پوڑ پہنچا میں فوراً آکر منگلور چلا گیا اور دو مہینے تک وہاں رہا، مدرّسی کی، اتنے میں جناب مولانا صاحب مع ہمراہیوں کے روڑکی کو مباحثہ سرپرستی کے لئے تشریف لائے اور تلمیذِ رشید کو منگلور بھیجا کہ اس کو ملنے کے واسطے بلا لاؤ۔ میں یہ مژدہ سنتے ہی مولوی فخرالدین صاحب کے ہمراہ چلا گیا، سڑک پر بہلی کو ٹھہرا کر فرمایا کہ تم بھی ضرور روڑکی آجانا، حسبِ ارشاد دو تین روز کے بعد میں بھی روڑکی پہنچا تو چند روز مولانا صاحب روڑکی میں قیام فرما کر منگلور میرے پاس دو دن ٹھہرے اور قاضی محمد اسماعیل وغیرہ نے مہمان نوازی کی خوب داد دی۔ وقتِ تشریف بری مولانا صاحب کے میں بھی رُخصت لے کر

ہم رکاب ہولیا اور دیوبند سے وطن واپس چلا گیا۔

حضرت نانوتوی کی وفات

ادھر مولانا صاحب کا مزاج پھر ناساز ہوا، ڈاکٹر عبدالرحمٰن نے علاج کے لئے اپنے پاس مظفرنگر میں مولانا کو رکھا اور بہت خدمت و تیمارداری کی، میں مرادآباد سے قدم بوسی اور عیادت کے واسطے گیا تو قدرے افاقہ تھا مگر اصل مرض ابھی باقی تھا، خفیف بخار رہتا تھا، چند روز کے بعد مولوی رفیع الدین مہتمم مدرسہ کے خطوط جا بجا پہنچے کہ اب حالتِ مرض ترقی پر ہے جلد چلے آؤ۔ بندہ بھی خط دیکھتے ہی دیوبند پہنچا، مولوی ذوالفقار علی مرحوم کے مکان پر بڑا مجمع تھا، طرح طرح سے علاج کیا گیا مگر کارگر نہ ہوا، جمعرات کو قریب دوپہر کے سب کا مشورہ ہوا کہ مولانا صاحب کو مکان پر لے جانا مناسب ہے، چارپائی کو تمام خدام آہستہ آہستہ اُٹھائے مکان پر لے گئے، دو بجے کے بعد پاسِ انفاس کی آواز اس زور سے آنے لگی کہ باہر دروازے کے بھی میں نے سنی، مولانا رشید احمد صاحب قریب چارپائی کے تشریف رکھتے تھے کہ انتقال فرمایا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مدرسہ میں غسل دیا گیا، جنازے کو بعد عصر کی نماز کے اُٹھایا گیا، سینکڑوں آدمی جنازے کو اُٹھانا چاہتے تھے، حاجی محمد عابد صاحب نے فرمایا کہ اس قدر ہجوم جنازہ اُٹھانے کو سب کے سب مت کرو، چارپائی ٹوٹ جائے گی۔ قریب مغرب کے باغ میں جاکر جنازے کو رکھا، بعد نماز مغرب کے جب شبِ جمعہ شروع ہوئی، دفن کیا گیا، بہت آدمی جنازے میں کمبل پوش فقراء موجود تھے، بعد دفن کے سب غائب ہوگئے، دُوسرے دن سے مخلوق رُخصت ہونے لگی، میں اور مولوی احمد حسن صاحب اور مرزا محمد نبی بیگ اور حاجی محمد اکبر، مرادآباد چلے آئے۔

حضرت نانوتویؒ کے عقائد و خصائل

مولانا مرحوم کی عادت تھی کہ قرض لینے کا اگر اتفاق ہوتا تو اس کو جلد ادا

کردیتے اور فرماتے تھے کہ دوستوں کا قرض جلد ادا کردینا چاہئے۔ جھوٹ اور فریب سے بہت نفرت کرتے تھے، اگر کوئی شخص ادنیٰ شے بھی پیش کرتا تو اس کو بڑی خوشی سے لے کر خود بھی کھاتے اور حاضرین کو بھی کھلاتے۔ خوراک ان کی بہت قلیل تھی، کبھی غذا کو بہت رغبت اور حرص سے نہیں کھایا، نہایت چھوٹا لقمہ لیا کرتے تھے اور ہر لقمے پر بسم اللہ ضرور پڑھا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت دیکھ کر خوشی بہت کرتے مگر بقدر نمک چشی کے اس میں سے لیا کرتے، باقی سب کو دیا کرتے۔ عمل ان کا سنی تھا، ہر سنت کے اِتباع میں بہت خیال رکھتے تھے اور کبھی کبھی خلافی مسائل پر بھی عمل کرلیتے تھے، اور حضرت اِمامِ اعظمؒ اور حضرت محی الدین ابنِ عربیؒ اور حضرت مجدّد الف ثانیؒ کے کمالات اور حالات کے نہایت معتقد تھے اور بہت ہی تعریف کیا کرتے تھے، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علوم کو سب بزرگانِ دِین کے علوم سے اعلیٰ اور افضل بتلاتے تھے۔ نماز باجماعت ادا کرتے اور تکبیرِ اُولیٰ کو کبھی ترک نہ کرتے، اذان ہوتے ہی نماز کا اہتمام شروع کردیتے۔ حافظِ قرآن شریف تھے، ہمیشہ تہجد میں قرآن شریف پڑھا کرتے۔ جاہلوں کی نذر نیاز کا کھانا کبھی نہ کھاتے، بزرگوں کے مزار پر جایا کرتے اور دُعا کرکے چلے آتے۔ سماعِ اولیاء اللہ کے قائل تھے، اگر اکیلے کسی مزار پر جاتے اور دُوسرا شخص وہاں موجود نہ ہوتا تو آواز سے عرض کرتے کہ آپؒ میرے واسطے دُعا کریں۔ اور ہمراہیوں کے ساتھ آہستہ دُعا اور سورتیں پڑھ کر چلے آتے۔ مولاناؒ بہت دیر تک شاہ مکمل صاحبؒ کے مزار پر مرادآباد میں بیٹھے رہے، مجھ سے بوجہ سہو وغفلت اپنے قدم کی حفاظت نہ ہوسکی اور میرا پاؤں مزار شریف سے لگا ہوا دیکھ کر کانپنے لگے، تمام بدن لرزتا تھا، اپنے دونوں ہاتھوں سے میرا پیر اُٹھا کر فوراً علیحدہ کردیا، مجھ کو بڑی شرمندگی اور خجالت ہوئی اور توبہ کی۔ مولانا صاحبؒ کے مرادآباد تشریف لانے سے تین چار ماہ قبل صوفی نسیم خان صاحب نے خواب میں دیکھا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالاخانہ دروازہ نواب شبیر علی خان میں تشریف رکھتے ہیں اور

بہت سے آدمی بیعت کے لئے آنے لگے، اس وقت خان صاحب نے شیرینی منگوا کر صوفی صاحب کے ہاں کہلا بھیجا کہ یہ اسی خواب کی تعبیر ہے جو اَب ظاہر ہوئی۔

خواب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد

ایسے چند اَشخاص نے خواب میں یہی مضمون دیکھے، ایک صاحب نے دیکھا کہ جامع مسجد مرادآباد میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفید چادر پر تشریف رکھتے ہیں اور ایک آدمی کی جگہ خالی ہے، یہ صاحبِ خواب خالی جگہ پر بیٹھنے لگے تو فرمایا کہ یہ جگہ مولانا محمد قاسم کی ہے، دُوسری جگہ بیٹھ جاؤ۔ اور ایک صاحب نے دیکھا کہ لڑھکتا، گھومتا ہوا میری طرف آتا ہے، قریب میرے آگیا میں نے اس کو ہاتھ لگا کر دیکھا تو وہ بھی اسی خواب کی وجہ سے مولانا صاحبؒ سے بیعت ہوئے۔ مولاناؒ کی عادت تھی کہ جب کوئی جانا چاہے، کبھی اصرار سے نہ روکو، جب مولاناؒ نے قصد بریلی کیا تو حافظ عبدالعزیز بھتیجے حضرت میاں جی نور محمد کے فرمانے سے دو روز اور ٹھہر گئے، میں ایک دن پہلے حصار سے آیا، میں نے بھی عرض کیا کہ حضرت! میں آپ کی وجہ سے جلد آیا ہوں دو روز اور قیام فرمائیے، فرمایا کہ اگر میری وجہ سے آئے ہو تو میرے ساتھ چلو۔ میں بھی بریلی کو چلا گیا۔

(''علمائے دیوبند عہد ساز شخصیات'' ص:۲۵ تا ص:۳۱)

دیوبند، ندوہ اور علی گڑھ

اب علی گڑھ اور دِینی مدارس کے طلباء وضع قطع اور دِینی جذبات میں یکساں ہیں

(علامہ قاری محمد طیب قاسمی کا مکتوبِ گرامی مولانا پروفیسر انوارالحسن شیرکوٹی کے نام)

محترمی ومکرمی زید مجدکم السامی

سلامِ مسنون، نیازِ مقرون، گرامی نامے نے ممنون یاد آوری فرمایا، میں اس دوران مسلسل سفروں میں رہا، جواب میں تأخیر ہوئی، جس کی معافی چاہتا ہوں، اس دوران کتاب مستطاب ''حیاتِ اِمداد'' بصیرت افزائے نظر وفکر ہوئی، اس کا ابتدائی تفصیلی مقدمہ پڑھا، بے حد مسرّت ہوئی، آپ نے نہایت ہی پاکیزہ انداز میں دیوبند اور بزرگانِ دیوبند کا تعارف کرایا ہے، جو حقیقی اور واقعاتی ہے، اس بارے میں اِک لطیفہ قابلِ ذکر ہے، آپ نے دارالعلوم کا تعارف کراتے ہوئے مقدمہ ''حیاتِ اِمداد'' میں اکبرالٰہ آبادی کا یہ قطعہ نقل کیا ہے ؎

ہے دِل روشن مثالِ دیوبند
اور ندوہ ہے زبانِ ہوشمند

اور اس کا دُوسرا شعر جو علی گڑھ یونیورسٹی کے بارے میں، یہ لکھ کر چھوڑ دیا ہے کہ اس سے علی گڑھ کی تنقیص کا پہلو نکلتا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا تقریباً یہی کیفیت اس قطعے کو دیکھ کر میری بھی ہوئی تھی، گو میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس وقت کے علی گڑھ کے اَحوال کچھ ایسے تھے جن پر اکبر کا یہ شعر چسپاں ہوتا تھا، علماء کے ساتھ تمسخر و اِستہزاء،

دِین کی تضحیک کچھ وہاں کے پروردوں کا شعار سا بن گیا تھا، اس لئے اکبرؔ بھی غریب معذور تھا، لیکن سیاسی تحریکات میں دیوبند اور علی گڑھ ایک دُوسرے کے قریب آئے تو روشیں بدلیں اور سنہ ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد تو علی گڑھ کی کایا ہی پلٹ گئی، اب وہاں کے اکثر طلبہ اور عربی مدارس کے طلبہ میں بلحاظ وضع قطع بلکہ بلحاظ جذباتِ دِینی فرق محسوس نہیں ہوتا، اس لئے میں نے اکبرؔ کے قطعے میں سے ان کا وہ پیٹ والا شعر نکال کر اپنے ایک شعر کا اضافہ کردیا ہے، اور اب قطعہ یوں ہوجاتا ہے ؎

ہے دِل روشن مثالِ دیوبند
اور ندوہ ہے زبانِ ہوشمند
ہے علی گڑھ اِک دِماغِ فکرمند
قوم ان تینوں ہی سے اَرجمند

شعبان سنہ ۱۳۸۴ھ میں دُوسری آنکھ بننے پر (جو علی گڑھ کے ہسپتال ہی میں بنی ہے، جس کا تعلق مسلم یونیورسٹی سے ہی ہے) میں نے جو نظم آنکھ کی کہانی کے نام سے لکھی ہے اس میں علی گڑھ اور دیوبند کا ایک مستقل عنوان واقعی رکھ کر دونوں کے مناسبِ حال مناقب لکھے ہیں، جس کا پہلا شعر یہ ہے:

دیوبند نے تو مجھے روشنی دِل کی بخشی
اور علی گڑھ نے کیا آنکھ کو روشن مہتاب

بہرحال ''حیاتِ اِمداد'' حیات افروز کتاب ہے، نصف کے قریب اسے دیکھ چکا ہوں اور برابر دیکھ رہا ہوں، وقت نہیں ملتا، ہجومِ کار و اَفکار اور اُوپر سے کثرتِ اَسفار مہلت نہیں دیتے۔

آپ کے والانامے کے سوالات کے اپنے علم کی حد تک جوابات اِرسال ہیں، جو حسبِ ذیل ہیں۔ حضرت نانوتویؒ نے میرٹھ کے قیام کے بعد دیوبند میں قیام فرمایا ہے، مگر خود سے قیام کا ارادہ نہیں تھا، نانوتہ آتے جاتے درمیان میں دیوبند کا

قیام خواہ طویل بھی ہوتا مگر مسافرانہ ہوتا تھا، متوسلین قیامِ دیوبند پر جب زور دیتے تو حضرتؒ جواب میں فرمادیتے: ''حبِ وطن از ملکِ سلیمان خوشتر'' یہ دیکھ کر دیوبند کے متوسلین میں سے خصوصیت سے جناب حکیم مشتاق احمد صاحب مرحوم نے آگے بڑھ کر یہ تدبیر اختیار کی کہ دیوبند میں ایک اچھا وسیع اور فراخ مکان کا باضابطہ ہبہ نامہ میری دادی صاحبہ کے نام لکھوا کر حضرتؒ کے قدموں میں ڈال دیا اور عرض کیا کہ حضرت! زیادہ سے زیادہ مکان نہ ہونے کا عذر ہوسکتا تھا، سو اس صورت میں وہ رفع ہوجاتا ہے، اس مرحلے پر پہنچ کر بالآخر حضرتؒ قیامِ دیوبند پر راضی ہوگئے اور نانوتہ کی سکونت ترک فرمائی۔ والد صاحب مرحوم کی وفات کے بعد یہ جدّی مکان مولوی طاہر مرحوم کے حصے میں آیا اور وہی اس میں سکونت پذیر رہے، انہوں نے اس میں کافی تغیرات کرائے، ان کے انتقال کے بعد حضرتؒ کا یہ کوٹھا میرے پاس آگیا تو میں نے اصل دروازہ ادھر سے بند کرا کر اپنی طرف کھلوادیا ہے، اس لئے اس کا فوٹو بھی اب اس سمت سے لے کر اِرسالِ خدمت ہے۔

نانوتہ کے مکان کا واقعہ یہ کہ انقلاب سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد یہ مکان فروخت کردیا گیا، خریدار پاکستان چلا گیا اور اس مکان پر کسٹوڈین کا قبضہ ہوگیا، مکانیت اس کی تقریباً منہدم ہوچکی تھی اور اب تو بالکل ہی ویران زمین پڑی ہوئی ہے، صرف ایک دروازہ باقی ہے جس سے حضرتؒ کی آمد و رفت اندرونِ مکان میں ہوتی تھی، اس کا فوٹو اِرسال ہے، ان بزرگوں کی سکونت کے مقامات (دیوبند، نانوتہ وغیرہ) کے نقشے یکجائی ملنے دُشوار ہیں، ان کے مل جانے کی کوئی صورت بن پڑی تو پیش کردیئے جائیں گے۔

نانوتہ کی آبادی تقریباً ۶، ۷ ہزار نفوس پر مشتمل ہے، تھانہ، ڈاک خانہ، بازار اور حالیہ سرکار کا سرکاری مدرسہ وغیرہ سب موجود ہیں، قدیم قصبہ ہے، عمارات پختہ ہیں اور بڑی بڑی حویلیوں کے نشانات ابھی تک قائم ہیں، اسٹیشن سے نانوتہ کی آبادی جانبِ غرب ہے۔

آپ نے ان بزرگوں کو روشناس کرا کر ایک بڑی خدمت کا سہرا اپنے سر باندھا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو دارین میں اس کا صلہ عطا فرمائے، ''حیاتِ اِمداد'' کے بعد دُوسری جلدوں کا ابھی سے انتظار شروع ہوگیا ہے۔

اُمید ہے کہ مزاجِ گرامی بعافیت ہوگا، پُرسانِ حال حضرات کی خدمات میں سلامِ مسنون عرض ہے۔

والسلام

محمد طیب

مہتمم دارالعلوم دیوبند

۱۰/۱/۱۳۸۰ھ

(''علمائے دیوبند عہد ساز شخصیات'' ص:۱۴۷، ۱۴۸)

عورتوں کے لئے پردہ کیوں ضروری ہے؟

علی گڑھ یونیورسٹی میں میری تقریر تھی، جب میں اسٹیج پر پہنچا تو بہت سی عورتیں ہمارے سامنے بلا پردہ کے بیٹھی ہوئی تھیں، میں پیچھے ہٹنے لگا، انہوں نے کہا کہ آیئے، میں نے کہا کہ پہلے پردہ ڈالو پھر آؤں گا۔ خیر پردہ لٹکا دیا گیا تو میں گیا، جب میں تقریر کرنے کے لئے بیٹھا تو عورتوں نے کہا کہ اگر ہم درمیان تقریر سوال کریں تو کیا جواب دیا جائے گا؟ میں نے کہا کہ درمیانِ تقریر اِجازت نہیں البتہ جو سوالات ذہن میں آئیں ان کو لکھ لو تقریر کے بعد جواب دیا جائے گا۔ چنانچہ تقریر کے بعد پچاس ساٹھ سوالات آئے ان میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ عورتوں کو بلا وجہ گھروں میں مقید کیا گیا ہے اور ان کے لئے حکم یہ ہے کہ ہر وقت منہ چھپائے رکھیں، اس سے ایک نقصان تو یہ ہے کہ "الانسان حریص فیما منع "یعنی انسان جس چیز سے روکا جاتا ہے وہ اس کا حریص ہوجاتا ہے، اور دُوسرا نقصان یہ ہے کہ اس پردے کی وجہ سے عورتیں گھروں میں گھٹتی ہیں باہر کی ہواؤں سے محروم ہوگئیں، گھر میں رہ کر مکمل تعلیم نہیں ہوسکتی، لہٰذا ان کو کھلے بندوں چھوڑ دینا چاہئے تاکہ ان کی حرص ختم ہو، تازہ ہواؤں سے فائدہ اُٹھائیں اور آزادی سے تعلیم حاصل کریں۔

میں نے ان سے کہا کہ پہلے اِلزامی جواب سن لو، پھر تحقیقی جواب دُوں گا۔ الزامی جواب یہ ہے کہ دُنیا میں دو ہی چیزیں عام طور پر چھپانے کی رکھی گئی ہیں، ایک دولت، دُوسری عورت۔ اگر دولت کے چھپانے سے چوروں کی حرص بڑھتی ہے تو میں کہتا ہوں کہ آپ لوگ دولت کو بینکوں سے نکال کر سڑکوں پر ڈال دیں تاکہ چوروں کی

حرص ختم ہوجائے اور ان کے دِلوں میں خوب سیری ہوجائے، اس طرح کرنے سے اگر آپ کی دولت محفوظ رہی تو میں فتویٰ دُوں گا کہ عورتیں بھی کھلے بندوں آجائیں، اور اگر دولت رات ہی رات صاف ہوگئی تو میں عورتوں کو وہی حکم دُوں گا جو دولت کے چھپانے کے بارے میں دیتا ہوں۔ میں نے کہا کہ چوروں کا خطرہ تو اَلگ ہے، مگر دولت فی نفسہٖ ایسی چیز نہیں ہے جو منظرِ عام پر لائی جائے اور سڑکوں پر پھیلادی جائے اور یہ جتلایا جائے کہ میں لکھ پتی کا کروڑ پتی ہوں، بلکہ وہ چھپانے کی چیز ہے اسی لئے اس کو چھپایا جاتا ہے۔ اسی طرح عورت ہے، اس کی حرمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ مردوں سے الگ ہوکر پردے میں رہے، جنت تو دارالمتّقین ہے، وہاں پر معصیت کا کوئی خطرہ نہیں ہے، مگر پھر بھی مرد وعورت کا اِختلاط نہیں ہوگا۔

اسی لئے دعوتِ خصوصی میں صرف مرد حضرات ہی بلائے جائیں گے، تو یہ خصوصیت خطرۂ معصیت کی وجہ سے نہیں ہوگی، بلکہ عورت کی حرمت کا تقاضا یہی ہے کہ اس کو مردوں سے الگ رکھا جائے، مگر شریعت نے ان کی دِل شکنی نہیں کی اور کلیۃً ان کو الگ نہیں رکھا، بلکہ صرف غیرمحرَم سے الگ رکھا ہے، اسی طرح جنت میں بھی ان کی دِل شکنی نہیں ہوگی کیونکہ اس دعوتِ خصوصی میں جو سب سے اہم دولت ملنے والی ہوگی وہ دیدارِ خداوندی ہوگی، حدیث شریف میں آتا ہے کہ حق تعالیٰ کی زیارت سے لوگوں کے چہرے منوّر ہوجائیں گے اور حسن و جمال میں ہزاروں گنا اضافہ ہوگا، جب مرد حضرات دیدار کرکے اپنی اپنی جنتوں میں واپس آئیں گے تو ان کی عورتیں کہیں گی کہ آج تمہارا حسن و جمال تو ہزاروں گنا بڑھا ہوا ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟ وہ کہیں گے کہ آج ہم حق تعالیٰ کی زیارت کرکے آئے ہیں، مگر ہم دیکھ رہے ہیں کہ تمہارا حسن و جمال بھی پہلے سے ہزاروں گنا بڑھا ہوا ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ تو وہ کہیں گی کہ حق تعالیٰ یہاں پر خود آکر زیارت کراکے گئے ہیں۔ تو حق تعالیٰ مردوں کو بلاکر زیارت کرائیں گے اور عورتوں کے پاس خود آکر ان کو زیارت کرائیں گے، یعنی تجلیاتِ الٰہی

وہاں پر پہنچیں گی۔ تو عورتوں کے دِلوں میں جو وسوسہ پیدا ہوتا کہ حق تعالیٰ نے مردوں کو بلاکر زیارت کرادی مگر ہم زیارت سے محروم رہیں، تو حق تعالیٰ اس وسوے کو دُور کرنے کے لئے جنت میں خود آکر عورتوں کو زیارت کرائیں گے۔ لہٰذا جب دونوں کا مقصد حل ہوگا تو کوئی اِشکال نہیں، مگر عدمِ اختلاط کی بناء معصیت کا خطرہ نہیں ہے، بلکہ اس کی فطرت کو باقی رکھنے کے لئے حق تعالیٰ نے ان کو مردوں سے الگ رکھا ہے، چونکہ عورت کی فطرت میں حیاء ہے اس لئے وہ مردوں سے طبعی طور پر منہ چھپاتی ہیں، اور واقعہ یہ ہے کہ اگر عورت میں خود فحش نہ ہوتو مردوں کی مجال نہیں کہ ان پر ہاتھ ڈال دیں، جب کوئی مرد کسی عورت کے اندرلوچ دیکھتا ہے تب ہی اس کی طرف مائل ہوتا ہے۔ بہرحال جنت میں پردے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی کیونکہ جس طرح مردوں کے مجامع ہوں گے اسی طرح عورتوں کے مجامع بھی مردوں سے الگ ہوں گے، اِختلاط کی شکل نہ ہوگی۔

عورتوں کے سوال کا تحقیقی جواب

حضرتؒ نے فرمایا کہ ان کے سوال کا تحقیقی جواب ہم نے یہ دیا کہ تم جو یہ کہتی ہو کہ عورتوں کو گھونٹ دیا گیا، وہ تعلیم سے محروم ہوگئیں اور تازہ ہواؤں سے بھی محروم ہوگئیں اوران کی صحت خراب ہوگئی، اورتم نے جو یہ کہا کہ "الانسان حریص فیما منع" یہ اس وقت ہے جبکہ کلیۃً عورتوں کو مردوں سے ملنے کو روک دیا جائے، حالانکہ کلی طور پرنہیں روکا گیا ہے بلکہ اسلام نے یہ حکم دیا کہ نکاح کے ذریعہ سامنے آؤ اور ملو، بغیر نکاح کے نہ ملو، تو اسلام نے ایک راستہ یعنی بذریعہ نکاح ملنے کا راستے کھول دیا، اور ایک راستہ بغیر نکاح کے بند کردیا گیا، پھر ادھر محرّماتِ اَبدیہ سے بھی پردے کا حکم نہیں دیا گیا، البتہ مُحَلّلَات سے پردہ کروایا، تو ایک نوع کے ملنے اور ایک کے سامنے سے آنے سے روک دیا، لہٰذا جب اس کا بدل سامنے رکھ دیا تو اَب حرص کا کوئی

سوال ہی نہیں۔ اگر کلی طور پر مردوں سے ملنے اور سامنے آنے سے روکا جاتا تو حرص ترقی کرسکتی تھی، مگر اسلام نے حرص کا دروازہ ہی بند کر دیا، جتنے مرد ہیں تقریباً اتنی ہی عورتیں بھی ہیں، اور مان لیجئے کہ عورتیں زائد بھی ہوں تو چار عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت دے دی گئی، لہٰذا اس کی ضرورت ہی نہیں رہے گی کہ وہ مردوں سے کلی طور پر الگ تھلگ رہیں۔ رہا یہ سوال کہ پردے میں رہنے سے صحت خراب ہوجاتی ہے، تو گھر یہ پنجرہ ہے، رات کو تو اسی میں ہم بھی رہتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ آدھی زندگی اس پنجرے میں گزرتی ہے اور آدھی زندگی باہر گزرتی ہے۔ مرد آٹھ بجے کام پر جاتا ہے اور چار بجے واپس آجاتا ہے، تو آدھی زندگی میں کٹوتی ہوگئی، تو مردوں کی عمر کا زیادہ حصہ گھر ہی کے پنجرے میں گزرتا ہے اور تھوڑا حصہ باہر گزرتا ہے، تو گھر میں رہنے سے اگر صحت خراب ہوجایا کرتی تو پھر مردوں کی صحت بھی خراب ہونی چاہئے۔ لہٰذا یہ سوال ہی غلط ہے کہ پردے میں رہنے سے صحت خراب ہوجاتی ہے۔ پر میں نے ان سے خود سوال کیا کہ تمہارے نزدیک عورتوں کی صحت کب سے خراب ہوگئی ہے؟ انہوں نے کہا کہ پچاس ساٹھ سال سے عورتیں بہت کمزور ہوگئی ہیں۔ میں نے کہا: پچاس ساٹھ سال پہلے پردے کی شدّت تھی اب تو خفت ہوگئی ہے، تو معلوم ہوا کہ پردہ ہی ذریعہ تھا اُن کی صحت کا۔ اُصول تو یہ ہونا چاہئے کہ اُس زمانے میں عورتوں کی صحت خرابی ہونی چاہئے تھی، اُس زمانے میں پردے کی شدّت تھی، اور اِس زمانے کی عورتوں کی صحت اچھی ہونی چاہئے کیونکہ اَب پردے کی خفت ہوگئی ہے، مگر اَب تو اُلٹا ہی نتیجہ نکل رہا ہے اور معلوم ہو رہا ہے کہ پردہ ہی ذریعہ ہے صحت کا، اور بے پردگی ذریعہ ہے صحت کی خرابی کا۔ میں نے کہا کہ بیمار رہنے کی وجہ پردہ نہیں بلکہ تمدن کی خرابی ہے، غذائیں بھی خراب، دوائیں بھی خراب اور ماحول بھی خراب، ہر وقت چیزوں کو کھانا یہی صحت کی خرابی بنا ہے، ورنہ منہ چھپانے سے اگر صحت خراب ہوا کرتی تو سردی کے زمانے میں ہر مرد بیمار ہوا کرتا، کیونکہ لحاف کے اندر سب ہی منہ

چھپائے رہتے ہیں، مگر منہ چھپانے سے بیمار نہیں ہوتے، تو معلوم ہوا کہ منہ چھپانا صحت کی خرابی کی وجہ نہیں ہے۔ رہا تیسرا سوال کہ تعلیم میں کمی ہوگی اور تعلیم کی کمی کا سبب پردہ ہے، تو میں نے کہا کہ پُرانے زمانے کی عورتیں جو پردہ نشین تھیں اگر ان کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ کرو تو ان میں تعلیم بھی زیادہ معلوم ہوگی، کیونکہ صحابہؓ اور تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کی عورتوں میں محدّثات بھی تھیں اور فقیہات بھی تھیں، مُتکلّمہ اور صوفیہ بھی تھیں، ان کے متعلق بڑی بڑی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں، آج کل کی عورتوں میں وہ چیزیں نہیں ہیں جو اُن میں تھیں، تو کیا وہ عورتیں بے پردگی میں یہ تعلیم و تربیت پاتی تھیں؟ ہرگز نہیں، بلکہ وہ پردے ہی میں رہ کر یہ تعلیم و تربیت پاتی تھیں۔ رہی خاص تعلیم جو بغیر اسکول جائے ہوئے حاصل نہیں ہوتی، میں کہتا ہوں کہ اس خاص تعلیم کی ضرورت ہی کیا ہے؟ عورتوں کا یہ کام ہی نہیں ہے کہ دفتروں میں جاکر کلرک بنیں یا ریلوے میں جاکر ٹکٹ ماسٹر یا گارڈ بنیں، یا فوجوں میں جاکر چیف کمانڈر بنیں، یہ عورتوں کے فرائض نہیں ہیں، لہٰذا اس کی تعلیم دینا بھی غیرضروری ہے اور غیرضروری چیز کی وجہ سے ضروری چیز کو ختم کردینا یہ کون سی عقل مندی ہے؟

عورتوں کے لئے گھریلو تعلیم کا حکم

اور جو ضروری تعلیم ہے یعنی گھریلو تعلیم، مثلاً مسائل کی تعلیم اور قرآن شریف کی تعلیم، اس کے لئے بے پردگی ضروری نہیں ہے، بلکہ یہ تو گھروں میں رہ کر بھی حاصل ہوجاتی ہے، اسی واسطے ازواجِ مطہراتؓ کے بارے میں قرآن شریف میں فرمایا گیا: ''وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِىْ بُيُوْتِكُنَّ'' یاد کرو تم ان حکمتوں کو جو گھروں میں تم کو نبوّت کی تعلیم دی جاتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جو تعلیم مقصود ہے وہ گھروں میں رہ کر بھی حاصل ہوسکتی ہے، اور جو تعلیم گھروں سے نکل کر باہر حاصل ہو وہ ضروری نہیں ہے، تو غیرضروری کی وجہ سے ضروری کیسے ترک کریں گے؟ مطلب یہ کہ پردے کا ہونا اور

مردوں سے اختلاط نہ ہونا اس کی بناء معصیت نہیں ہے، بلکہ عورت کی حرمت کا تقاضا یہی ہے کہ وہ مردوں سے الگ رہے، بعض چیزیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ آپ مردوں کو بھی وہاں جانے سے روکتے ہیں، مثلاً وہاں کا ماحول اچھا نہیں، سوسائٹی خراب ہے، اس لئے وہاں پر مت جاؤ، اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس اختلاط کو معصیت ہی کی وجہ سے روکا جاتا ہے، بلکہ ہر دائرے کا ایک طبعی تقاضا ہوتا ہے اس کی وجہ سے روکتے ہیں کہ تمہارے موضوع کا وہ کام نہیں ہے بلکہ جو کام تمہارے موضوع کا ہے اس میں لگو، اسی طرح عورت کا بھی ایک تقاضا ہے کہ وہ مردوں سے الگ رہے۔ حق تعالیٰ سبحانہ نے زندگی کے دو حصے کردیئے ہیں، ایک گھریلو زندگی، اور ایک باہر کی زندگی۔ تو باہر کی زندگی کا ذمہ دار مردوں کو بنایا ہے، اور گھریلو زندگی کا عورتوں کو ذمہ دار قرار دیا ہے، تو مرد کا یہ کام نہیں ہے کہ گھر میں بیٹھ کر کھانا پکائے اور بچوں کو دُودھ پلائے اور ان کی پروَرِش کرے، یہ عورتوں کا کام ہے، اور مرد کا کام یہ ہے کہ باہر جائے اور کمائے اور ذریعہ معاش پیدا کرے اور عورتوں اور بچوں کے نان نفقہ کا انتظام کرے، اگر عورتوں کو باہر کی زندگی میں لگاؤ تو گھریلو زندگی کا کیا حال ہوگا؟ اسی طرح اگر مردوں کو گھریلو زندگی میں پھانس دو تو باہر کی زندگی کا کیا حال ہوگا؟ ایسا کردیا گیا تو جو فطری نظام بنا ہوا ہے وہ درہم برہم ہوجائے گا، اس لئے مرد و عورت ہر ایک اپنے اپنے دائرے میں رہ کر کام کریں تبھی نظام دُرست ہوسکتا ہے۔

(ماہنامہ "الحسن" لاہور اپریل ۲۰۰۳ء)

حق اور ہدایت کا راستہ

(حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ کی ایک علمی مجلس)

یہ ملفوظات ۱۳؍رمضان المبارک ۱۳۹۸ھ کے لکھے ہوئے ہیں، اور یقین ہے کہ حضرتؒ کے یہ قیمتی ملفوظات اب تک کہیں چھپے بھی نہیں ہیں۔ (مرتب)

قبروں میں رُوح لوٹائی جاتی ہے

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ:-

مؤمن کی رُوح کو نکالنے کے بعد عرش کے نیچے بڑے اِکرام کے ساتھ لے جایا جاتا ہے اور وہ وہاں سجدہ کرتی ہے اور خدا کی حمد بیان کرتی ہے، اور پھر وہ رُوح واپس زمین میں لوٹادی جاتی ہے اور اس کو میّت کے پاس رکھ دیا جاتا ہے، حتیٰ کہ جب جنازہ لے کر چلتے ہیں تو وہ اندر رکھی ہوئی ہوتی ہے، پھر جب اس میّت کو دفن کیا جاتا ہے تو اَب رُوح جسد میں داخل کی جاتی ہے اور اس وقت اس میں نوع من الحیاۃ پیدا ہوجاتی ہے، اور بعض کے قول کے موافق پورے بدن میں اس کا اثر ہوتا ہے، اور بعض کے قول کے مطابق نصفِ اعلیٰ میں، اور صرف رُوح قوّت وشعور میں اثرانداز ہوتی ہے، یعنی نعمت واَذیت کا شعور ہوسکے گا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے ارشاد فرمایا کہ: قیامت کے دن اُمتِ محمدیہ کے لئے زمین میں ذرا اُونچا حصہ ہوگا اور ان کے لئے وہ زمین چاندی کی ہوگی اور علامت غیر محل ہوگی، حقیقت یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا گیا ہے

دُنیا میں بھی، برزخ میں بھی، قیامت میں بھی، اور اُمتِ محمدیہ کو قیامت کے دِن لباس بھی دیا جائے گا اور ان کا حشر سواریوں پر ہوگا، بعض کے ایک پَر ہوں گے، بعض کے پَر دس تک ہوں گے۔ حوضِ کوثر پر مطیعین کو فوراً پانی پلایا جائے گا اور ان کو قیامت کے دن جو پچاس ہزار سال کا ہوگا، اس کی مصلحت تو خدا جانتا ہے مگر آثار سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا کی عمر پچاس ہزار سال کی ہوگی، تو گویا انسانی زندگی میں پچاس ہزار سال ہے تو قیامت کے دن اس پوری دُنیا کی زندگی کو دُہرادیا جائے گا، اور جس طرح دُنیا ہزار سال پر ایک زبردست حادثہ ہوتا ہے، پوری اُمت بدل جاتی ہے، سو برس میں تو نسل بدلتی ہے، اسی طرح قیامت میں ہزار سال پر ایک زبردست حادثہ ہوگا۔

نیز فرمایا کہ: جب تمام لوگ حشر کی پریشانیوں سے تنگ آچکے ہوں گے تو تمام حضرات حضرت آدم علیہ السلام کے پاس جائیں گے تاکہ حساب کتاب شروع ہو، اس میں بھی ہزار سال لگ جائیں گے، تو چھ ہزار سال تو اس میں لگ جائیں گے، مگر مؤمنین پر اس کی کچھ بھی پریشانی نہ ہوگی اور جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ''لا الٰہ الا اللہ'' پڑھنے والوں پر کچھ رنج و پریشانی نہ ہوگی۔

رُوح کی قسمیں

فرمایا کہ: کفار کی رُوح آسمان پر نہیں جاسکتی، اس کے لئے آسمان کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں، اس کی بدبو اور تعفن کی وجہ سے فرشتے اسے بُرے اَلقاب سے یاد کرتے ہیں اور اس کو اُوپر سے پھینک دیا جاتا ہے۔ رُوح دوطرح کی ہیں، ایک رُوحِ ربانی یہ وہ رُوح ہے، دُوسری رُوحِ حیوانی یہ نفس ہے۔ رُوحِ ربانی پر انسانی زندگی اور موت کا دارومدار ہے، نیند میں فی نفسہٖ تو باقی رہتا ہے، اس کا تعلق محسوسات سے ہے، ہاں علم و اِدراک باقی نہیں رہتا، یہ رُوحِ ربانی کا منشاء ہے، یہی رُوحِ ربانی عالَم میں پہنچ جاتی ہے اور وہاں جس پر اس کی نظر پڑتی ہے وہی خواب

ہے، وہاں رُموز و اشارات ہوتے ہیں، جس کو عالمِ مثال سے مناسبت ہوتی ہے وہ خواب کی تعبیر اچھی طرح دے سکے گا، خواب کی تعبیر کا علم معجزہ کے طور پر وحی کے ذریعہ حضرت یوسف علیہ السلام کو دیا گیا، ان کی زندگی کی ابتداء بھی خواب سے ہے اور انتہاء بھی، مگر حضرت یوسف علیہ السلام صرف جزئیات کا جواب دیتے تھے، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جزئیات کا جواب دینے کے ساتھ ساتھ اُصول بھی بیان فرماتے تھے، چنانچہ اس سے خواب کی تعبیر کا ایک فن مرتب ہوگیا، حضرت اِمام ابنِ سیرینؒ ماہر تھے، انہوں نے کتابیں لکھی ہیں اور اُصول بیان کئے ہیں۔

حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کے مرضِ وفات میں حضرت مولانا یعقوب نانوتویؒ کا کشف

ارشاد فرمایا کہ: حضرت نانوتویؒ جب مرض الوفات میں مبتلا تھے تو لوگوں کو تشویش ہوئی، اس وقت حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ نے فرمایا کہ اطمینان رکھو، انتقال نہ ہوگا، مگر ان کا انتقال ہوگیا، لوگوں نے پوچھا تو فرمایا کہ کشف تو صحیح تھا، مگر تعبیر میں غلطی ہوگئی۔ میں نے جب خدا کی طرف رُجوع کیا تو مجھ پر انکشاف کیا گیا کہ لفظ ''مہدی'' تو میں نے اس سے حضرت مہدی کی ذات مراد لی، اس لئے سمجھا کہ ابھی عمر باقی ہے، مگر جب ان کا انتقال ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ لفظ ''مہدی'' سے حروف کے اعداد مراد ہیں، چنانچہ عدد کے اعتبار سے حضرت کی عمر ہوچکی تھی۔

خواب، کشف، عیاں

ارشاد فرمایا کہ: خواب پہلا درجہ ہے جس میں عالمِ غیب کا انکشاف ہوتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتداء مناماتِ صادقہ سے ہوئی۔ دُوسرا درجہ کشف کا ہے۔ تیسرا درجہ عیاں کا ہے، یہ صرف انبیاء کے ساتھ مخصوص ہے۔

حق اور ہدایت کا راستہ

ارشاد فرمایا کہ: حق اور ہدایت کا راستہ یہ ہے کہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ اہل اللہ کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پاوے، صرف کتاب وسنت کو پکڑ لینا اور اہل اللہ کے قول کو گمراہ کہنا، یہ بھی گمراہی ہے، اور صرف اہل اللہ کے دامن کو پکڑنا اور کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ترک کردینا، یہ بھی ضلالت کا راستہ ہے۔

مراد اور مرید

ارشاد فرمایا کہ: بعض لوگ وہ ہوتے ہیں جن کو خدا کی طرف سے جنت کے لئے منتخب کیا جاتا ہے، اور بعض لوگ وہ ہیں جو ریاضت اور مجاہدہ کے بعد مقصود کو پہنچتے ہیں، صوفیاء کی اصطلاح میں پہلے لوگوں کو ''مراد'' کہا جاتا ہے، اور دُوسرے لوگوں کو ''مرید'' کہا جاتا ہے، اور قرآن کی اصطلاح میں پہلے لوگوں کو ''مجتبیٰ'' اور دُوسرے لوگوں کو ''منیب'' کہا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ: ''اَللّٰہُ یَجْتَبِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَیَھْدِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یُّنِیْبُ''۔

اسرار وحِکَم عوام کے سامنے نہ بیان کئے جائیں

ارشاد فرمایا کہ: پہلے اسرار وحِکَم عوام کے سامنے بیان نہ کئے جائیں، اور اس کا مأخذ شریعت میں یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ نے فرمایا: ''علمنی غرابة العلم'' کہ علم کے نکتے بیان فرمائیے۔ فرمایا: ''ھل علمت رأس العلم؟'' صحابہ کرامؓ نے کہا کہ ''ما شاء اللہ'' یعنی جتنا خدا کو منظور تھا، پھر فرمایا کہ ''ھل عرفت اللہ؟'' کہا: ''ما شاء اللہ'' تو فرمایا کہ پہلے اسی پر عمل کرو، پھر غرابتِ علم (علم کے نکتے) پوچھنا

انسانی صفات اور اس کی وضاحت

ارشاد فرمایا کہ: انسان کے اندر دو صفتیں ہیں، عقل اور محبت۔ یہ جانوروں میں بھی ہے، انسان میں بطریقِ تام ہیں، اس وجہ سے انسان مدنی الطبع پیدا کیا گیا ہے، مل جل کر رہتے ہیں، جانوروں کی طرح تنہا تنہا نہیں ہے۔ فکر ونظر آلہ ہے عقل

ہے، یعنی تفکر و تدبر کے بعد عقل کو کام میں لاکر مختلف اشیاء کی ایجاد کرتا ہے، اور خدمتِ بنی نوعِ انسان یہ آلہ ہے محبت ہے، اس لئے انسان کو اگر وصفِ امتیاز کے ساتھ دیکھا جائے تو ان دو صفتوں کے ساتھ دیکھا جائے گا کہ اس وجہ سے اللہ نے دو قسم کی عبادتیں رکھی ہیں، جس سے ان دونوں صفتوں کی تسکین ہوتی ہے۔ عقلی عبادت صلوٰۃ ہے، دربارِ شاہی میں حاضری ہوتی ہے، اس سے عظمتِ حق اور اپنی عبدیت کا اظہار کرتا ہے، عشقی عبادت حج ہے، اس میں فضا عشقیت کی ہے، جتنی صفات نماز میں ہے اس کی ضد اوصاف حج میں رکھے گئے ہیں، نماز میں دوڑنے سے منع فرمایا گیا، حج میں دوڑنے کا حکم دیا گیا، نماز میں صاف ستھرے کپڑے پہن کر وقار کے ساتھ حاضر ہونے کو کہا تو حج میں وقار کو بالکل ترک کروادیا گیا، وقار کے حصول کے بھی جتنے طریقے تھے سب کو حج میں ختم کردیا گیا، پراگندہ حال، پراگندہ بال، حج کی بنیاد ہے۔

اسلام کی اصل دو عبادتیں: نماز اور حج

ارشاد فرمایا کہ: اصل میں اسلام میں دو ہی عبادتیں ہیں: نماز اور حج۔ روزہ حج کے تابع ہے، زکوٰۃ نماز کے تابع ہے، جب تک دُنیا کو اپنے سے دُور نہ کیا جائے نماز میں حاضر ہونا مشکل ہے، اور پھر زکوٰۃ کے علاوہ صدقاتِ واجبہ نافلہ رکھے گئے ہیں، غرض ان سب چیزوں سے دُنیا کی محبت نکلتی ہے اور پھر اِنابت الی اللہ کی توفیق ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ نماز میں اُمراء کی تعداد کم نظر آتی ہے۔

فرمایا کہ: حج تروک کی عبادت ہے، روزہ میں طعام، جماع وغیرہ سے ترک ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دو عبادتیں فطری ہیں، عقل چاہتی ہے کہ عاقلانہ کوئی عبادت ہو، اور محبت تقاضا کرتی ہے کہ عاشقانہ کوئی عبادت ہو، سو اس فطرت کو دِینی بنادیا گیا ہے۔

آسمان و زمین کے درمیان کی مخلوق

ارشاد فرمایا کہ: آسمان و زمین کے درمیان چار قسم کی مخلوقات ہیں: ملائکہ،

حور و غلمان، جنات اور انسان حیوان۔ حورِ عین کی ایک خاصیت ہے عشق، چنانچہ وہ اپنے شوہروں کو یاد کر کے روتی ہیں، اور ایک خاصیت ہے ذکر کی، ذکر وہ طبعی طور پر کرتی ہیں۔ ملائکہ کی خصوصیت ہے تعبد اور ان میں عقل ہے، لیکن عقل کا جو آلہ ہے تفکر وہ ان میں نہیں، یہ انسان کو دیا گیا ہے، مادّیات میں اِیجاد، رُوحانیت میں اِجتہاد یہ انسان کا خاصہ ہے، جنات میں قوت اور طیش کا غلبہ ہے، جانوروں میں بہیمیت کا خاصہ ہے، انسان کو سب کا جامع بنایا گیا ہے، عقل و بصیرت بھی ہے، یہ کام آتی ہے تقویٰ و احتیاط میں بھی جہاں شبہ کا بھی وہم ہوتا ہے اس کو چھوڑ دیتا ہے، اور طیش بھی ہے، یہ کام آتی ہے بغض فی اللہ میں اور جہاد میں۔

جنت میں ہر چیز قوتِ خیال کے تابع ہو جائے گی

ارشاد فرمایا کہ: جنت میں تمام چیزیں علوم و معارف، طعام ولباس غرضیکہ ہر چیز قوتِ خیال کے تابع ہو جائے گی، قوتِ کسب کے نہیں، وہاں صرف خیال کافی ہے، جس چیز کا خیال کرے گا موجود ہو جائے گی ''وَلَکُمْ فِیهَا مَا تَشْتَهِیْ أَنْفُسُکُمْ''، وہاں علم کتب بینی کے مطالعے پر موقوف نہ ہوگا، تو انسان حقیقی خلیفۃ اللہ جنت میں جا کر بنے گا کہ اس کی شان وہاں ''کُنْ فَیَکُوْنُ'' کی ہوگی، اور جنت میں جانے کے بعد ہزاروں سال بعد انسان کے علم و معارف میں جو شان ہوگی وہ شان دُنیا میں انبیاء کی ہوتی ہے، ان کے علوم و معارف قوتِ کسب کے تابع نہیں ہوتے، مکتب و مدرسہ کے وہ محتاج نہیں ہوتے، بلکہ من جانب اللہ ان کو علم و معرفت کا اَتم درجہ عطا کیا جاتا ہے اس، لئے وہ سب سے افضل ہوتے ہیں۔ اس پوری تقریر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا میں انسان کے اندر اصل صفتیں ہیں عقل و محبت، اور بقیہ تمام صفات اس کے تابع ہیں، اس لئے انسان کی تعریف ''حیوانِ متفکر'' ہے۔

شفاعت کے مختلف طریقے ہوں گے

ارشاد فرمایا کہ: شفاعت کے مختلف طریقے ہوں گے، زبانی بھی ہوگی، عملی

بھی ہوگی۔ اس کو ایک حدیث میں بیان فرمایا گیا ہے کہ ایک شخص جہنم میں لے جایا جارہا ہوگا، حضرت آدم علیہ السلام فرمائیں گے کہ یہ تو اُمتِ محمدیہ کا ایک فرد ہے تو اس کو واپس لوٹادیا جائے گا، پھر اس کا حساب و کتاب ہوگا تو بدی کا پلڑا جھک رہا ہوگا، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں گے اور ایک رُقعہ نکال کر اس کی نیکی کے پلڑے میں رکھ دیں گے تو وہ پلڑا جھک جائے گا، اس کی مغفرت ہوجائے گی، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمائیں گے کہ میں محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوں، پوچھے گا کہ یہ رُقعہ کیا تھا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے کہ ایک وقت تو نے بہت ہی اِخلاص کے ساتھ مجھ پر دُرود شریف پڑھا تھا تو وہ میرے پاس محفوظ تھا، اس رُقعہ میں وہی دُرود شریف تھا۔ یہ شفاعتِ عملی ہے۔

ایک ہندوانہ عقیدے کی تردید

ارشاد فرمایا کہ: ہندو مذہب میں اوتار کا ایک تصوّر ہے، یعنی معاذ اللہ خدا تعالیٰ ان اوتار میں حلول کئے ہوئے ہے، یہ عقیدہ عقلاً و نقلاً غلط ہے، عقلاً اس لئے کہ خدا کی ذاتِ اقدس لامحدود اور اوتار کے اجسام محدود، تو لامحدود محدود میں نہیں سما سکتا، ہاں عکس آسکتا ہے۔ آفتاب جب گرہن ہوتا ہے تو اس کو پانی کے ایک برتن میں دیکھتے ہیں، یہ اس کا عکس ہے، اسی طرح قلبِ مؤمن میں اور کعبہ مشرفہ میں خدا کی تجلی کا عکس پڑتا ہے، مسلمان بیت اللہ کے سامنے سجدہ کرتے ہیں، یہ درحقیقت اسی چہار دیوار کا نام نہیں، بلکہ یہ تو علامت ہے، حقیقت وہ ہے جہاں خدا کی تجلی ہوتی ہے۔

قرآن مجید کی سائز

ارشاد فرمایا کہ: قرآن مجید لوحِ محفوظ میں اتنی بڑی سائز میں ہے کہ اس کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ اس کا ایک لفظ کوہِ قاف کے برابر ہے، پھر جب اس کو چھوٹے سائز میں لکھا تو پورا قرآن مجید حضرت اسرافیل کی پیشانی مبارک پر لکھ

دیا گیا، اس کے بعد بیت العزت میں یک دم اُترا جو آسمانِ دُنیا کا ایک مقام ہے، اور یہ نزول شہر رمضان میں ہوا، پھر نجماً نجماً قلبِ نبوی پر اُترا، تو اس سے ثابت ہوا کہ وہیں سے قرآن مختلف سائز میں ہے، دُنیا میں بھی مسلمانوں نے جتنا بڑا سائز ہوسکا اس میں لکھا، جیسے بڑودہ کی جامع مسجد میں ایک قرآن ہے، اور جب چھوٹے سائز میں لکھا تو تعویذ کی سائز کا بھی بنادیا۔

اصل مؤثر خدا تعالیٰ کی ذات ہے

ارشاد فرمایا کہ: خدا تعالیٰ کی شان کا بھی دُنیا میں ظہور ہوتا ہے، وہ اسباب کے ماتحت ہوتا ہے، اور اصل مؤثر خدا تعالیٰ ہی کی ذات ہے، سبب مؤثر بالذات نہیں ہے، اب بے عقل لوگ انہی اسباب کو سب کچھ سمجھنے لگے ہیں اور اسی کی عبادت کرنے لگتے ہیں۔

(ماہنامہ ''لولاک'' ملتان محرّم الحرام ۱۴۲۷ھ)

جنت عمل کا نہیں، ایمان کا صلہ ہے

ایمان ایک ایسی چیز ہے کہ جنت کا بدلہ ایمان پر ملے گا، عمل پر نہیں ملے گا، عمل محض علامت ہے جس سے ایمان پہچان کیا جائے، ورنہ اصل میں ایمان کا بدلہ جنت ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ آپ اگر سونا خریدنے کے لئے کسی صرّاف کی دُکان پر جائیں اور ایک ہزار روپے کا سونا آپ کو خریدنا ہے تو آپ یہ نہیں کرتے کہ آپ نے ہزار روپیہ دیا، اس نے سونا دے دیا اور آپ لے کر چلے آئے، پہلے اُسے پَرکھتے ہیں کہ اصلی بھی ہے یا نہیں؟ اس میں کھوٹ ملا ہوا تو نہیں ہے؟ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کسوٹی ایک پتھر ہوتا ہے اس پر گھسا کر دیکھتے ہیں، اگر اس پر سفید چمک دار لکیریں پڑیں تو یہ اس کی علامت ہوئی کہ سونا کھرا ہے، تو آپ ہزار روپے دے دیں گے سونا لے لیں گے، اور اگر میلے اور مٹیالے رنگ کی لکیریں پڑیں تو آپ سمجھیں گے کہ سونا کھوٹا ہے، آپ نہیں لیں گے۔

یہ جو آپ نے سونا خریدا اور صرّاف کو ہزار روپیہ دیا، یہ ہزار روپیہ کیا ان لکیروں کی قیمت تھی جو پتھر پر کھینچی گئی یا سونے کی قیمت ہے؟ یہ سونے کی قیمت تھی لکیروں کی نہیں تھی، وہ تو علامات تھیں جن سے پہچانا گیا کہ سونا کھرا ہے۔

اسی طرح آخرت کے بازار میں جو جنت ملے گی یہ ایمان کا بدلہ ہوگا، عمل کا نہیں، عمل لکیریں ہوں گی جن سے ایمان کے کھرے کھوٹے ہونے کو پَرکھا جائے گا، عمل اچھے ہیں تو یہ علامت ہوگی کہ ایمان بھی اچھا تھا، لہٰذا اس ایمان کی قیمت جنت ادا کردی جائے گی، اگر عمل بُرے ہیں تو یہ علامت ہوگی کہ ایمان میں کمی تھی، کھوٹ تھا،

لہٰذا بدلہ پورا نہیں مل سکتا، اس لئے بدلہ جو ملے گا وہ عمل کا نہیں ایمان کا ملے گا، ایمان کو پہچاننے کے لئے عمل کو دیکھا جائے گا۔

اگر عمل کا بدلہ ہوتا تو میں نے اور آپ نے پچاس برس مثلاً عمل کیا تو بس پچاس برس جنت میں رہتے، اس کے بعد کان سے پکڑ کے باہر نکال دیئے جاتے کہ جاؤ باہر، بدلہ ہوگیا، جنت میں جو آپ ابدالآباد رہیں گے یہ عمل کا بدل نہیں، اس لئے کہ عمل محدود وقت تک انجام دیا تھا، ایمان ایک ایسی چیز ہے جو عمر بھر قائم رہے گا، اور جب آدمی مرتا ہے تو یہ عزم لے کر جاتا ہے کہ اگر ایک کروڑ برس بھی زندہ رہوں تب بھی اس ایمان کو نہیں چھوڑوں گا، تو ایمان دار ہی ہوتا ہے دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، چونکہ یہ ابدی چیز ہے اس لئے بدلہ بھی ابدی ملا، عمل ابدی چیز نہیں ہے اس لئے عمل کا بدلہ نہیں ہوتا، اس کو بطور علامت دیکھتے ہیں، ظاہر میں بیشک عمل سے جنت ملی، مگر درحقیقت ایمان سے ملی، اس لئے کہ اگر انسان یہی عمل کرے، نماز بھی پڑھے، روزہ بھی رکھے مگر ایمان نہ ہو تو کیا پھر بھی جنت مل جائے گی؟ نہیں ملتی! معلوم ہوا عمل سے نہیں ملتی، ایمان سے ملتی ہے، ایمان ہو تبھی عمل بھی معتبر ہوتا ہے اور ایمان کی پَرکھ عمل سے ہی ہوتی ہے۔

اس واسطے میں عرض کر رہا ہوں کہ بلاشبہ فضل سے نجات ہوگی، لیکن عمل کرنا اس کی علامت ہے، اس لئے عمل کو نہیں چھوڑنا چاہئے۔

حاصل یہ نکلا کہ انسان کا کمال شکل وصورت سے نہیں، بلکہ سیرت سے ہے، اور سیرت کا علم سے، اخلاق سے، اعمالِ صالحہ سے، ایمان باللہ سے، آخرت کو پہچاننے اور یاد کرنے سے ہے، اس سے سیرت بنتی ہے، یہی اصل مقصود ہے، اُسے بنانے کی ضرورت ہے۔

(ماہنامہ ''طیب'' دیوبند جولائی ۱۹۸۵ء)

شہیدِ کربلا اور یزید

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ کی علمی تصنیف ''شہیدِ کربلا اور یزید'' جو کہ مسلکِ علمائے حق کے لحاظ سے حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہے، مکمل کتاب کا خلاصہ حضرتؒ ہی کے الفاظ میں پیشِ خدمت ہے۔ (مرتب)

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اس اقدام پر جو بمقابلہ یزید مدینہ سے کربلا کے میدان تک پھیلا ہوا ہے، تاریخ، فقہ، حدیث، کلام اور عقل کے راستے سے کسی الزام واتہام کی گنجائش نہیں نکلتی۔

۱- کیونکہ اوّل تو یزید کی بیعت ہی اجماعی نہ تھی، متعدّد گروہوں، خطوں اور منطقوں نے ابتداء ہی سے اسے قبول نہ کیا تھا، جس میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں، اس لئے ان پر یزید کی اطاعت ہی واجب نہ تھی کہ خروج و بغاوت کا سوال پیدا ہو۔ خروج و بغاوت کی مذمت اور ممانعت التزامِ بیعت کے بعد ہے، اور جبکہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے دُوسرے بہت سے ہم خیال لوگوں نے یزید کی بیعت ہی قبول نہ کی تھی تو ان پر اس کی اطاعت ہی واجب نہ تھی کہ وہ خروج و بغاوت کا محل قرار پائیں اور اس کی رُو سے ان پر معاذ اللہ کسی عصیان کا اتہام لگایا جائے۔

۲- اور پھر بھی اگر اس اقدام کو خروج و بغاوت ہی فرض کرلیا جائے تو جبکہ وہ امیر کے متعدی فسق و فجور، اس کی اہانتِ شیوخ و کبراء اور امارتِ صبیان و سفہاء اور ان کی اطاعت کے سبب اضاعتِ دِین ہونے کی بناء پر تھی، جن کے ہوتے ہوئے سمع

و طاعتِ اَمیر باقی ہی نہیں رہتی، تب بھی ان پر خروج و بغاوت کا الزام نہیں آ سکتا کہ یہ اصلاحی قدم تھا جو ضروری تھا، نہ کہ باغیانہ اقدام۔

۳- لیکن اگر خواہی نہ خواہی اسے خروج و بغاوت ہی کا لقب دیا جائے تو حسبِ تصریح حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہٗ قرنِ اوّل کے باغی گروہ کا حکم مجتہدِ مخطی کا ہے، جس پر اسے ایک اجر ملے گا (ازالۃ الخفاء) جو معصیت اور مخالفت پر کبھی نہیں مل سکتا۔ اس لئے اس صورت میں بھی حضرت امامؓ کے اس اقدام کو غیر شرعی اقدام نہیں کہا جاسکتا، کہ ان کے مأجور عنداللہ اور شہیدِ مقبول ہونے میں کسی تأمل کی گنجائش ہو۔

۴- رہیں وہ احادیث جن میں باوجود اَمیر کے شدید فسق و فجور کے بھی اس پر خروج و بغاوت کی شدید ممانعت آئی ہے، اور ان ہی کی رُو سے عباسی صاحب نے حضرتِ امام رضی اللہ عنہ پر الزامِ خروج و بغاوت لگا کر ان کے اس اقدام کو شرعاً ناجائز باور کرانا چاہا ہے، سو اِن احادیث کا جواب وہ احادیث ہیں جن کی رُو سے اَمیر کے غیر شرعی یا مخالفِ شریعت اقدامات سے اس کی سمع و طاقت اُٹھ جاتی ہے، اور معصیتِ خالق میں طاعتِ مخلوق باقی نہیں رہتی، جس کا حاصل یہ نکلے گا کہ جہاں تک اَمیر کے ذاتی فسق و فجور کا تعلق ہے وہ کتنا بھی شدید ہو خروج کی شدید ممانعت ہے، اور جہاں تک اس کے متعدی فسق و فجور کا تعلق ہے جس سے نظامِ دیانت مختل ہونے لگے تو اَمیر کی مخالفت نہ صرف جائز بلکہ استطاعت کی حد تک ضروری ہے، اس لئے ممانعتِ خلاف کی حدیثیں اَمیر کے ذاتی فسق و فجور پر محمول ہوں گی اور اجازتِ خلاف کی حدیثیں اَمیر کے متعدی اور جماعتی فسق و فجور پر، جس سے روایات میں کوئی تعارض نہیں رہتا اور نہ ہی حضرتِ اِمامِ ہمام رضی اللہ عنہ کا یہ اقدام ان میں سے کسی ایک روایت کے خلاف ٹھہرتا ہے کہ ان کے اس فعل پر ناجائز یا نامناسب ہونے کی تہمت لگائی جائے جو دوزی کے منہ میں گھس کر عباسی صاحب نے ان پر لگائی ہے۔

اب خلاصۂ بحث یہ نکل آیا کہ یزید کی شنیع حرکات اور اس کے فاسقانہ افعال نصوصِ فقہیّہ اور نصوصِ تاریخیّہ سے واضح ہیں، جن کی رُو سے فسقِ یزید کا مسئلہ محض تاریخی نظریہ نہیں رہتا جسے موَرِّخین نے محض تاریخی ریسرچ کے طور پر قلم بند کرلیا ہو بلکہ حدیث و فقہ کی رُو سے ایک عقیدہ ثابت ہوتا ہے جس کی بنیادیں کتاب و سنت میں موجود اور ان کی تفصیلات علماء اور اتقیاء کے کلاموں میں محفوظ ہیں۔ اسی لئے اسے نقل کرنے پر حکم لگانے اور اسے ثابت کرنے کے لئے مخصوص موَرِّخ نہیں بلکہ محدثین وفقہاء اور متکلمین آگے آئے اور انہوں نے اس مسئلے پر کتاب و سنت کے اشارات اور فقہ و کلام کی تصریحات سے اَحکام مرتب کئے جس سے اس کے عقیدہ ہونے کی شان نمایاں ہوئی، ظاہر ہے کہ عقیدے کے خلاف تاریخی نظریہ کسی کا بھی ہو اپنے بطلان پر خود ہی گواہ ہوگا۔ اس لئے عقیدے کے مقابلے پر بہرصورت تاریخ کو ترک کردیا جائے گا یا اس کی کوئی توجیہ کرکے عقیدے کی طرف اسے رُجوع کردیا جائے گا، بشرطیکہ یہ تاریخی روایات کسی ثقہ کی طرف منسوب ہو۔ اس لئے یہ عقیدہ بہرصورت محفوظ ہے اور عقیدہ ہی کے طور پر اسے محفوظ رکھا جائے گا کہ سیّدنا حسین رضی اللہ عنہ صحابیٔ جلیل اور اہلِ بیتِ رسول صحابی ہونے کی وجہ سے تقی القلب، نقی الباطن، ذکی النّسبت، اعلیٰ النّسب، وفی العلم، صفتی الاخلاق اور قوی العمل تھے۔ اس لئے عقائدِ اہلِ سنت والجماعت کے مطابق ان کا ادب و احترام ان سے محبت و عقیدت رکھنا، ان کے بارے میں بدگوئی، بدظنی، بدکلامی اور بداعتمادی سے بچنا فریضۂ شرعی ہے اور ان کے حق میں بدگوئی اور بداعتمادی رکھنے والا فاسق و فاجر ہے۔ پس جیسے کسی صحابیٔ جلیل کا بوجہ شرفِ صحابیت تقی و نقی ہونا عقیدۃً واجب التّسلیم ہے، ایسے ہی صحابی کے حق میں کسی بدگوئی یا بدعقیدتی کی وجہ سے فاسق ہونا بھی عقیدۃً ہی واجب التّسلیم ہے کہ دونوں کی ان کیفیات و اَحوال کی بنیادیں کتاب و سنت اور فقہ و کلام میں موجود اور محفوظ ہیں، جن کی رُو سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ قلوبِ مسلمین میں محبوب و مقتدر ہوئے اور

یزید اپنے فسق و فجور کی بدولت قلوب میں مبغوض اور مستوجبِ مذمت و ملامت بن گیا۔ اس ساری بحث کا خلاصہ، جس میں ایک طرف تو کتاب و سنت، ائمۂ ہدایت اور علمائے راسخین ہیں اور اس کے مقابل دُوسری طرف عباسی صاحب ہیں، یہ نکلتا ہے کہ اللہ و رسول اور ان کے ورثہ تو اِمام حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں بوجہ صحابی اور بوجہ اہلِ بیت ہونے کے یہ ارشاد فرماویں کہ "وہ راضی و مرضی عنداللہ اور محفوظ من اللہ تھے، جس کے معنی ولیٔ کامل ہونے کے ہیں، جن کی ولایت میں ان کے یا ان کے کسی بعد والے کے تصنع اور بناوٹ یا پروپیگنڈے کا کوئی دخل نہ ہو۔ ان کا محبوب ترین مقام ایمانِ کامل اور آزمودۂ خداوندی تقویٰ تھا، جس کے معنی فراستِ ایمانی اور معرفتِ حق شناسی کے ہیں، جس کے ساتھ دُنیا سازی اور ناعاقبت اندیشی جمع نہیں ہوسکتی۔ ان کا قلبی رُخ کفر و فسوق اور عصیان سے نفرت کی طرف تھا، جس کے معنی رُشد اور راشدین سے بدعہدی، عہدشکنی اور غداری سے تنفر کے ہیں۔ وہ ہمہ وقت "اَشِــدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ" اور "رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ" میں سے تھے، جس کے معنی مسلم آزادی سے کلی بچاؤ اور کسی کی حق تلفی سے کامل گریز کے ہیں۔ وہ ہمہ ساعت "رُكَّعًا سُجَّدًا" اور رُجوع و انابت الی اللہ کے مقام پر فائز تھے، جس کے معنی کبر و خودی و خودستائی اور شیخی بازی سے کامل گریز کے ہیں۔ وہ پوری اُمت کے لئے نجومِ ہدایت میں سے تھے جن کی اقتداء مطلوبِ شرعی اور اقتداء سے اہتداء وعدۂ شرعی ہے، جس کے ساتھ دُنیا کی اندھی سیاست تعصب اور اغراضِ نفسانی اور ان پر ضد اور ہٹ جمع نہیں ہوسکتی۔ ان کا ایک مُد صدقہ بعد والوں کے پہاڑ جیسے صدقات سے کہیں زیادہ اُونچا تھا، جس سے ان کی اَفضیلت غیرصحابہ پر علی الاطلاق ثابت ہے، وہ بوجہ والیٔ اہلِ بیت ہونے کے ان میں سے تھے جن کے بارے میں اللہ نے رِجسِ قلب اور لوثِ باطن سے ان کی تطہیر کا ارادہ کیا ہوا تھا اور رسول نے اسی کی انہیں دُعا دی ہوئی تھی، اور اللہ کا ارادہ مراد سے متخلف نہیں ہوسکتا اور نبی کی دُعا بے اجابت نہیں رہ سکتی، جس سے وہ رِجسِ ظاہر و

باطن سے پاک ہو چکے تھے" لیکن عباسی صاحب نے اپنی "تاریخی ریسرچ" اور "بے لاگ تحقیق" کے صفحات میں جو کچھ فرمایا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ امام حسین بناوٹی ولی اللہ تھے، جنھیں بعد والوں نے ولی اللہ کے رُوپ میں پیش کردیا تھا، وہ دانست کی کمزوری، بے معرفتی اور حق ناشناسی کا شکار تھے (جو اپنے زمانے کے امامِ حق کو بھی نہ پہچان سکے)، وہ عہد شکنی، مطلب پرستی کے جوش اور بغاوت جیسی اجتماعی غداری کے جرم کے مرتکب تھے، وہ ایک مانے ہوئے خلیفۂ برحق اور بے داغ کردار کے امام کی حق تلفی تک سے نہ بچ سکے کہ اس کا ربقۂ بیعت گلے میں ڈال لیتے، وہ خودستائی، شیخی بازی اور فخوریت جیسے جراثیم کو دِل میں پالے ہوئے تھے، وہ وقت کی کوری سیاست اور مطلب برآری کی غیر معقول حبِ جاہ میں گرفتار تھے، ان کا صحابی ہونا ہی مشتبہ تھا کہ غیر صحابہ مثلاً یزید پر ان کی فوقیت وفضیلت کا تصوّر باندھا جائے، خصوصاً ان کمزوریوں کے ساتھ وہ طلبِ حکومت وریاست میں مقتضیاتِ زمانہ اور اَحکامِ شرع کی خلاف ورزی اور ناجائز و جائز کی بھی پروانہیں کرتے تھے، وہ ایک معمولی قسمت آزما، ناکام مدعی اور بچپن ہی سے صلح جوئی کے بَرخلاف جتھ بندی کے خصائل لئے ہوئے تھے۔

اب اندازہ کیجئے کہ کتاب وسنت اور سلف کے فرمودہ کا حاصل تو وہ ہے جو اُوپر ذکر کیا گیا اور وہی مسلمان کا عقیدہ ہے، اور عباسی صاحب کے فرمودہ کا حاصل یہ ہے کہ جو سطورِ بالا میں آپ کے سامنے آیا اور یہ ان کے تاریخی نظریات ہیں، ان عقائد اور ان نظریات کو سامنے رکھ کر کیا یہ کہنا صحیح ہے کہ یہ ایک "تاریخی ریسرچ" ہے اس کا عقیدہ و مذہب سے کوئی تعلق نہیں اور اس میں عقیدہ و مذہب کی بحث کو لے بیٹھنا خلطِ مبحث ہے؟ اگر ان دونوں باتوں میں تضاد کی نسبت ہے اور بلاشبہ ہے، کہ عباسی صاحب حسین رضی اللہ عنہ کو معمولی آدمی بتلا رہے ہیں اور کتاب وسنت غیر معمولی، وہ انہیں بناوٹی ولی اللہ کہہ رہے ہیں اور کتاب وسنت انہیں حقیقی ولی اللہ ہی نہیں بلکہ بعد کی اُمت کے سارے اولیاء سے فائق بتلا رہے ہیں، عباسی صاحب

انہیں مطلب پرست کہہ رہے ہیں اور کتاب و سنت خالص خداپرست، وہ انہیں محبِّ جاہ و مال بتلا رہے ہیں اور کتاب و سنت انہیں ان رذائل سے پاک کہہ رہے ہیں، غرض دو کناروں کی دو باتیں ہیں جو آپس میں جمع نہیں ہوسکتیں، ظاہر ہے کہ اگر عباسی صاحب کے نظریات کو صحیح مان لیا جائے تو کتاب و سنت سے ان مأخوذ عقائد کی صحت کبھی برقرار نہیں رہ سکتی، پس ایک تاریخی ریسرچ سے عقائد کا نقشہ بدل جائے اور قرآن و حدیث کی خبروں کا نظام مختل ہوجائے مگر کہا یہی جائے کہ ''یہ تو ایک تاریخی ریسرچ ہے، اس کا عقیدہ و مذہب سے کیا تعلق؟'' کس قدر صریح ظلم، غلط بیانی اور دُنیا کو مبتلائے فریب رکھ کر اپنا کام نکالنا ہے۔

اندریں صورت جبکہ عقیدہ و نظریہ میں تقابل اور تضاد کی صورت پیدا ہوجائے تو اس اُصول کے مطابق جو ہم ابتدائے مقالہ میں عرض کرچکے ہیں، عقیدہ کو اصل اور محفوظ رکھ کر مقابل کی تاریخی ریسرچ ہی کو رَدّ کردیا جائے، درحالیکہ ہم دِکھلا چکے ہیں کہ وہ تاریخی ریسرچ نہیں ہے بلکہ نظریاتی ریسرچ ہے جس میں تاریخ کے ٹکڑوں سے نظریات کی تائید میں ناجائز فائدہ اُٹھانے کی سعی کی گئی ہے اور تاریخ کی ضعیف سے ضعیف بلکہ رَدّ شدہ روایت بھی موافقِ مطلب نظر آئی تو لے لی گئی ہے اور قوی سے قوی روایت بھی موافقِ مطلب نہ ہوئی تو چھوڑ دی گئی ہے، اور پھر وہ لی ہوئی روایتیں بھی کتر بیونت اور تحریف کے ساتھ استعمال کی گئی ہیں، جس کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔

یہی صورت عباسی صاحب نے یزید کے بارے میں بھی اختیار کی ہے، عباسی صاحب کہتے ہیں کہ امیر یزید، عمر فاروق جیسا عادل امیر تھا اور صحابہ و سلف کہتے ہیں کہ وہ متفق علیہ فاسق تھا۔ عباسی صاحب فرماتے ہیں کہ اس کی اِمارت خلافتِ راشدہ کا نمونہ تھی، احادیث سے اشارہ ملتا ہے کہ اس کی اِمارت، اِمارتِ صبیان تھی، جس میں اَرشد لوگوں کو معطل کرکے رکھ دیا گیا تھا۔ عباسی صاحب کہتے ہیں

کہ امیر یزید کی حکومت کا آئیڈیل خدمتِ خلق گویا احیائے خلافت تھا، اور احادیث سے اشارہ ملتا ہے کہ ان چند قریشی لڑکوں کے ہاتھوں خلافت کی تباہی مقدر تھی۔ عباسی صاحب کہتے ہیں کہ یزید کے ہاتھ پر صحابہؓ کی اکثریت کی بیعت اس کی کردار کی خوبی کی وجہ سے تھی، محدثین و مؤرخین کہتے ہیں کہ اسے فاسق سمجھ کر فتنے سے بچنے کے لئے تھی۔ عباسی صاحب فرماتے ہیں کہ یزید خلیفہ برحق تھا اس لئے اس کے مقابلے پر امام حسینؓ باغی تھے، سلف صالحین کہتے ہیں کہ یزید خود باغیٔ حق تھا اس لئے اِمام کا خروج برحق تھا۔ عباسی صاحب فرماتے ہیں کہ یزید حسن المعاشرت اور پاکیزہ خصال تھا، محقق مؤرخین کہتے ہیں کہ وہ شہوت پرست اور تارک الصلوٰۃ تھا، وغیرہ وغیرہ۔

غرض یزید کے بارے میں بھی احادیث کے عمومی اشارات، سلف کی تصریحات اور مؤرخین کی تفصیلات ایک طرف ہیں، اور عباسی صاحب کے نظریات ایک طرف، اور ظاہر ہے کہ جس مسئلے میں بھی کتاب وسنت کا دخل ہوجاتا ہے خواہ وہ عبارۃً ہو یا دلالۃً یا اشارۃً اس میں عقیدے کی شان پیدا ہوجاتی ہے، پس حضرتِ حسین رضی اللہ عنہ اور یزید سے متعلق یہ عقائد کسی بھی درجہ اور حیثیت کے ہوں نظریات سے بہرحال بالاتر ہیں، اور عباسی صاحب کے نظریات ان کے مقابل رُخ پر جارہے ہیں۔ اور یہ عرض کیا جاچکا ہے کہ تاریخ اگر عقیدے کے مطابق اور اس سے ہم آہنگ ہوگی تو قبول کی جائے گی کہ وہ تاریخ درحقیقت اس عقیدے کی تاریخ اور اس کا تکوینی شانِ نزول ہوگی، ورنہ رَدّ کردی جائے گی۔ اس لئے اس اُصول پر فیصلہ کرلیا جائے کہ ان عقائد کو چھوڑا جائے یا عباسی صاحب کی تاریخی ریسرچ، اور دُوسرے لفظوں میں ان کے اپنے نظریات اور قیاس آرائیوں کو خیرباد کہا جائے جنھیں ''تاریخی ریسرچ'' کے نام پر پیش کیا گیا ہے؟

پھر جبکہ عباسی صاحب نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی کی شان میں (جو ساداتِ مسلمین، علمائے صحابہ اور اہلِ بیتِ نبوّت میں سے ہیں)

جسارت و بے باکی اور گستاخی سے کام لیا ہے، جس کے چند نمونے اُوپر عرض کئے گئے، تو انہیں صحابہ کے دُعا گویوں میں شامل کیا جائے جن کو قرآن سے مستغفرین کا خطابِ عزّت مرحمت فرمایا ہے؟ یا بدگویوں کی فہرست میں لیا جائے جنھیں ان کی خست و دناءت کی وجہ سے قرآن نے صحابہؓ کے ساتھ اس موقع پر قابلِ ذکر نہیں سمجھا؟

عباسی صاحب کا موقف اور خلاصۂ بحث

بہرحال عباسی صاحب کی اس کتاب (خلافتِ معاویہ و یزید) اور ان کے نظریات سے چونکہ صحابہ اور بالخصوص حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں مسلکِ اہلِ سنت والجماعت پر زَد پڑتی تھی جس کو ابھی نمایاں کیا گیا ہے۔ اس لئے ضرورت تھی کہ عموماً صحابہ کرام اور خصوصاً حضرت حسین رضی اللہ عنہ وعنہم کے بارے میں مذہب کی تصریحات پیش کرکے واضح کیا جائے کہ اس کتاب کے نظریات سے ان پر کس درجہ اثر پڑا اور اس کے ازالے کی کیا صورت ہے؟ یزید کا ذکر بذاتہٖ مقصود نہ تھا، مگر استطراداً اس لئے آیا کہ حضرت اِمام حسین رضی اللہ عنہ کا اس سے مقابلہ ڈال کر اس کی مدح سرائی میں مبالغہ کیا گیا تو قدرتی طور پر حضرتِ اِمامؓ کی تنقیص کیا جانا لازمی تھا، سو یہ تنقیص کی گئی اور گستاخیوں کے ساتھ کی گئی، اس لئے حضرتِ اِمامؓ کے بالمقابل اس کی پوزیشن کا کھول دیا جانا بھی ضروری تھا تاکہ دونوں شخصیتوں کے بارے میں سلف کا نقطۂ نظر واضح ہوجائے۔

ایک بات بطور اُصول کے یہ بھی پیش کردینی ضروری ہے کہ صحابہ کرامؓ کے واقعات پیش کرکے ان پر حکم لگانے میں بنیادی غلطی یہ کی جاتی ہے کہ حکم صرف واقعات کی سطح پر لگادیا جاتا ہے اور منشاء سے قطع نظر کرلی جاتی ہے، حالانکہ کتاب و سنت و خلف کے اجماع نے بتصریحاتِ نصوص سارے صحابہ کو متقن، عدول، صالح القلب، حسن النیت، تقی و نقی اور اولیائے کاملین قرار دیا ہے جو محفوظ من اللہ ہیں اور

خصوصیت سے حفظِ دِین اور روایت ونقلِ دِین میں عادل و اَمین مانا ہے، جن کے قلوب آزمودۂ خداوندی، تقویٰ سے بھرپور تھے تو ان کے تمام احوال و افعال میں ان کے ان اوصاف سے قطع نظر کر کے حکم نہیں لگایا جاسکتا۔

ایک متقی اور فاجر کے عمل کی صورت یکساں ہوتی ہے مگر منشاء الگ الگ ہوتا ہے، اس لئے باوجود صورت کی یکسانی کے حکم الگ الگ ہوتا ہے، مسلم و کافر کے کھانے پینے، سونے جاگنے، اُٹھنے بیٹھنے، ازدواجی وظائف ادا کرنے، رہن سہن اور عبادت و خدارسی کے جذبات میں فرق نہیں ہوتا مگر پھر بھی ان پر ایک حکم یکساں نہیں لگادیا جاتا، فرق وہی اندرونی ایمان و کفر کا ہوتا ہے جس سے دُنیا و آخرت کے اَحکام دونوں کے الگ ہوتے ہیں۔ ایک ہی خطاءِ فکری ایک نوآموز طالبِ علم سے سرزد ہو اور وہی خطاء بعینہٖ ایک پختہ کار عالم سے سرزد ہو تو دونوں پر یکساں حکم عائد نہیں ہوگا۔ فرق کی وجہ وہی ان کے علمی اور فکری احوال کا فرق ہوگا۔ کافر و مسلم دونوں قومی جنگ کرتے ہیں مگر ایک کی جنگ کو ''جہاد'' اور ایک کو ''فساد'' کہا جاتا ہے، دونوں معبدوں میں جاتے ہیں اور ایک ہی مقصد لے کر جاتے ہیں، نیتیں بھی عبادت ہی کی ہوتی ہیں مگر ایک کی اطاعت مقبول اور ایک کی نامقبول ہوتی ہے، یہ حکم کا فرق ان کے قلبی رُخ کے فرق سے ہے نہ کہ صورتِ عمل سے۔ اسی طرح صحابہؓ کی باہمی لڑائیاں بھی ہوئیں، انہوں نے ایک دُوسرے پر تنقید بھی کی، وہ ایک دُوسرے کے مدِمقابل بھی آئے، ان میں زمین و جائیداد پر مناقشے بھی ہوئے لیکن ان سب معاملات میں ان کے احوالِ باطنی ہمہ وقت ان کے ساتھ رہے اور ساتھ ہی وہ ہمہ وقت حدودِ شرعیہ پر قوت سے قائم رہتے، جھگڑا بھی ہوتا تو دلائل کی سطح پر ہوتا تھا، محض دُنیاداری کے جذبات پر نہیں، غرض ظاہر و باطن میں حدود کا دائرہ قائم رہتا تھا۔ اس لئے ان کے اس قسم کے افعال کو ہمارے افعال پر نہ قیاس کیا جائے گا، نہ اس طرح ان پر حکم لگایا جائے گا جس طرح ہم پر لگایا جاتا ہے، ایک شخص ہم میں سے کسی کے سامنے کرختِ لب ولہجہ یا

اُونچی آواز سے بول پڑے تو محض اس بولنے کی آواز اور لہجہ پر ہی رائے قائم کی جاسکتی ہے لیکن یہی اُونچی آواز اللہ کے رسول کے سامنے ہوتی تو بولنے والے کے تمام اعمال ضبط اور حبط کرلئے جاتے، اس حکم کے فرق کی وجہ وہی مقام اور منصب کا فرق ہے جن کے حقوق الگ الگ ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ مقبولین اور عوام کے کاموں کو ایک پیمانے سے نہیں ناپا جاتا، اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ حضراتِ صحابہؓ کے معاملات پر ان کی شرعی پوزیشن سے قطع نظر کرکے حکم نہیں لگایا جاسکتا، اور وہ پوزیشن محفوظ من اللہ اور مقبولانِ الٰہی ہونے کی ہے۔ تو ان کے ان معاملات میں بھی جن کی صورت بظاہر خطا کی نظر آئے ان کا یہ مقامِ محفوظیت و مقبولیت محفوظ رہے گا اور بلاتردّد کہا جائے گا کہ مقبولین کی ہر ادا مقبول ہے۔ پھر اگر فعل کی صورت بھی اعلیٰ ہے تو حقیقت پہلے ہی سے اعلیٰ تھی، اور اگر صورت اعلیٰ نہیں تو حقیقت بہرصورت اعلیٰ رہے گی اور حکم اسی پر لگا کر اسے خطاءِ اجتہادی کہا جائے گا نہ کہ معصیت۔ غرض ان کے افعال کو ہمارے افعال پر کسی حالت میں بھی قیاس نہیں کیا جائے گا، جبکہ منشائے فعل میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر
گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

اس فرق کو نظرانداز کردینے ہی سے بے ادبی اور گستاخی کا وہ مقام آتا ہے جس پر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں آج عباسی صاحب کھڑے ہوئے ہیں اور عموماً اہلِ بیت کے بارے میں خوارج کھڑے ہوئے، اور شیخینؓ اور دُوسرے حضراتِ صحابہؓ کے بارے میں شیعہ کھڑے ہوگئے، اور اس طرح سلف کی شان گھٹا کر خود اپنی اور اپنے تدین کی اصلی شان خراب کرلی۔ اس سلسلۂ ادب و احترام میں جہاں تک روایتی حیثیت کا تعلق ہے ہم اگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی مدح و ثناء اور عظمت و بزرگی پر زور دے کر ان کی شان میں ہر بے ادبی اور نکتہ چینی کو ناجائز ٹھہرا رہے ہیں تو اس میں ہماری اصلی حجت کتاب و سنت ہے، تاریخی روایتیں نہیں۔ یہ

تاریخی روایتیں جو کتاب وسنت کے مطابق ہوں ان کی تشریحات اور مؤیدات ہیں، اس لئے ہم نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے متعلق مقاصد کو ''عقائد'' کہا ہے نظریات نہیں۔

ایسے ہی اگر ہم نے یزید کے فسق و فجور پر زور دیا تو اس کی بنیاد درحقیقت کتاب وسنت کے عمومی اشارات ہیں جن کی تعیین واقعات اور اَربابِ دِین و یقین نے کی، اس لئے اس کے بارے میں بھی تاریخی روایتیں جو ان احادیث کی ہم نوا اور ان سے ہم آہنگ ہوں ان کی تشریح اور مؤیدات کا درجہ رکھتی ہیں اصل نہیں، کیونکہ کتاب وسنت کا اشارہ بھی تاریخ کی صراحت سے قوت میں بڑھا ہوا ہے۔

اس لئے جو تاریخی روایتیں مدحِ حسینؓ اور قدحِ یزید کے حق میں ہیں، وہ چونکہ وحی کے اشارات کی مؤید ہیں اس لئے قابلِ قبول ہوں گی، اگرچہ تاریخی معیار سے کچھ کمزور ہی ہوں کہ ان کی بڑی قوت کتاب وسنت کی پشت پناہی ہے، اور اس کے برعکس مدحِ یزید اور قدحِ حسینؓ کی جو روایات کتاب وسنت کے اشارات کے مخالف سمت میں ہیں بلاشبہ قابلِ رَدّ ہوں گی اگرچہ تاریخی معیار سے کچھ قوی بھی ہوں کیونکہ ان کی قوت کو مخالفتِ کتاب وسنت نے زائل کردیا ہے۔

اندریں صورت مدحِ حسینؓ اور قدحِ یزید کی روایات کو سبائی روایات کہہ کر رَدّ کردینا اسی وقت کارگر ہوسکتا ہے جب مدعا کا ان پر مدار ہو اور جبکہ وہ مؤیدات کے درجے کی ہیں تو قوی کی تائید میں ضعیف کا کھڑا ہونا کسی حالت میں بھی قابلِ اعتراض نہیں ہوسکتا۔ کتاب وسنت کے رُخ پر کافر کا قول بھی حجت میں پیش کیا جاسکتا ہے جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوّت کی حقانیت پر بحیرا راہب کے قول سے استدلال فرمایا، نہ اس لئے کہ نبوّت کا ثبوت بحیرا راہب کی روایت پر مبنی تھا، بلکہ اس لئے کہ نبوّت کا ثبوت وحیِ قطعی سے ہوچکا تھا اس لئے ایک ثابت شدہ کی تائید میں ضعیف سے ضعیف قول حتیٰ کہ کافر کا قول بھی قابلِ قبول ہوگیا۔ پس یزید کے فسق اور

اس کے مظالم، حق تلفیوں اور فاسقانہ تعدیوں کی مؤید اگر کوئی تاریخی روایت سامنے آئے خواہ سنی کی ہو یا شیعی کی اس لئے قابلِ قبول ہوگی کہ وہ اصل کی مؤید ہے۔ یہ جدا بات ہے کہ اس میں روایتی حیثیت ہی سے کوئی ایسا سقم ہو کہ وہ فنی طور پر قابلِ قبول نہ ہو، لیکن فنی طور پر اگر قابلِ احتجاج ہو خواہ وہ کتنی ہی کمزور ہو جب تک کہ موضوع و منکر کی حد تک نہ پہنچ جائے، اشاراتِ وحی کی تائید میں بلاشبہ استعمال کی جاسکتی ہے۔ اسی لئے حافظ ابنِ کثیرؒ ان اُمور سے متعلق شیعی راویوں کی روایتیں بھی نقل کرجاتے ہیں اور قبول بھی کرتے ہیں، انہیں یہ کہہ کر رَدّ نہیں کرتے کہ اس میں شیعی یا سبائی رُواۃ بھی ہیں۔ ہاں فنی جروح کے معیار سے روایت مشتبہ یا ساقط الاعتبار ہو تو خواہ وہ سنی کی بھی ہو اسے مجروح ٹھہرا دیتے ہیں۔ بہرحال جرح و تعدیل کا بنیادی معیار راوی کا ضبط و عدالت ہے، علی الاطلاق مشرب و مسلک نہیں جیسا کہ اُصولِ حدیث کے فن میں اسے واضح کردیا گیا ہے۔

پھر یہ کہ مدحِ حسینؓ اور قدحِ یزید کے سلسلے میں اگر کسی سبائی کا رَدّ کرتے ہوئے بات وہ کہی جائے جو خارجیوں کا عقیدہ اور مذہب ہو یا اس سے ملتی جلتی ہو تو وہ افراط کا جواب تفریط سے ہوگا جو ''رَدّ'' نہیں بلکہ ''رَدِ عمل'' کہلائے گا، اور رَدِّ عمل جذباتی چیز ہوتی ہے، اُصول نہیں ہوتا، ظاہر ہے کہ بے اُصول جذبات کی بات کم از کم اہلِ سنت والجماعت کے لئے جو اُمت کا سوادِ اعظم اور مرکزِ اعتدال ہے قابلِ قبول نہیں ہوسکتی۔ بہرحال عقیدہ کسی بھی تاریخ اور تاریخی ریسرچ کی بنیادوں پر نہ قائم ہوتا ہے نہ اس کی وجہ سے ترک کیا جاسکتا ہے، اس لئے تاریخ کو عقیدے کی نگاہ سے دیکھا جائے گا، عقیدے کو تاریخ کی آنکھ سے نہیں دیکھیں گے۔ پس ہم نے مدحِ حسینؓ اور قدحِ یزید کے سلسلے میں جو کچھ بھی تاریخی طور پر کہا ہے اس کی بنیاد کتاب و سنت، محدثین و فقہاء اور متکلمین کا کلام ہے، تاریخی نظریات نہیں جو ان کے مقابلے میں روایت و سند کے اعتبار سے بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتے، چہ جائیکہ بناءِ مذہب اور بنیادِ

عقائد بننے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اس لئے ہماری پیش کردہ تاریخی روایات اس سلسلے میں کتاب و سنت کی تبعیّت اور ان کی پناہ کے دامن میں ہیں، لیکن عباسی صاحب کی اس سلسلے کی روایات خود ان کے نظر وفکر اور قائم کردہ نظریات کے دامن میں ہیں۔ پس تاریخی روایات تائید کے طور پر ہم بھی لائے ہیں، لیکن کتاب وسنت اور فقہ و اُصولِ فقہ کی تائید کے طور پر، اور عباسی صاحب بھی لائے ہیں لیکن اپنے نظریات کی تائید کے لئے، اس لئے اگر ہماری تاریخی روایات سوءِ اتفاق سے مجروح یا ساقط الاعتبار ہوجائے تو آخرکار ہمارے ہاتھ میں کتاب وسنت اور فقہ و اُصولِ فقہ باقی رہ جاتا ہے، جس سے ہمیں کسی بھی تاریخی روایات کے ہاتھ سے نکل جانے کا غم نہیں ہوسکتا کہ اصل ہاتھ میں باقی ہے، لیکن اگر عباسی صاحب کی پیش کردہ تاریخی روایتیں مجروح یا ساقط الاعتبار ہوجائیں تو ان کے ہاتھ میں بجز اپنے دِماغ کے آگے کچھ نہیں رہتا، یعنی وہی رہ جاتے ہیں اور کچھ نہیں رہتا، تو اندازہ کرلیا جائے کہ اس میں کون سی پوزیشن مضبوط ہے اور کون سی اس قابل ہے کہ بطور مسلک کے اسے اختیار کیا جائے؟

آخری گزارش

آخر میں ایک آخری گزارش یہ ہے کہ عباسی صاحب کی اس کتاب (خلافتِ معاویہ و یزید) سے یقیناً حضراتِ شیعہ کو دُکھ پہنچا ہے اور قدرتاً پہنچنا چاہئے تھا، لیکن اس میں ان کے لئے جہاں دُکھ کا سامان موجود ہے وہیں عبرت کا سامان بھی مہیا ہے اور وہ یہ کہ جب کسی کے معتقد فیہ کو بدعنوانی کے ساتھ بُرا بھلا کہا جائے تو معتقدین کے دِلوں پر کیا کچھ گزرتی ہے۔ شیعہ حضرات اس سے عبرت پکڑیں کہ عباسی صاحب نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شان میں جو کچھ بھی کلمات کہے وہ یقیناً اس سے بہت کم اور ہلکے ہیں جو حضراتِ شیعہ حضراتِ صحابہ کرامؓ خصوصاً شیخینؓ کے بارے میں استعمال کرتے ہیں، لیکن اس پر ہی شیعہ حضرات بلبلا اُٹھے، تو وہ اس سے اندازہ کرلیں کہ جب وہ حضراتِ شیخینؓ اور دُوسرے حضراتِ صحابہ کرامؓ کی نسبت بدگوئیاں

اور بدتہذیبی کے ساتھ سب وشتم کرتے ہیں تو سنیوں کے دِلوں پر کیا گزرتی ہوگی؟ اگر ان کے نزدیک عباسی صاحب کا یہ اقدام جو انہوں نے حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں کیا، خلافِ تہذیب اور دِل آزار ہے تو انہیں سوچ لینا چاہئے کہ وہ خود جو تہذیب سے انتہائی گرا ہوا اور سب وشتم پر مشتمل دِل آزار رویہ سنیوں کے مقتداؤں کے بارے میں رکھتے اور اسے مذہب بھی سمجھتے ہیں وہ سنیوں کے لئے کس درجہ دِل آزار اور دُکھ دینے والا ہے۔ اگر عباسی صاحب کا رویہ قابلِ ملامت و انسداد ہے تو شیعہ حضرات کی یہ سب وشتم کی رَوِش کیوں قابلِ انسداد نہیں؟

پس آج حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں جو ان پر گزری وہ اسی کو سامنے رکھ کر شیخینؓ اور صحابہؓ کے بارے میں جو سنیوں پر گزرتی ہے، اپنی رَوِش پر نظرِ ثانی فرمائیں۔

اہلِ سنت والجماعت کا مسلک ہی چونکہ مسلکِ اعتدال ہے اور وہ کسی ایک بھی صحابی نام کے کسی فرد کے بارے میں ادنیٰ بے ادبی جائز نہیں سمجھتے، اس لئے خوارج ہوں یا شیعہ وہ دونوں کی سنتے ہیں اور دِل مسوس کر رہ جاتے ہیں، اُف تک نہیں کرتے کیونکہ ان کے یہاں مذہب ہے رَدِّعمل نہیں، وہ اپنے دِل کا غم بدکلامی سے ہلکا نہیں کرسکتے کیونکہ شیعہ کے مقتداء ہوں یا خارجیوں کے، وہ خود ان کے مقتداء ہیں، اگر اپنے مقتداؤں کی توہین کا انتقام ان کے متقداؤں کی توہین سے لیا جائے تو وہ آخر کس کے مقتداء ہیں؟ اس لئے ایک سنی گالی کا جواب گالی سے دے ہی نہیں سکتا اور اس کے لئے بجز صبر کے کوئی چارہ کار نہیں، وہ بجز اس کے کہ خوارج و شیعہ اور ان کے ہم مزاج حضرات کے مقابلے میں ہر بدکلامی سے بچتے ہوئے شائستگی کے ساتھ حقیقت پیش کرتا رہے اور کر ہی کیا سکتا ہے؟ اس کے یہاں تو یزید بھی اگر مستحقِ لعنت و ملامت ہو تو وہ پھر بھی اپنے مسلک کا رشتۂ اِعتدال ہاتھ سے نہ دیتے ہوئے عملاً لعن و طعن سے بچتا ہی رہے گا، چہ جائیکہ شیعہ یا خوارج کے مقابلے میں ان حدود سے باہر

ہوجائے کیونکہ اس کے یہاں نہ مدح میں اطراء (مبالغہ) کوئی پسندیدہ چیز ہے، نہ مذمت میں غلوّ اور مبالغہ مناسب۔

یہ مقالہ زیرِ نظر بھی نہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب میں مبالغہ آرائی کے لئے لکھا گیا ہے، نہ یزید کے حق میں لعنت و ملامت کو وظیفہ قرار دینے کے لئے۔ اگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی ذاتِ ستودہ صفات کا ذکر آئے گا تو ہم بلاشبہ سر جھکادیں گے اور ان کے نقشِ قدم پر سر کے بل چلنے کو ایمان و سعادت سمجھیں گے، اور یزید اور اس کے قبائح و مثالب (عیوب) سامنے آئیں گے تو ہم اصل حقیقت کو سمجھ کر خاموشی اختیار کرنے ہی کو معقول جذبہ سمجھیں گے، اب اس کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے، ہمارے ساتھ نہیں۔

اگر عباسی صاحب یہ سلسلہ نہ چھیڑتے تو یزید کے بارے میں جو نقول پیش کی گئیں ان کے پیش کرنے کی کبھی نوبت نہ آتی۔ پس اس مقالے کا مقصد مدح و ذم کی آرائش نہیں بلکہ ان دو شخصیتوں شہیدِ کربلا اور یزید کے بارے میں صرف مذہبِ اہلِ سنت کی وضاحت اور عباسی صاحب کی اس ''تاریخی ریسرچ'' سے اس پر جو اثر پڑتا تھا اس کو کھول دینا تھا اور بس، جس میں اپنے ناقص علم کی حد تک کوتاہی نہیں کی گئی۔

ہم اپنے اور عباسی صاحب اور سارے مسلمانوں کے حق میں راہِ مستقیم پر چلنے اور حسنِ انجام کے خواہاں ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ:-

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ اَوَّلًا وَّاٰخِرًا۔

محمد طیب غفرلہٗ

مدیر دارالعلوم دیوبند

۲۰/رجب ۱۳۷۹ھ یوم الاربعاء

(بحوالہ کتاب ''شہادتِ حسینؓ'' ص:۲۷۶ تا ص:۲۸۸)

کتاب ''شہیدِ کربلا اور یزید''
سے متعلق وضاحتی خط

حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ کی کتاب ''شہیدِ کربلا اور یزید'' کی بعض عبارات کا سہارا لیتے ہوئے ایک شیعیت زدہ نام نہاد سنی، شیعی عقائد و مسلک کو حق ثابت کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا، جس سے بعض جگہ کے سنی عوام میں سخت اضطراب اور بے چینی پھیلی ہوئی تھی ایسے میں جناب عبدالوحید خان صاحب (فرخ آبادی) نے حضرت مہتمم صاحب کو ایک طویل خط لکھا جس میں انہوں نے حضرتؒ کو صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے ساتھ بتایا کہ آپ کی کتاب کی عبارت ''ساتھ ہی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے جزوِ رسول ہونے کی وجہ سے انہیں اخلاقِ نبوت سے جو خلقی اور فطری مناسبت ہوسکتی ہے، وہ یقیناً دُوسروں کے لحاظ سے قدرتاً امتیازی شان لئے ہوئے ہونی چاہئے۔'' صفحہ:۷۲ اور صفحہ:۷۴ کی عبارت: ''..... بہرحال اِمام حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں عمومی اور خصوصی نصوصِ شرعیہ کی روشنی میں اہلِ سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ وہ جزوِ رسول اور صحابیٔ جلیل ہونے کی وجہ سے پاک باطن، پاک نیت اور عادل القلوب تھے ......'' ان عبارات پر شیعیت زدہ سنی نے اس قدر زور دیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرات حسنینؓ تتمۂ رسالت تھے اور ان حضرات پر ایمان لانا مثل حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے ہے، اس لئے کہ رسولؐ پر اس وقت تک ایمان مکمل ہی نہیں ہوتا تاوقتیکہ جزوِ رسول پر ایمان نہ لایا جائے۔ ذیل کے خط میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کا وضاحتی بیان ملاحظہ فرمائیں۔ (مرتب)

حضرت حکیم الاسلام کا جواب

حضرت المحترم، زید مجدکم السامی، سلام مسنون، نیازِ مقرون!

گرامی نامے نے مشرف فرمایا، احقر کی تحریر اور اس سے شیعہ عقائد کا اثبات حیرت ناک بات ہے، محبتِ اہلِ بیتؓ جس میں محبتِ حسین رضی اللہ عنہ بھی شامل ہے، ہر سنی کا ایمانی جذبہ ہے لیکن اس سے ان کی معصومیت نکالنا ''مارے گھٹنا سر لنگڑا'' کا مصداق ہے۔ سنیوں کے یہاں تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کی محبت تقاضائے ایمان ہے، لیکن کیا اس سے سارے صحابہ رضی اللہ عنہم کی معصومیت بھی ثابت ہوجائے گی؟ ہم تمام اولیاء اللہ کی عظمت و محبت کے قائل ہیں، تو کیا سارے اولیاء اس سے معصوم بھی ثابت ہوجائیں گے؟ محبت الگ چیز ہے اور عصمت الگ، بعض جگہ محبت ہوگی اور عصمت نہ ہوگی، جیسے غیر نبی سے محبت ہوتی ہے مگر عصمت نہیں ہوتی، اور بعض جگہ عصمت ہوتی ہے محبت نہیں ہوتی جیسے کوئی ناہنجار کسی نبی سے محبت نہ کرے، عداوت رکھے، یا کوئی ایمان کا کھوٹا کسی فرشتے سے محبت کے بجائے عداوت رکھے، جیسے جبرئیل و میکائیل کی عداوت یہود کے دِلوں میں موجزن تھی، تو کیا اس سے ملائکہ اور انبیاء کی عصمت میں کوئی فرق پڑجائے گا؟ پس یہاں عصمت ہے مگر بعض کی محبت نہیں ہے، اب اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محبتِ حسینؓ کا اَمر فرمایا ہے تو محبتِ صحابہؓ کا بھی اَمر فرمایا ہے، اور جیسے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی محبت کو اپنی محبت قرار دیا ہے ایسے میں تمام صحابہؓ کی محبت کو بھی اپنی ہی محبت فرمایا ہے جس سے واضح ہے کہ یہ سب حضرات محبوب عندالرسول تھے بلکہ حق تعالیٰ کے نزدیک بھی سارے صحابہ رضی اللہ عنہم مہاجرین ہوں یا انصار بنصِ قرآنی راضی و مرضی تھے جس سے بڑھ کر محبت کا اعلان دُوسرا نہیں ہوسکتا تو کیا جو عنداللہ و عندالرسول محبوب و پسندیدہ ہوگا معصوم بھی ہوگا؟ اور نبوّت کا تتمہ بھی ہوگا؟ یہ محض خلطِ مبحث اور تلبیس ہے۔ محبت الگ چیز ہے اور عصمت

الگ، اس لئے کسی کے کلام سے جس میں صحابہؓ یا اہلِ بیتؓ کو محبوبِ خدا و رسول اور محبوبِ اُمت کہا گیا ہو اپنی مزعومہ عصمت کا استنباط ایک ذاتی رائے ہوگی اور وہ بھی غلط، جسے صاحبِ کلام کے سر تھوپا جانا خلافِ دیانت ہوگا، پھر جزوِ رسول جیسے حضرت حسین رضی اللہ عنہ ہیں، حضرت حسن رضی اللہ عنہ بھی ہیں، صدیقہ فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی ہیں اور صدیقہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی بہنیں اور بھائی بھی ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہی وفات پاگئے، تو معلوم نہیں ان کی عصمت کے بارے میں حضراتِ شیعہ کیا فرماتے ہوں گے جبکہ وہ جزوِ رسول ہی تھے؟ اور کیا آج کے سادات جزوِ رسول نہیں ہیں؟ تو کیا اس اُصول پر وہ بھی سب کے سب معصوم شمار ہوں گے؟ آخر جیسے حضرت حسین و حسن رضی اللہ عنہما بالواسطہ جزوِ رسول ہیں ایسے ہی بعد کے سادات بھی بالواسطہ جزوِ رسول و آلِ رسول ہیں، اور ہم بحیثیت اولادِ رسول ہونے کے ان کی محبت و عظمت بھی دِلوں میں رکھتے ہیں، لیکن کیا مذکورہ اُصول کی رُو سے ان سب کو معصوم ماننا بھی ہمارے ذمہ ہوگا؟ حضراتِ شیعہ اپنے عقائد و دلائل سے ثابت کریں انہیں اختیار ہے، لیکن کسی کے سر رکھ کر اپنے عقائد کو ثابت کرنا جبکہ اس کے ذہن میں ان عقائد کا کوئی تخیل تک نہیں ہے، دیانت کا آخر کون سا شعبہ کہلائے گا؟

خلاصہ یہ ہے کہ تمام اہلِ بیتؓ، تمام حضراتِ صحابہؓ اور تمام اولیائے اُمت کی محبت کو ایمان کا تقاضا سمجھتے ہیں، لیکن انبیاء علیہم السلام کے سوا کسی کو معصوم نہیں مانتے، چہ جائیکہ ان کو متصرف فی الشریعت یا تتمۂ نبوّت ہونے کا فاسد اور بے بنیاد خیال دِل میں لائیں۔ بہرحال یہ اُصول ہی سرے سے غلط ہے کہ جو محبوب عنداللہ و عندالرسول ہو وہ معصوم بھی ہو، اور جو جزوِ رسول ہو تتمۂ نبوّت بھی ہو، محبوبیت کا تعلق عملِ صالح اور عقائدِ حقہ میں رُسوخ سے ہے، اس کا عصمت سے کوئی تعلق نہیں، اور نبوّت کا عہدہ کمالِ علمی اور کمالِ اخلاق کی انتہائی حدود سے متعلق ہے جو محض انتخابِ خداوندی سے ہوتا ہے نہ کہ بدن یا اجزاءِ بدن سے، اس لئے انہیں اُصول بنا کر جو بذاتِ خود بے بنیاد

ہیں ان پر عصمت اور جزئیتِ نبوّت کی تفریعات کرنا بنائے فاسد علی الفاسد ہے، اور فضائل سے احقر کی تحریر کا تعلق حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کی خصوصیات سے ہے، عصمت و نبوّت سے ان کا کوئی تعلق نہیں، کمالات و علم و عمل کی اعلیٰ صلاحیتوں سے اگر نبوّت ملتی تو بنصِ حدیثِ نبوی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ملتی، مگر ان سے بھی نبوّت کی نفی کی گئی ہے تو اس قسم کے قیاسات سے کسی کو تتمۂ نبوّت کے مقام پر پہنچانا صراحۃً شریعتِ اسلام کا مقابلہ ہے، جو نبوّت کے قدروں سے لاعلمی اور ختمِ نبوّت کے مقام سے تجاہل ہے، اعاذنا اللہ منہ۔ اُمید ہے کہ ان سطور سے وسوسے دُور ہو جائیں گے جو احقر کی تحریر پر تھوپ کر منظرِ عام پر لائے گئے ہیں، وباللہ التوفیق۔

والسلام

محمد طیب

مہتمم دارالعلوم دیوبند

(کتاب ''شہادتِ حسینؓ'' ص: ۲۹۰ تا ص: ۲۹۲)

چند عظیم شخصیات

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ
مفتی اعظم پاکستان

ادارۃ المعارف کراچی ۱۴

کاروانِ تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

حکیم الاُمت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ۱۹۲ خلفاء، مجازینِ خلفاء
اور ممتاز متوسّلین کے حالات و کمالات کا جامع تذکرہ

حافظ محمدؐ اکبر شاہ بخاری

اِدارۃُ المعارِف کراچی ۱۴